اسلام اور ہماری زندگی

(مجموعۂ خطبات و تحریرات)

جلد نمبر ۴

اسلام اور حُسنِ معاشرت

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے ہم افراط و تفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین و دنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

اسلام اور حُسنِ معاشرت

جلد ۴

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خُطبات وتحریرات

جلد ۴

اسلام اور حُسنِ معاشرت

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا مُحمّد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور ★ ۱۹۰ انارکلی لاہور پاکستان ★ [illegible]

نام کتاب

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات و تحریرات

جلد ۴

اسلام اور حسن معاشرت

اشاعت اول

جمادی الثانی ۱۴۳۱ھ — جون ۲۰۱۰ء

ادارہ اسلامیات

پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

۱۴- دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور فون ۳۷۳۵۳۲۵۵ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۴۷۸۵+

۱۹۰- انار کلی، لاہور - پاکستان ——— فون ۳۷۲۲۳۹۹۱-۳۷۳۵۳۲۵۵

موہن روڈ، چوک اردو بازار، کراچی - پاکستان ——— فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

www.idaraeislamiat.com

E-mail:idara.e.islamiat@gmail.com

ملنے کے پتے

ادارۃ المعارف، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر ۱۴

مکتبہ معارف القرآن، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر ۱۴

مکتبہ دار العلوم، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر ۱۴

ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، اردو بازار، کراچی

دار الاشاعت، اردو بازار، کراچی نمبر ۱

بیت القرآن، اردو بازار، کراچی نمبر ۱

بیت العلوم، نابھہ روڈ، لاہور

فہرست مضامین

اللہ کی مخلوق سے محبت کیجئے　۱۷

دوسروں کو خوش کیجئے

دوسروں کے مزاج کی رعایت

خندہ پیشانی سے ملنا سنت ہے

دوسروں کو تکلیف مت دیجئے

اللہ کی مخلوق سے محبت کیجئے ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ، وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَنَبِيَّنَا وَحَبِيْبَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ((مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُؤْمِنٍ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ يَسَّرَ عَلٰى مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ، وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ، وَاللّٰهُ فِيْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِيْ عَوْنِ اَخِيْهِ، وَمَنْ سَلَكَ طَرِيْقًا يَلْتَمِسُ فِيْهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللّٰهُ بِهٖ طَرِيْقًا اِلَى الْجَنَّةِ وَمَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِيْ بَيْتٍ مِنْ بُيُوْتِ اللّٰهِ تَعَالٰى يَتْلُوْنَ كِتَابَ اللّٰهِ يَتَدَارَسُوْنَهٗ بَيْنَهُمْ، اِلَّا نَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةُ وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ، وَحَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ، وَذَكَرَهُمُ اللّٰهُ فِيْمَنْ عِنْدَهٗ، وَمَنْ بَطَّاَبِهٖ عَمَلُهٗ لَمْ يُسْرِعْ بِهٖ نَسَبُهٗ)) (۱)

حضور ﷺ کے جامع کلمات

اس حدیث کے راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں، اور اس میں آنحضرت ﷺ کے ارشاد فرمودہ

☆ اصلاحی خطبات (۸/۲۱۲ تا ۲۴۴) بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) صحيح مسلم، كتاب الذكر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب فضل الاجتماع على تلاوة القرآن...... الخ، رقم: ٤٨٦٧، سنن الترمذي، كتاب الحدود عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ما جاء في الستر على المسلم، رقم: ١٣٤٥، مسند أحمد، مسند أبي هريرة، رقم: ٧١١٨

بہت سے جملے روایت فرمائے ہیں۔ ان میں سے ہر جملہ اپنے معنی اور مفہوم کے لحاظ سے بڑا جامع جملہ ہے۔ ایک اور روایت میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((أُوْتِيْتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ)) (۱)

''مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے کلمات عطا کیے گئے ہیں جو جامع ہیں''

یعنی جن کے الفاظ تو تھوڑے ہیں، اور بولنے میں مختصر ہیں، لیکن اپنے معنی اور مفہوم کے اعتبار سے اور عمل کے اعتبار سے وہ بڑے جامع کلمات ہیں۔ حضورِ اقدس ﷺ کے ایسے ارشادات جو چھوٹے چھوٹے جملوں پر مشتمل ہیں، اور معنی کے اعتبار سے بڑے حاوی ہیں، ان کو ''جوامع الکلم'' کہا جاتا ہے۔ اس حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بہت سے ''جوامع الکلم'' روایت فرمائے ہیں جو مختلف موضوعات سے متعلق ہیں۔

کسی کی پریشانی دور کرنے پر اجر و ثواب

پہلا جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ جو شخص کسی مؤمن کی دنیا کی بے چینیوں میں سے کوئی بے چینی دور کرے، مثلاً وہ مؤمن کسی پریشانی میں گھرا ہوا ہے، یا کسی مشکل میں مبتلا ہے، اور کوئی مسلمان اس کی اس پریشانی اور مشکل کو کسی عمل کے ذریعہ، یا کسی مدد کے ذریعے دور کر دے تو اس کا یہ عمل اتنے بڑے اجر و ثواب کا کام ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں قیامت کی سختیوں اور بے چینیوں میں سے ایک بے چینی کو اس سے دور فرما دیں گے۔

تنگدست کو مہلت دینے کی فضیلت

دوسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ جو شخص کسی تنگدست آدمی کے لئے کوئی آسانی پیدا کر دے، تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے دنیا و آخرت دونوں میں آسانی پیدا فرما دیں گے۔ مثلاً ایک شخص مقروض ہے اور اس نے اپنی کسی ضرورت کی خاطر قرض لیا، اور کسی خاص وقت پر واپس کرنے کا وعدہ کر لیا۔ لیکن جب قرض واپس کرنے کا وقت آیا تو قرض واپس کرنے کے قابل نہیں ہے بلکہ تنگدست ہے۔ اب وہ قرض

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب، رقم: ۸۱٤، مسند أحمد، مسند أبي هريرة، رقم: ۷۰۹٦، ترمذی، میں "أعطيت جوامع الكلم" کے الفاظ ہیں، سنن الترمذي، كتاب السير عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، رقم: ۱٤۷٤، بخاری اور نسائی میں "بعثتُ بجوامع الكلم" کے الفاظ ہیں، صحيح البخاري، كتاب الجهاد والسير، رقم: ۲۷۵۵، سنن النسائي، كتاب الجهاد، رقم: ۳۰۳۷

واپس کرنا چاہتا ہے، لیکن تنگدستی کی وجہ سے نہیں دے سکتا، اب اگر چہ قرض لینے والے کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ یہ مطالبہ کرے کہ میرا قرض مجھے واپس کرو۔ لیکن اگر یہ شخص اس کی تنگدستی کو دیکھتے ہوئے اس کو مہلت دے دے، اور اس سے یہ کہہ دے کہ اچھا جب تمہارے پاس پیسے آجائیں اس وقت دے دینا، ایسے شخص کے لئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس کے لئے دنیا اور آخرت دونوں میں آسانی پیدا فرمائیں گے۔ اسی کے بارے میں قرآن کریم میں فرمایا:

﴿وَاِنْ كَانَ ذُوْعُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ﴾ (۱)

یعنی تمہارا مقروض شخص اگر تنگدست ہے تو پھر ایک مؤمن کا کام یہ ہے کہ اس کو اس وقت تک مہلت دے جب تک اس کا ہاتھ کھل جائے، اور اس کی تنگدستی دور ہو جائے، اور اس میں قرض کی ادائیگی کی طاقت پیدا ہو جائے۔

نرمی اللہ تعالیٰ کو پسند ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ کو نرم خوئی بہت پسند ہے۔ اللہ کے بندوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنا یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت محبوب عمل ہے۔ جس شخص نے قرض کے طور پر پیسے دیئے ہیں، اس کو قانونی طور پر ہر وقت یہ حق حاصل ہے کہ وہ مطالبہ کر کے اپنا قرض وصول کر لے۔ یہاں تک کہ قانونی طور پر اس کو قید بھی کرا سکتا ہے۔ لیکن اسلام کا ایک مسلمان سے یہ مطالبہ ہے کہ صرف پیسوں ہی کو نہ دیکھو کہ کتنا پیسہ چلا گیا، اور کتنا پیسہ آگیا، بلکہ یہ دیکھو کہ کسی اللہ کے بندے کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنا یہ اللہ تعالیٰ کو اتنا محبوب ہے جس کی کوئی حد وانتہا نہیں۔ اور اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ قیامت کے روز نرمی کا معاملہ فرمائیں گے۔

مسلمان کی حاجت پوری کرنے کی فضیلت

ایک اور حدیث میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ كَانَ فِيْ حَاجَةِ اَخِيْهِ كَانَ اللّٰهُ فِيْ حَاجَتِهٖ)) (۲)

---

(۱) البقرة: ۲۸۰

(۲) صحیح البخاری، کتاب المظالم والغضب، باب لا یظلم المسلم المسلم ولا یسلمه، رقم: ۲۲۶۲، صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب تحریم الظلم، رقم: ٤٦٧٧، سنن الترمذی، کتاب الحدود عن رسول الله صلی الله علیه وسلم، باب ما جاء فی الستر علی المسلم، رقم: ۱۳٤٦

''جو شخص جتنی دیر اپنے بھائی کے کام بنانے اور حاجت پوری کرنے میں لگا رہے گا اللہ تعالیٰ اس کے کام بناتے رہیں گے اور اس کی حاجت پوری کرتے رہیں گے''

تم میرے بندوں کے کام میں لگے رہو، میں تمہارے کام میں لگا ہوا ہوں۔

کار ساز ما بساز کار ما فکر ما درکار ما آزار ما

ایک جملہ یہ ارشاد فرمایا:

((مَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً فَرَّجَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ))(۱)

''اگر کسی نے کسی مسلمان کی مصیبت کو دور کر دیا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی مصیبت اور پریشانی کو دور فرمائیں گے''

مخلوقِ خدا پر رحم کرو

درحقیقت یہ دونوں کام یعنی دوسروں کی حاجت پوری کرنا، اور دوسروں کی مصیبت اور پریشانی کو دور کرنا اسی وقت ہو سکتا ہے جب دل میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی طرف سے رحم ہو اور ان کی محبت ہو۔ اگر یہی دونوں کام دکھاوے کے لئے کر لیے تو ان کاموں کی کوئی قیمت نہیں۔ لیکن اگر یہ سوچا کہ یہ میرے اللہ کے بندے ہیں۔ اس کی مخلوق ہیں۔ میں ان کے ساتھ کوئی بھلائی اور اچھائی کروں گا تو اس پر مجھے اللہ تعالیٰ ثواب عطا فرمائیں گے۔ تب یہ کام قیمتی بن جائیں گے۔ اللہ کی محبت کا یہ حق ہے کہ اس کے بندوں سے محبت کی جائے۔ اگر بندوں سے محبت نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت نہیں۔ ایک حدیث میں جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ))(۲)

''جو دوسروں پر رحم کرنے والے ہیں، رحمٰن ان پر رحم کرتا ہے۔ زمین والوں پر تم رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا''

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب المظالم والغضب، باب لا یظلم المسلم المسلم ولا یسلمه، رقم: ۲۲٦۲، صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب تحریم الظلم، رقم: ٤٦۷۷، سنن الترمذی، کتاب الحدود عن رسول الله صلی الله علیه وسلم، باب ما جاء فی السر علی المسلم، رقم: ۱۳٤٦۔

(۲) سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول الله صلی الله علیه وسلم، باب ما جاء فی رحمة الناس، رقم: ۱۸٤۷، سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب فی الرحمة، رقم: ٤۲۹۰، مسند أحمد، رقم: ٦۲۰٦

لہٰذا جب تک اللہ کی مخلوق کے لئے تمہارے دل میں رحم نہیں ہوگا، اس وقت تک تم مسلمان کہلانے کے مستحق نہیں ۔ تم اللہ کی رحمت کے امیدوار کیسے ہو گے، جب اللہ کی مخلوق پر رحم نہیں کرتے۔ ایمان کا ایک تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے بندوں اور اللہ کی مخلوق کے ساتھ محبت کرو۔

مجنوں کو لیلیٰ کے درو دیوار سے محبت

جب کسی محبوب سے محبت ہو جاتی ہے تو پھر اس محبوب کی ہر چیز سے محبت ہوتی ہے۔ مجنوں لیلیٰ کی محبت میں کہتا ہے:

اَمُرُّ عَلَی الدِّیَارِ دِیَارِ لَیْلٰی
اُقَبِّلُ ذَا الْجِدَارَ وَ ذَا الْجِدَارَا

''جب میں لیلیٰ کے وطن سے گزرتا ہوں جہاں وہ رہتی ہے تو میں کبھی اس دیوار کو پیار کرتا ہوں، اور کبھی اس دیوار کو پیار کرتا ہوں، کیوں؟''

وَمَا حُبُّ الدِّیَارِ شَغَفْنَ قَلْبِیْ
وَلٰکِنْ حُبُّ مَنْ سَکَنَ الدِّیَارَا

''ان دیواروں سے مجھے کیا تعلق؟ میں ان کو کیوں پیار کروں؟ لیکن چونکہ یہ دیواریں میرے محبوب کے شہر کی دیواریں ہیں، اس وجہ سے مجھے ان دیواروں سے محبت ہے، اور جب میں ان کے پاس سے گزرتا ہوں تو ان دیواروں کو چومتا پھرتا ہوں''(۱)

جب ایک مجنوں کو لیلیٰ کے شہر کی دیواروں سے عشق ہو جائے، تو پھر کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت ہو، لیکن اللہ کی پیدا کی ہوئی مخلوق سے محبت نہ ہو۔ اللہ کے پیدا کیے ہوئے بندوں سے تعلق نہ ہو؟ ان پر رحم نہ ہو؟ یہ کیسی محبت ہے؟

کیا اللہ کی محبت لیلیٰ کی محبت سے کم ہو جائے؟

مثنوی شریف میں مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجنوں کو تو لیلیٰ کے شہر کے کتے سے بھی محبت تھی، اس لئے کہ یہ میرے محبوب کے شہر کا کتا ہے، مجھے اس سے بھی محبت ہے۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود

ارے مولیٰ کا عشق لیلیٰ کے عشق سے بھی کم ہو گیا۔ جب ایک ناپائیدار اور فنا ہو جانے والے وجود

(۱) روضة المحبين زنزهة المشتاقين، ص: ٢٦٤

سے اتنی محبت ہو جاتی ہے کہ اس کے کتے سے محبت ہونے لگی تو اللہ تبارک وتعالیٰ جو مالک الملک ہیں اور سارے محبوبوں کے محبوب ہیں، اُن کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی ساری مخلوق سے بھی محبت ہو جائے۔ چاہے وہ جانور ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ وہ میرے اللہ کی مخلوق ہے۔ اسی وجہ سے شریعت نے حیوانات کے بھی حقوق رکھے ہیں کہ ان پر بھی ترس کا معاملہ کرو۔ اور ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہونے پائے۔

کتے کو پانی پلانے کا اجر

بخاری شریف میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک طوائف اور فاحشہ عورت تھی۔ ساری زندگی طوائفی کا کام کیا۔ ایک مرتبہ وہ کہیں سے گزر رہی تھی۔ راستے میں اس نے دیکھا کہ ایک کتا پیاس کی شدت کی وجہ سے زمین کی مٹی چاٹ رہا ہے۔ قریب میں ایک کنواں تھا۔ اس عورت نے اپنے پاؤں سے چمڑے کا موزہ اُتارا، اور اس موزے میں کنویں سے پانی نکالا، اور اس کتے کو پلا دیا۔ اللہ تعالیٰ کو یہ عمل اتنا پسند آیا کہ اس کی مغفرت فرما دی کہ میری مخلوق کے ساتھ تم نے محبت اور رحم کا معاملہ کیا، تو ہم تمہارے ساتھ رحم کا معاملہ کرنے کے زیادہ حقدار ہیں۔ (۱)

لہٰذا اللہ کی مخلوق کے ساتھ رحم کا معاملہ کرنا چاہئے، چاہے وہ حیوان ہی کیوں نہ ہو۔

رحم کا اعلیٰ مقام

حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے مخلوق پر رحم کا عجیب حال عطا فرمایا تھا کہ کبھی کسی جانور کو مارنا تو دور کی بات ہے، کسی جانور کو اس کی جگہ سے ہٹانے کے لئے بھی ہاتھ نہیں اُٹھتا تھا۔ یہ سوچ کر کہ یہ اللہ کی مخلوق ہے۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ پاؤں پر زخم ہو گیا۔ اس زخم پر مکھیاں آکر بیٹھنے لگیں۔ ظاہر کہ زخم پر مکھیوں کے بیٹھنے سے تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن حضرت والا ان مکھیوں کو اُڑاتے نہیں تھے۔ بلکہ اپنے کام میں لگے رہتے تھے۔ اس وقت ایک صاحب آپ کے پاس آگئے۔ انہوں نے جب یہ صورت دیکھی تو عرض کیا کہ حضرت! اجازت دیں تو میں ان مکھیوں کو اُڑا دوں؟ جواب میں حضرت نے فرمایا کہ بھائی! یہ مکھیاں اپنا کام کر رہی ہیں۔ مجھے اپنا کام کرنے دو۔

وجہ اس کی یہ تھی کہ دل میں یہ خیال جما ہوا تھا کہ یہ میرے اللہ کی مخلوق ہے۔ ان کو یہاں سے اُڑا کر کیوں پریشان کروں؟ بہرحال، اللہ تعالیٰ کی محبت صحیح معنی میں اس وقت ہوگی جب اللہ کی مخلوق

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب اذا وقع الذباب فی شراب أحدکم...... ۳۰۷٤، صحیح مسلم، کتاب السلام، باب فضل سقی البهائم المحترمة واطعامها، رقم: ٤١٦٣، مسند أحمد، رقم: ١٠١٧٨

سے بھی محبت ہو جائے۔ اس پر بھی رحم کرے۔

ایک مکھی پر ترس کھانا

میں نے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہ سے بارہا یہ واقعہ سنا کہ ایک بزرگ تھے جو بہت بڑے عالم، فاضل، محدث اور مفسر تھے۔ ساری عمر درس و تدریس اور تالیف و تصنیف میں گزری، اور علوم کے دریا بہا دیئے۔ جب ان کا انتقال ہو گیا تو خواب میں کسی نے ان کو دیکھا تو ان سے پوچھا کہ حضرت! آپ کے ساتھ کیسا معاملہ ہوا؟ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ مجھ پر اپنا فضل فرمایا۔ لیکن معاملہ بڑا عجیب ہوا، وہ یہ کہ ہمارے ذہن میں یہ تھا کہ ہم نے الحمدللہ زندگی میں دین کی بڑی خدمت کی ہے، درس و تدریس کی خدمت انجام دی، وعظ اور تقریریں کیں، تالیفات اور تصنیفات کیں، دین کی تبلیغ کی، حساب و کتاب کے وقت ان خدمات کا ذکر سامنے آئے گا، اور ان خدمات کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اپنا فضل و کرم فرمائیں گے۔ لیکن ہوا یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم تمہیں بخشتے ہیں، لیکن معلوم بھی ہے کہ کس وجہ سے بخش رہے ہیں؟ ذہن میں یہ آیا کہ ہم نے دین کی جو خدمات انجام دیں تھیں، ان کی بدولت اللہ تعالیٰ نے بخش دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نہیں۔ ہم تمہیں ایک اور وجہ سے بخشتے ہیں۔ وہ یہ کہ ایک دن تم کچھ لکھ رہے تھے۔ اس زمانے میں لکڑی کے قلم ہوتے تھے۔ اس قلم کو روشنائی میں ڈبو کر پھر لکھا جاتا تھا۔ تم نے لکھنے کے لئے اپنا قلم روشنائی میں ڈبویا۔ اس وقت ایک مکھی اس قلم پر بیٹھ گئی۔ اور وہ مکھی قلم کی سیاہی چوسنے لگی۔ تم اس مکھی کو دیکھ کر کچھ دیر کے لئے رک گئے، اور یہ سوچا کہ یہ مکھی پیاسی ہے، اس کو روشنائی پی لینے دو، میں بعد میں لکھ لوں گا۔ تم نے یہ اس وقت قلم کو روکا تھا، وہ خالصۃً میری محبت اور میری مخلوق کی محبت میں اخلاص کے ساتھ روکا تھا۔ اس وقت تمہارے دل میں کوئی اور جذبہ نہیں تھا۔ جاؤ، اس عمل کے بدلے میں آج ہم نے تمہاری مغفرت کر دی۔

تصوف اور خدمتِ خلق

بہرحال، یہ بڑا نازک راستہ ہے۔ جب تک اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ محبت نہ ہو، اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا دعویٰ سچا نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ تصوف کے بارے میں فرماتے ہیں۔

زتسبیح و سجادہ و دلق نیست
طریقت بجز خدمتِ خلق نیست

یعنی لوگوں نے تصوف اس کا نام رکھ لیا ہے کہ ہاتھ میں تسبیح ہو۔ مصلیٰ بچھا ہوا ہو۔ گدڑی ہو۔

درویشانہ لباس پہنا ہوا ہو۔ ان چیزوں کا نام تصوف اور طریقت نہیں ہے۔ بلکہ تصوف اور طریقت اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ مخلوق کی خدمت ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر تمہیں ہمارے ساتھ محبت کا دعویٰ ہے تو پھر ہماری مخلوق کے ساتھ محبت کرو۔ ان کی خدمت کرو۔

اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق سے محبت ہے

ارے، اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق کے ساتھ بڑا پیار ہے۔ آپ اس کا تجربہ کرلیں کہ کسی نے اپنے ہاتھوں سے محنت کر کے کوئی چیز بنائی، وہ چیز پتھر ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اس بنانے والے کو اس بنائے ہوئے پتھر سے محبت ہو جاتی ہے کہ اس پتھر کے بنانے میں وقت لگایا ہے۔ میں نے محنت کی ہے۔ یہ میری دولت ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو بنایا اور ان کو پیدا کیا ہے۔ اس لئے ان کو اپنی مخلوق سے محبت ہے، لہٰذا اگر ان سے محبت کا دعویٰ ہے تو ان کی مخلوق سے بھی محبت کرنی ہوگی۔

حضرت نوح علیہ السلام کا عجیب واقعہ

جب حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر طوفان آچکا، ساری قوم اس طوفان کے نتیجے میں ہلاک ہوگئی تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ حضرت نوح علیہ السلام کو حکم دیا کہ اب تمہارا کام یہ ہے کہ تم مٹی کے برتن بناؤ، چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں مٹی کے برتن بنانا شروع کر دیئے۔ اور دن رات اس میں لگے رہے۔ جب کئی دن گزر گئے، اور برتنوں کا ڈھیر لگ گیا تو دوسرا حکم یہ دیا کہ اب سب برتنوں کو ایک ایک کر کے توڑو۔ حضرت نوح علیہ السلام نے عرض کیا کہ یا اللہ! میں نے بڑی محنت سے اور آپ کے حکم پر بنائے تھے، اب آپ ان کو توڑنے کا حکم دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہمارا حکم یہ ہے کہ اب ان کو توڑ دو۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے ان کو توڑ دیا۔ لیکن دل دکھا کہ اتنی محنت سے بنائے اور ان کو تڑوا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے نوح! تم نے اپنے ہاتھوں سے یہ برتن بنائے، اور میرے حکم سے بنائے، ان برتنوں سے تمہیں اتنی محبت ہوگئی کہ جب میں نے تمہیں ان کو توڑنے کا حکم دیا تو تم سے توڑا نہیں جا رہا تھا۔ دل یہ چاہ رہا تھا کہ یہ برتن جو میری محنت اور میرے ہاتھ سے بنے ہوئے ہیں، کسی طرح بچ جائیں تو بہتر ہے، اس لئے کہ تمہیں ان برتنوں سے محبت ہوگئی تھی۔ لیکن تم نے ہمیں نہیں دیکھا کہ ساری مخلوق ہم نے اپنے ہاتھ سے بنائی۔ اور تم نے ایک مرتبہ کہہ دیا:

﴿رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكَافِرِيْنَ دَيَّارًا﴾ (۱)

''اے اللہ! زمین میں بسنے والے سب کافروں کو ہلاک کر دے، اور ان میں سے کوئی باقی نہ رہے''

---

(۱) نوح: ۲۳

تمہارے اس کہنے پر ہم نے اپنی مخلوق کو ہلاک کر دیا۔ اشارہ اس بات کی طرف فرمایا کہ جس مٹی سے تم برتن بنا رہے تھے، باوجودیکہ وہ مٹی تمہاری پیدا کی ہوئی نہیں تھی۔ اور اپنی خواہش سے وہ برتن نہیں بنا رہے تھے، بلکہ میرے حکم سے بنا رہے تھے۔ پھر بھی تمہیں ان سے محبت ہو گئی تھی تو کیا ہمیں اپنی مخلوق سے محبت نہیں ہوگی؟ جب محبت ہے تو پھر تمہیں بھی میری مخلوق کے ساتھ محبت کرنی پڑے گی۔ اگر تمہیں میرے ساتھ محبت ہے۔

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بات

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

''جب ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں، اور اس سے محبت کی دعائیں مانگتے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں اپنی محبت عطا فرما۔ اس وقت مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ یوں فرمارہے ہیں کہ تم مجھ سے محبت کرنا چاہتے ہو؟ حالانکہ تم نے مجھے دیکھا تو ہے نہیں کہ براہِ راست تم مجھ سے محبت کر سکو، اور مجھ سے اسی طرح کا تعلق قائم کر سکو جیسے کسی چیز کو دیکھتے ہوئے کیا جا سکتا ہے، لیکن اگر تمہیں مجھ سے تعلق قائم کرنا ہے تو میں نے دنیا میں اپنی محبت کا مظہر ان بندوں کو بنایا ہے۔ لہٰذا تم میرے بندوں سے محبت کرو۔ اور میرے بندوں پر رحم کھاؤ۔ اور ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرو، اس سے میری محبت پیدا ہوگی۔ اور مجھ سے محبت کرنے کا طریقہ بھی یہی ہے''

لہٰذا یہ سمجھنا کہ ہم تو اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں۔ یہ بندے کیا چیز ہیں؟ یہ مخلوق کیا چیز ہیں؟ یہ تو حقیر ہیں۔ اور پھر ان مخلوق کی طرف حقارت کی نگاہ ڈالنا، ان کو برا سمجھنا، اور ان کو کمتر جاننا، یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ سے جو محبت ہے، وہ جھوٹی محبت ہے، اس لئے کہ جس کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے محبت ہوگی، اس کو اللہ کی مخلوق سے ضرور محبت ہوگی۔ اسی لئے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اپنے کسی بھائی کے کام میں اور اس کی حاجت پوری کرنے میں لگا ہوا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے کام بنانے میں لگے رہتے ہیں۔ اور جو شخص کسی مسلمان بھائی کی بے چینی کو دور کرے، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی بے چینی کو دور فرمائیں گے۔

اولیاء کرام کی حالت

جتنے اولیاء کرام رحمہم اللہ گزرے ہیں، ان سب کا حال یہ تھا کہ وہ اگر مخلوق کو برے حال میں دیکھتے، یا فسق و فجور میں اور گناہوں کے اندر مبتلا دیکھتے تو وہ اولیاء ان گناہوں سے تو نفرت کرتے

تھے، اس لئے کہ گناہوں سے نفرت کرنا واجب ہے، ان کے فسق و فجور سے اور ان کے اعمال سے نفرت کرنا واجب ہے، لیکن دل میں اس آدمی سے نفرت نہیں ہوتی تھی، اس کی حقارت دل میں نہیں ہوتی تھی۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ دریائے دجلہ کے کنارے چہل قدمی کرتے ہوئے جا رہے تھے، قریب سے دریا میں ایک کشتی گزری۔ اس کشتی میں اوباش قسم کے نوجوان بیٹھے ہوئے تھے۔ اور گاتے بجاتے ہوئے جا رہے تھے۔ اور جب گانا بجانا ہو رہا ہو، اور ہنسی مذاق کی محفل ہو، اس موقع پر اگر کوئی مُلا پاس سے گزرے تو اس مُلا کا مذاق اُڑانا بھی تفریح کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ان اوباش لوگوں نے حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا مذاق اُڑایا۔ اور آپ پر کچھ فقرے کسے۔ حضرت کے ساتھ ایک صاحب اور تھے۔ انہوں نے یہ صورتِ حال دیکھ کر فرمایا کہ حضرت! آپ ان کے حق میں بددعا فرما دیں، کیونکہ یہ لوگ اتنے گستاخ ہیں کہ ایک طرف تو خود فسق و فجور اور گناہوں میں مبتلا ہیں، اور دوسری طرف اللہ والوں کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فوراً دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے، اور فرمایا:

> ''اے اللہ، آپ نے ان نوجوانوں کو جس طرح یہاں دنیا میں خوشیاں عطا فرمائی ہیں ان کے اعمال ایسے کر دیجئے کہ وہاں آخرت میں بھی ان کو خوشیاں نصیب ہوں''

دیکھئے، ان کی ذات سے نفرت نہیں فرمائی، اس لئے کہ یہ تو میرے اللہ کی مخلوق ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی اُمت پر شفقت

حضورِ اقدس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو تمام دنیا کے لئے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجے گئے، جب آپ پر کفار کی طرف سے اینٹیں برسائی جا رہی تھیں، آپ کو پتھر مارے جا رہے تھے، آپ کے پاؤں زخم سے لہولہان تھے، لیکن اس وقت بھی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے:

> ((اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِیْ فَإِنَّهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ))
>
> ''اے اللہ، میری قوم کو ہدایت عطا فرما، ان کو علم نہیں ہے، یہ مجھے جانتے نہیں ہیں، یہ نادان ہیں، اور نادانی میں یہ حرکت کر رہے ہیں، اے اللہ، ان کو ہدایت عطا فرما''(۱)

زبان پر یہ الفاظ اس لئے جاری ہوئے کہ کفار کے ان اعمال سے تو نفرت اور بغض ہے، لیکن

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب استتابة المرتدین والمعاندین وقتالهم، باب اذا عرض الذمی وغیره بسب النبی ولم یصرح...... الخ، رقم: ٦٤١٧، صحیح مسلم، (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

ان کی ذات سے نفرت نہیں۔ اور ذات بحیثیت ذات کے میرے اللہ کی مخلوق ہے۔ اور میرے اللہ کی مخلوق سے مجھے محبت ہے۔

گناہ گار سے نفرت مت کرو

یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ فسق و فجور سے اور گناہوں سے نفرت نہ کرنا بھی گناہ ہے۔ گناہوں سے ضرور نفرت کرنی چاہئے۔ اور ان کو برا سمجھنا چاہئے۔ لیکن جو شخص ان گناہوں کے اندر مبتلا ہے، اس کی ذات کی حقارت دل میں نہ آنی چاہئے۔ اس سے نفرت نہ ہو۔ بلکہ اس پر ترس کھانا چاہئے۔ جس طرح ایک شخص بیمار ہو جائے اور علاج کے لئے ڈاکٹر کے پاس جائے تو اب ڈاکٹر کا یہ کام نہیں ہے کہ اس پر ناراض ہو جائے کہ تم کیوں بیمار پڑے؟ بلکہ وہ ڈاکٹر اس بیمار کے اوپر ترس کھاتا ہے کہ بیچارہ اس بیماری میں مبتلا ہو گیا، اور اس کا علاج کرتا ہے۔ اور اس کے لئے دعا کرتا ہے کہ یا اللہ! اس کی بیماری کو دور فرما دے۔ اسی طرح گناہ گار، فاسق و فاجر کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہونا چاہئے کہ ان کے فسق و فجور سے بغض اور نفرت ہو۔ لیکن ان کی ذات سے بغض اور نفرت نہ ہو۔ بلکہ اس کی ذات کے ساتھ اس لحاظ سے محبت ہو کہ یہ میرے اللہ کی مخلوق ہے۔ اور اس کے لئے دعا کرے کہ اللہ تعالیٰ اس کو راہِ راست پر لے آئے۔

ایک تاجر کی مغفرت کا عجیب قصہ

ایک حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک شخص اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہوا۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے روز جب حساب کتاب ہوگا تو اس وقت وہ پیش ہوگا، لیکن اس کا کوئی نمونہ ہو سکتا ہے کہ پہلے بھی کسی وقت دکھا دیا جاتا ہو۔ بہرحال، جب وہ پیش ہوا تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ اس کا اعمال نامہ دیکھو کہ اس نے کیا کیا اعمال کیے ہیں۔ جب فرشتوں نے دیکھا تو یہ معلوم ہوا کہ اس کا اعمال نامہ نیکیوں سے تقریباً خالی ہے۔ نہ نماز ہے نہ روزہ ہے، نہ کوئی اور عبادت ہے، بس دن رات تجارت کرتا رہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ تمام بندوں کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔ لیکن دوسروں کے سامنے ظاہر کرانے کے لئے فرشتوں سے پوچھتے ہیں کہ ذرا اچھی طرح دیکھو کہ کوئی اور نیک عمل اعمال نامے میں ہے یا نہیں؟ اس وقت فرشتے عرض کریں گے کہ ہاں! اس کا ایک نیک عمل ہے، وہ یہ کہ یہ شخص اگرچہ کوئی خاص نیک عمل

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) كتاب الجهاد والسير، باب غزوة أحد، رقم: ٣٣٤٧، سنن ابن ماجه، كتاب الفتن، باب الصبر على البلاء، رقم: ٤٠١٥، مسند أحمد، رقم: ٣٤٢٩۔

تو نہیں کرتا تھا، لیکن یہ تجارت کرتا تھا۔ اور اپنے غلاموں کو تجارت کا سامان دے کر بھیجتا کہ جا کر یہ سامان بیچ کر اس کے پیسے لا کر دیں۔

اس شخص نے اپنے غلاموں کو یہ تاکید کر رکھی تھی کہ جب کسی کو کوئی سامان فروخت کرو اور تم یہ دیکھو کہ وہ شخص تنگدست اور مفلس ہے تو اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنا۔ اگر اس کو ادھار دیا ہے تو اس سے ادھار وصول کرنے میں بہت سختی سے کام مت لینا، اور کبھی کسی کو معاف بھی کر دیا کرنا۔ چنانچہ ساری عمر تجارت کے اندر اس کا یہ معمول رہا کہ جب کسی تنگدست سے معاملہ کیا تو یا تو اس کو مہلت دیدی۔ اگر موقع ہوا تو اس کو معاف ہی کر دیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اچھا یہ میرے بندوں کو معاف کرتا تھا۔ تو میں اس بات کا زیادہ مستحق ہوں کہ اس کو معاف کروں، چنانچہ پھر فرشتوں کو حکم دیں گے کہ اس سے درگزر کا معاملہ کرو۔ اور اس کو جنت میں بھیج دو۔ (۱)

بہر حال بندوں کے ساتھ معافی کا معاملہ کرنا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔

یہ رحمت کا معاملہ تھا، قانون کا نہیں

لیکن ایک بات یاد رکھئے کہ یہ اوپر کا معاملہ یہ رحمت کا معاملہ ہے، یہ کوئی قانون نہیں ہے۔ لہٰذا کوئی شخص یہ نہ سوچے کہ یہ اچھا نسخہ ہاتھ آ گیا کہ نہ نماز پڑھو، نہ روزہ رکھو، نہ زکوٰۃ دو، نہ دوسرے فرائض انجام دو، نہ گناہوں سے بچو، بس میں بھی اسی طرح لوگوں کو معاف کر دیا کروں گا تو قیامت کے روز میری بھی معافی ہو جائے گی۔ یہ درست نہیں۔ اس لئے کہ یہ معاملہ رحمت کا ہے۔ اور اللہ کی رحمت کسی قاعدے اور قانون کی پابند نہیں ہوتی۔ وہ جس کو چاہیں، اپنی رحمت سے بخش دیں۔ لیکن قانون یہ ہے کہ فرائض کی ادائیگی ضرور کرنی ہے، گناہوں سے بچنا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص فرائض کی ادائیگی نہیں کرتا، یا گناہوں سے نہیں بچتا تو محض کسی ایک عمل کی بنیاد پر تکیہ کر کے بیٹھ جائے کہ بس اس ایک عمل کے ذریعہ میری چھٹی ہو جائے گی، یہ بات درست نہیں۔ اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قانون نہیں ہے۔ جس شخص کی صرف ایک عمل کی بنیاد پر بخشش ہو گئی، معلوم نہیں اس نے وہ عمل کس جذبہ کے ساتھ کیا ہو گا۔ اور اس کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آ گئی، اور اللہ تعالیٰ نے اس کو معاف کر دیا۔ ہمارے اور آپ کے لئے یہ کوئی ہمیشہ کا دستور العمل نہیں ہے۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب فی الاستقراض واداء الدیون والحجر والتفلیس، باب حسن التقاضی، رقم: ۲۲۱۶، صحیح مسلم، کتاب المساقاة، باب فضل انظار المعسر، رقم: ۲۹۲۱، سنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول اللہ، باب ما جاء فی انظار المعسر والرفق به، رقم: ۱۲۲۸، مسند أحمد، رقم: ۱٦٤٦٤

ایک بچے کا نواب کو گالی دینا

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس قسم کے واقعات کی صحیح حقیقت سمجھانے کے لئے ایک واقعہ بیان فرمایا کہ نظام حیدرآباد دکن کے ایک نواب صاحب تھے۔ ان کے وزیر نے ایک مرتبہ ان کی دعوت کر دی، اور ان کو اپنے گھر بلایا۔ جب نواب صاحب گھر میں داخل ہوئے تو وزیر صاحب کا بچہ وہاں پر کھیل رہا تھا۔ نواب صاحب کو بچوں سے چھیڑ خوانی کرنے کی عادت تھی۔ انہوں نے وزیر کے بچے کو چھیڑنے کے لئے اس کا کان پکڑ لیا۔ وہ بہت تیز طرار تھا۔ وہ کیا جانے کہ نواب کون ہے، اور بادشاہ کون ہے۔ بچے نے پلٹ کر نواب صاحب کو گالی دیدی۔ جب وزیر صاحب نے بچے کے منہ سے نواب صاحب کے لئے گالی سنی تو ان کی جان نکل گئی کہ میرے بچے نے نواب صاحب کو گالی دیدی۔ اور نواب صاحب کی تو زبان قانون ہوتی ہے۔ اب پتہ نہیں بچے کا کیا حشر کرے گا۔ اس لئے وزیر نے اپنی وفاداری جتانے کے لئے تلوار نکال لی، اور کہا کہ میں ابھی اس کا سر قلم کرتا ہوں، اس نے نواب صاحب کی شان میں گستاخی کی ہے۔ نواب صاحب نے روکا کہ نہیں۔ چھوڑو، یہ بچہ ہی تو ہے۔ باقی یہ بچہ ذہین لگتا ہے۔ اور اس میں اتنی خودداری ہے کہ اگر کوئی شخص اس کا کان مروڑ دے تو یہ بچہ فوراً اس کے آگے ہتھیار ڈالنے والا نہیں ہے۔ بلکہ بڑا ذہین اور خوددار ہے۔ اپنا بدلہ خود لینے والا ہے۔ اور اپنے اوپر اعتماد رکھنے والا ہے۔ ایسا کرو کہ اس کا ماہانہ وظیفہ جاری کردو۔ چنانچہ اس کا وظیفہ جاری ہوا۔ اس وظیفہ کا نام تھا ''وظیفہ دشنام'' یعنی گالی دینے کا وظیفہ۔

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اب تم بھی یہ سوچ کر کہ گالی دینے سے وظیفہ جاری ہوتا ہے لہٰذا تم بھی جا کر نواب صاحب کو گالی دے آؤ۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی ایسا نہیں کرے گا۔ کیونکہ یہ خاص طور پر اس بچے کے خاص حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بادشاہ کی سخاوت کا ایک مظاہرہ تھا کہ گالی دینے کے باوجود بچے کو نواز دیا۔ لیکن یہ کوئی عام قانون نہیں تھا کہ جو کوئی نواب صاحب کو گالی دے گا تو اس کو وظیفہ ملے گا۔ بلکہ اب کوئی گالی دے گا تو پٹائی ہوگی۔ جیل میں بند کر دیا جائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ سر قلم کر دیا جائے۔

یہی معاملہ اللہ تعالیٰ کی نکتہ نوازی کا ہے کہ کسی کو کسی نکتے سے نواز دیا، اور کسی کو کسی نکتے سے نواز دیا، کسی کا کوئی عمل قبول فرمالیا، اور کسی کا کوئی عمل قبول فرمالیا، ان کی رحمت کسی قید کسی شرط اور کسی قانون کی پابند نہیں۔ وَسِعَتْ رَحْمَتِيْ كُلَّ شَيْءٍ، میری رحمت تو ہر چیز پر وسیع ہے۔ اس لئے کسی کے ساتھ ناانصافی کبھی نہیں ہوتی، لیکن بعض اوقات کسی کو کسی عمل پر نواز دیا جاتا ہے۔ جب وہ عمل اللہ تعالیٰ کو پسند آجائے۔

کسی نیک کام کو حقیر مت سمجھو

اس سے یہ نتیجہ تو ضرور نکالا جاتا ہے کہ کوئی نیکی کا کام حقیر نہیں ہوتا، کیا پتہ کہ اللہ تعالیٰ کس نیک کام کو قبول فرمالیں، اور اس سے بیڑا پار ہو جائے، اس لئے کسی نیکی کے کام کو حقیر نہیں سمجھنا چاہئے، لیکن یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ چونکہ یہ واقعات سننے میں آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں نیک کام پر بخش دیا، لہٰذا اب نہ تو نماز پڑھنے کی ضرورت ہے اور نہ فرائض ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ بس آدمی اللہ کی رحمت پر تکیہ کر کے بیٹھ جائے۔ چنانچہ یہ حدیث آپ نے سنی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ عاجز شخص وہ ہے جو اپنے نفس کو خواہشات کے پیچھے چھوڑ دے۔ (۱)

اور جو دل میں آرہا ہے، وہ کام کر رہا ہے۔ یہ نہیں دیکھ رہا ہے کہ یہ کام حلال ہے یا حرام ہے۔ جائز ہے یا ناجائز۔ لیکن اللہ تعالیٰ پر تمنا اور آرزو لگائے بیٹھا ہے کہ اللہ میاں تو بڑے غفور رحیم ہیں، سب معاف فرمادیں گے۔ بہر حال، ان واقعات سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں۔

بندوں پر نرمی کرنے پر مغفرت

اسی طرح ایک اور حدیث میں جناب رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم سے پہلے جو اُمتیں گزری ہیں، ان میں ایک شخص ایسا تھا کہ جب وہ کوئی چیز فروخت کرتا، تو اس میں نرمی سے کام لیتا، یہ نہیں کہ پیسے پیسے پر لڑ رہا ہے۔ بلکہ گاہک کو ایک قیمت بتادی، اب گاہک کہہ رہا ہے کہ تھوڑی سی کمی کر دو تو اس نے یہ سوچ کر کہ چلو تھوڑا منافع کم سہی، چلو اس کو دے دو۔ اسی طرح جب وہ کوئی چیز خریدتا، تب بھی نرمی کا معاملہ کرتا۔ جب دکاندار نے چیز کی قیمت بتادی، اس نے بس ایک مرتبہ اس سے کہہ دیا کہ بھائی تھوڑی سی کم کر دو۔ یہ نہیں کہ قیمت کم کرانے کے لئے اس سے لڑ رہا ہے۔ اور اس سے زبردستی کم کرا رہا ہے۔ بلکہ ایک آدھ مرتبہ کہہ دینے کے بعد قیمت ادا کر کے چیز لے لی۔ اسی طرح جب دوسرے سے اپنا حق وصول کرنے کا وقت آتا، مثلاً کسی سے پیسے وصول کرتے ہیں، یا قرض وصول کرنا ہے۔ تب بھی نرمی کا معاملہ کرتا، اور اس سے کہتا کہ چلو ابھی پیسے نہیں ہیں تو بعد میں ادا کر دینا۔ تمہیں مہلت دیتا ہوں۔ جب آخرت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کی پیشی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ چونکہ یہ میرے بندوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرتا تھا، اس لئے میں بھی اس کے ساتھ نرمی

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب صفة القیامة والرقائق والورع عن رسول الله صلی الله علیه وسلم، باب منه، رقم: ۲۳۸۳، سنن ابن ماجه، کتاب الزهد، باب ذکر الموت والاستعداد له، رقم: ۴۲۵۰، مسند أحمد، رقم: ۱۶۵۰۱

کا معاملہ کرتا ہوں۔ اور پھر اس کی مغفرت فرمادی۔ بہر حال، اللہ تعالیٰ کو بندوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنا، اور تنگدست کے ساتھ آسانی کا معاملہ کرنا بہت ہی زیادہ پسند ہے۔

حضورِ اقدس ﷺ کا معمول

حضورِ اقدس ﷺ کی ساری زندگی کا یہ معمول تھا کہ جب بھی کسی کے ساتھ بیع وشراء کا معاملہ فرماتے تو اپنے ذمے جتنا واجب ہوتا اس سے زیادہ ہی دیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں سونے چاندی کے سکے رائج تھے۔ اور وہ سکے بھی مختلف ملکوں کے ہوتے تھے۔ اس لئے ان کی گنتی کے بجائے ان کا وزن دیکھا جاتا تھا کہ کتنے وزن کا ہے۔ اس کے ذریعہ قیمت ادا کی جاتی تھی۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک چیز بازار سے خریدی۔ دراہم کے ذریعہ جب اس کی قیمت ادا فرمانے لگے تو آپ نے وزن کرنے والے سے فرمایا:

((زِنْ وَارْجِعْ))(۱)

جھکتا ہوا تولو، یعنی میرے ذمے جتنے درہم واجب ہیں، اس سے کچھ زیادہ دیدو۔

ایک روایت میں آپ نے ارشاد فرمایا:

((إِنَّ خِيَارَكُمْ اَحْسَنُكُمْ قَضَاءً))

''تم میں سب سے بہتر لوگ وہ ہیں جو جب دوسرے کا حق ادا کریں تو اچھی طرح ادا کریں''(۲)

یعنی کچھ زیادہ ہی ادا کریں۔ کم نہ کریں۔ مثلاً آپ کے ذمے سو روپے قرض تھے۔ آپ نے سو کے بجائے ایک سو دس ادا کردیئے۔ اور یہ کہ دیتے وقت پریشان نہ کریں، چکر نہ کٹوائیں، ٹال مٹول نہ کریں۔ یہ سب باتیں اچھی طرح ادا کرنے اور حسنِ سلوک کے ساتھ ادا کرنے میں داخل ہیں۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب ما جاء فی الرجحان فی الوزن، رقم: ۱۲۲٦، سنن النسائی، کتاب البیوع، باب الرجحان فی الوزن، رقم: ٤٥١٥، سنن أبی داؤد، کتاب البیوع، باب فی الرجحان فی الوزن والوزن بالأجر، رقم: ۲۸۹۸، سنن ابن ماجه، کتاب التجارات، باب الرجحان فی الوزن، رقم: ۲۲۱۱۔

(۲) صحیح البخاری، کتاب الوکالة، باب وکالة الشاهد والغائب جائزة، رقم: ۲۱٤۰، سنن النسائی، کتاب البیوع، باب استسلاف الحیوان واستقراضه، رقم: ٤٥۳۹، مسند أحمد، رقم: ۸۷٤۳۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی وصیت

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، جو فقہ کے اندر ہمارے مقتدی ہیں، جن کی فقہ پر ہم عمل کرتے ہیں، انہوں نے اپنے شاگردوں کے نام ایک وصیت نامہ لکھا ہے۔ اس وصیت نامہ میں لکھتے ہیں:

''جب کسی کے ساتھ بیع وشراء کا معاملہ ہو تو اس کو اس کے حق سے کچھ زیادہ ہی دیدیا کرو، کم نہ کیا کرو''

یہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ ہم لوگوں نے صرف چند خاص خاص سنتیں یاد کرلی ہیں، اور اس پر عمل کر لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا حصہ ہے۔ ہمیں ان پر بھی عمل کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ اس حدیث میں اسی سنت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

((وَمَنْ يَسَّرَ عَلٰى مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ))

''یعنی جو شخص کسی تنگ دست کے ساتھ آسانی کا معاملہ کرے تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت دونوں میں اس کے ساتھ آسانی کا معاملہ فرمائیں گے''

اصل آسانی تو آخرت کی آسانی ہے۔ لیکن تجربہ یہ ہے کہ ایسا شخص دنیا میں بھی پریشان نہیں ہوتا۔

پیسے جوڑ جوڑ کر رکھنے والوں کے لئے بددعا

ایک حدیث میں ہے کہ ایک فرشتہ روزانہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتا ہے:

((اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا وَاَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا)) (۱)

''اے اللہ، جو شخص پیسوں کو جوڑ جوڑ کر رکھتا ہو، یعنی ہر وقت گنتا رہتا ہے کہ اب کتنے ہو گئے، اور اب کتنے ہو گئے، اور خرچ کرتے ہوئے جان نکل رہی ہے، اے اللہ، اس کے مال پر ہلاکت ڈال دے''

چنانچہ اس دعا کے نتیجہ میں اس کے مال پر اس طرح ہلاکت پڑتی ہے کہ کبھی اس کے پیسے چوری ہو گئے۔ کبھی ڈاکہ پڑ گیا۔ کبھی کوئی نقصان ہو گیا۔ اور کچھ نہ ہو تو بے برکتی ضرور ہو جاتی ہے۔ وہ پیسے اگرچہ گنتی میں تو زیادہ ہو گئے۔ لیکن ان پیسوں سے جو فائدہ حاصل ہونا چاہئے تھا، اور ان پیسوں

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الزكاة، باب قول الله تعالى فأما من أعطى..... الخ، رقم: ۱۳۵۱، صحيح مسلم، كتاب الزكاة، باب فى المنفق والممسك، رقم: ۱۶۷۸

میں جو برکت ہونی چاہئے تھی وہ فائدہ اور برکت حاصل نہ ہوئی۔ مثلاً پیسے تو زیادہ ہوگئے، لیکن گھر میں بیماریاں پیدا ہوگئیں، اور اب وہ پیسے ہسپتال اور ڈاکٹر کی نذر ہو رہے ہیں۔ بتائیے یہ کیسی برکت ہوئی؟ یا پیسے تو بہت جمع ہوگئے۔ لیکن گھر کے اندر نا چاقی ہوگئی اور اس کے نتیجے میں زندگی کا لطف جاتا رہا۔

پیسے خرچ کرنے والوں کے لئے دعا

پیسے خرچ کرنے والوں کے لئے فرشتہ یہ دعا کرتا ہے:

"وَاَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا"

اے اللہ، جو شخص اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہو، صدقہ خیرات کرتا ہو، لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرتا ہو، کسی کو پیسے دے رہا ہے، کسی کو پیسے معاف کر رہا ہے، اے اللہ، ایسے خرچ کرنے والے کو خرچ کا بدل دنیا میں ہی عطا فرما۔ بہر حال، جو شخص اس طرح لوگوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنے والا ہو، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوسروں کے مقابلہ میں اس کے پیسے زیادہ خرچ ہو رہے ہیں، لیکن جو پیسہ خرچ ہو رہا ہے، وہ حقیقت میں جا نہیں رہا ہے، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکت لا رہا ہے، اور اللہ تعالیٰ اس کو بدل عطا فرما دیتے ہیں۔ آج تک کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا گیا جو صرف اس وجہ سے مفلس ہوگیا کہ وہ صدقہ خیرات زیادہ کرتا تھا۔ یا لوگوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنے کی وجہ سے مفلس ہوگیا ہو۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ اس کو بدل ضرور عطا فرماتے ہیں۔ اسی لئے حدیث میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی اس کے لئے آسانی پیدا فرماتے ہیں۔ اور آخرت میں بھی آسانی پیدا فرمائیں گے۔

دوسروں کی پردہ پوشی کیجئے

تیسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا:

((وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا، سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ))

"جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے، قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کی پردہ پوشی فرمائیں گے"

مثلاً کسی مسلمان کا کوئی عیب یا غلطی سامنے آگئی کہ اس نے فلاں کام غلط اور ناجائز کیا ہے، اب ہر جگہ اس کے بارے میں چرچا کرتے پھرو کہ وہ تو یہ کام کر رہا تھا۔ اس کے بجائے اس کی پردہ پوشی کرو، اس کو چھپا دو، کسی اور کو مت بتاؤ۔ یہ طریقہ اس وقت اختیار کرنا چاہئے کہ جب اس کے عمل سے کسی دوسرے کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو۔ لیکن اگر اس کا ایسا عمل سامنے آیا، جس سے دوسرے کو

نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، مثلاً کسی کے قتل کرنے کی سازش کی جارہی ہے۔ اس وقت پردہ پوشی کرنا جائز نہیں، بلکہ دوسروں کو بتانا ضروری ہے۔ لیکن اگر اس کے عمل سے دوسرے کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہوتو پھر حکم یہ ہے کہ اس کی پردہ پوشی کرو۔ اور اس کے لئے دعا کرو کہ یا اللہ! یہ شخص اس گناہ کے اندر مبتلا ہوگیا ہے۔ آپ اپنی رحمت سے اس کو اس گناہ سے نکال دیجئے۔

بہرحال، دوسروں کے عیب نہ تو تلاش کرو، اور نہ ان کو پھیلانے کی کوشش کرو۔ آج کل اس بارے میں بڑی کوتاہی ہورہی ہے۔ ایک آدمی کے بارے میں آپ کو پتہ چل گیا کہ وہ فلاں کام کرتا ہے۔ اب آپ کے پیٹ میں یہ بات نہیں رکتی، اور دوسروں سے کہے بغیر آپ کو چین نہیں آتا۔ دوسروں کو بتانا ضروری سمجھتے ہیں۔ حالانکہ بلاوجہ دوسروں کے عیب تلاش کرنا ان کو پھیلانا گناہ ہے۔

دوسروں کو گناہ پر عار مت دلائیں

ایک حدیث میں جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ عَيَّرَ اَخَاهُ بِذَنْبٍ قَدْ تَابَ مِنْهُ لَمْ يَمُتْ حَتّٰى يَعْمَلَهُ))(۱)

''اگر کوئی شخص اپنے بھائی کو ایسے گناہ پر عار دلائے جس گناہ سے وہ توبہ کر چکا تھا، تو یہ شخص اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک خود اس گناہ میں مبتلا نہیں ہو جائے گا''

اگر ایک شخص سے کوئی گناہ ہوگیا، پھر اس نے اس گناہ سے توبہ کرلی۔ اب آپ اس کو بار بار اس گناہ پر عار دلا رہے ہیں کہ تو تو وہی ہے جس نے یہ حرکت کی تھی، اللہ تعالیٰ کو یہ بات بہت ناپسند ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے اس کے گناہ پر پردہ ڈال دیا، اور اس کے گناہ کو معاف کردیا، میں نے اس کے نامہ اعمال سے اس گناہ کو مٹادیا، اب تو کون ہے اس گناہ پر اعتراض کرنے والا، اور اس گناہ پر عار دلانے والا؟ اگر تو عار دلائے گا تو ہم تمہیں اس گناہ کے اندر مبتلا کردیں گے۔ اس لئے کسی مسلمان کی عیب جوئی کرنا، یا کسی مسلمان کے عیب کو بیان کرنا، اس کی تشہیر کرنا بڑا سخت گناہ کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس دنیا کے اندر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا کہ دوسروں کے عیوب کو اچھالتے پھرو۔ بلکہ تمہیں تو بندہ بنا کر بھیجا ہے۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله، رقم: ٢٤٢٩، سنن الترمذی کی روایت میں ''قد تاب منہ'' کے الفاظ نہیں ہیں۔ البتہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے حوالے سے تشریح میں یہ الفاظ موجود ہیں۔

اپنی فکر کریں

اس لئے تم اپنی فکر کرو، اپنے عیوب کو دیکھو، اپنے گریباں میں منہ ڈال کر دیکھو۔ اللہ تعالیٰ جس شخص کو اپنے عیوب کی فکر عطا فرما دیتے ہیں، اس کو دوسروں کے عیوب نظر ہی نہیں آتے۔ دوسروں کے عیوب اسی کو نظر آتے ہیں جو اپنے عیوب سے بے پرواہ ہو۔ جو اپنی اصلاح سے غافل ہو۔ جو شخص خود بیمار ہو، وہ دوسروں کے نزلہ وزکام کی کہاں فکر کرے گا۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو وہ احمق اور بیوقوف ہے۔ اس لئے دوسروں کے عیوب کے پیچھے پڑنا، تجسس کرنا، ان کی تشہیر کرنا بڑا سخت جرم ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اس حدیث میں بیان فرمایا۔ لہٰذا ایک مسلمان کا شیوہ نہیں ہے کہ وہ یہ کام کرے۔ مسلمان کو ان تمام برائیوں سے پرہیز کرنا لازم ہے۔ اس کے بغیر وہ صحیح معنی میں مسلمان نہیں بن سکتا۔

علمِ دین سیکھنے کی فضیلت اور اس پر بشارت

چوتھا جملہ یہ ارشاد فرمایا:

((وَمَنْ سَلَكَ طَرِيْقًا يَلْتَمِسُ فِيْهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللّٰهُ لَهٗ بِهٖ طَرِيْقًا اِلَى الْجَنَّةِ))

اس جملے میں ہم سب کے لئے بڑی خوشخبری اور بشارت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کا مصداق بننے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ فرمایا کہ جو شخص کوئی فاصلہ طے کرے یا کوئی راستہ چلے، اور راستہ چلنے اور فاصلہ طے کرنے سے اس کا مقصد یہ ہو کہ دین کی کوئی بات معلوم ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس چلنے کی بدولت اس کے لئے جنت کا راستہ آسان فرما دیں گے۔ دین کی ایک بات معلوم کرنے کی خاطر جو سفر کیا جائے گا۔ مثلاً کوئی معاملہ پیش آیا، اور آپ کو اس کے بارے میں مسئلہ معلوم نہیں ہے، آپ مسئلہ معلوم کرنے کے لئے کسی کے پاس جا رہے ہیں کہ مجھے اس بارے میں کیا کرنا چاہئے؟ اب مفتی کے پاس جو چل کر گئے تو اس سے آپ کو یہ فضیلت حاصل ہوگئی۔

یہ علم ہمارے اسلاف نے محنت سے جمع کر دیا

ہم لوگ علم حاصل کرنے کے لئے وہ محنت کہاں کر سکتے ہیں جو محنت ہمارے اسلاف کر گئے۔ آج ہم لوگ آرام سے بیٹھ کر کتاب کھول کر یہ حدیث پڑھ رہے ہیں، اور اس پر وعظ کر رہے ہیں۔ ہمارے اسلاف فاقے کر کے، روکھی سوکھی کھا کر، موٹا جھوٹا پہن کر، مشقت اُٹھا کر، قربانیاں دے کر یہ علم ہمارے لئے اس شکل میں تیار کر کے چلے گئے۔ اگر وہ لوگ اس طرح محنت نہ

کرتے تو نبی کریم ﷺ کے یہ ارشادات اس طرح ہمارے پاس محفوظ نہ ہوتے، سرکارِ دو عالم ﷺ کی ایک ایک ادا محفوظ کر کے چلے گئے۔ قیامِ قیامت تک آنے والوں کے لئے لائحۂ عمل بتا گئے۔ ایک مشعلِ راہ بتا گئے۔

ایک حدیث کے لئے پندرہ سو کلومیٹر کا سفر

بخاری شریف میں ایک روایت ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ جو حضورِ اقدس ﷺ کے بڑے قریبی صحابی تھے، اور انصاری تھے، حضورِ اقدس ﷺ کی وصال کے بعد ایک دن بیٹھے ہوئے تھے، ان کو معلوم ہوا کہ تہجد کی نماز کی فضیلت کے بارے میں ایک حدیث ایسی ہے، جو میں نے نہیں سنی، بلکہ ایک دوسرے صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے براہِ راست سنی ہے۔ جو اس وقت شام کے شہر دمشق میں مقیم ہیں۔ ان کے دل میں خیال آیا کہ یہ حدیث بالواسطہ اپنے پاس کیوں رکھوں۔ بلکہ جن صحابی نے یہ حدیث حضورِ اقدس ﷺ سے سنی ہے، میں ان سے براہِ راست کیوں نہ حاصل کرلوں۔ اب انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ وہ صحابی کہاں ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ وہ شام کے شہر دمشق میں مقیم ہیں، (جبکہ خود مدینہ منورہ میں مقیم تھے) اور مدینہ منورہ طیبہ سے دمشق کا فاصلہ تقریباً پندرہ سو کلومیٹر کا ہے۔ میں نے خود اس راستے پر سفر کیا ہے۔ وہ پورا راستہ لق و دق صحرا ہے۔ نہ اس میں کوئی ٹیلہ ہے، نہ کوئی درخت ہے، نہ پانی ہے، چنانچہ اسی وقت حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اُونٹ منگوایا، اور اس پر سوار ہو کر روانہ ہو گئے، اور پندرہ سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے دمشق پہنچ گئے۔ وہاں جا کر ان کے گھر کا پتہ لگایا۔ دروازے پر پہنچ کر دستک دی۔ ان صحابی نے دروازہ کھولا۔ اور پوچھا: کیسے آنا ہوا؟ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے سنا ہے کہ تہجد کی فضیلت پر آپ نے ایک حدیث حضورِ اقدس ﷺ سے براہِ راست سنی ہے۔ میں وہ حدیث آپ کی زبان سے سننے کے لئے آیا ہوں۔ ان صحابی نے پوچھا کہ آپ مدینہ طیبہ سے صرف اسی کام کے لئے آئے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں! صرف اسی کام کے لئے آیا ہوں۔ ان صحابی نے کہا کہ وہ حدیث تو میں بعد میں سناؤں گا، لیکن پہلے ایک اور حدیث سن لو جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنی تھی۔ پھر یہی حدیث سنائی کہ جو شخص کوئی راستہ قطع کرے، جس کے ذریعہ وہ اللہ تعالیٰ کے دین کا علم حاصل کرنا چاہتا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان فرما دیتے ہیں۔ پہلے یہ حدیث سنائی اور پھر تہجد کی فضیلت والی حدیث سنائی۔ حدیث سنانے کے بعد ان صحابی نے فرمایا کہ اب تھوڑی دیر اندر بیٹھیں، اور کھانا کھائیں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نہیں۔ میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ اس لئے کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ پورا سفر صرف رسول اللہ ﷺ کی حدیث کی خاطر ہو۔ اس سفر میں کسی اور کام کا ذرہ برابر بھی دخل نہ ہو، اب میں کوئی اور کام کرنا نہیں چاہتا۔ یہ

حدیث مجھے مل گئی ۔ اور میرا مقصد حاصل ہو گیا ۔ میں مدینہ طیبہ واپس جا رہا ہوں ۔ السلام علیکم ۔ (۱)

مجلس دین آتے وقت سیکھنے کی نیت کر لیا کریں

دیکھئے ! ایک حدیث کی خاطر اتنا لمبا سفر کیا ۔ اور یہ میں نے آپ کو صرف ایک مثال بتائی ۔ ورنہ صحابہ کرام کے حالات اور تابعین اور تبع تابعین کے حالات اُٹھا کر دیکھئے تو یہ نظر آئے گا کہ ان میں سے ایک ایک نے دین کا علم حاصل کرنے کی خاطر اور احادیث جمع کرنے کی خاطر لمبے لمبے سفر کیے ۔ آج احادیث کا یہ مجموعہ پکی پکائی روٹی کی شکل میں ہمارے سامنے ہے ۔ ان اللہ کے بندوں نے اپنے مال قربان کیے ، اور اپنی جانیں قربان کیں ، اور مشقتیں اُٹھائیں ، تب جا کر یہ علم ہم تک پہنچا ہے ۔ یہ محنت وہ حضرات کر گئے ۔ اگر ہمارے ذمے یہ کام ہوتا تو یہ دین کا علم ضائع ہو چکا ہوتا ۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا کرم تھا کہ اس نے اس کام کے لئے وہ قوم پیدا کر دی تھی جنہوں نے آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے دین کو محفوظ کر دیا ۔ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ یہ دین محفوظ ہے ، کتابیں چھپی ہوئی ہیں ۔ اور ہر دور میں دین کو پڑھنے پڑھانے والے ، جاننے والے ہر جگہ موجود رہے ہیں ۔ بس اب تمہارا اتنا کام ہے کہ ان کے پاس جا کر علم سیکھ لو ، اور مسئلہ معلوم کر لو ، بہر حال ، اس حدیث میں علم سیکھنے والے کے لئے یہ عظیم بشارت بیان فرمائی ۔ ہم لوگ جو یہاں جمع ہوتے ہیں ، اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ دین کی بات سنیں اور سنائیں ، اور دین کا علم حاصل کریں ، اس لئے گھر سے چلتے وقت اس حدیث کو ذہن میں لے آیا کریں کہ ہم دین کا علم حاصل کرنے جا رہے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ اس حدیث کی بشارت ہم سب کو عطا فرمائے ۔ آمین ۔

اللہ کے گھر میں جمع ہونے والوں کے لئے عظیم بشارت

حدیث کے اگلے جملے میں ایک اور بشارت بیان فرمائی ، فرمایا کہ کوئی جماعت اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر یعنی مسجد میں جمع ہو کر بیٹھ جائے ، اللہ کی کتاب کی تلاوت کے لئے ، یا اللہ کی کتاب کی درس و تدریس کے لئے ، یعنی اللہ کے دین کی باتوں کو سننے سنانے کے لئے بیٹھ جائے تو جس وقت وہ لوگ اس مقصد کے لئے جمع ہوتے ہیں تو اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر سکینت نازل ہوتی ہے ۔ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کو ڈھانپ لیتی ہے ۔ اور چاروں طرف سے ملائکہ اس مجلس اور مجمع کو گھیر لیتے ہیں ، ملائکہ کے گھیرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کی طرف متوجہ ہے ، اور ملائکہ

---

(۱) مسند أحمد، حديث عبدالله بن أنيس، رقم: ١٥٤٦٤ ۔ امام بخاری نے اس واقعہ کو ترجمۃ الباب میں ذکر کیا ہے ۔

رحمت ان بندوں کے لئے دعا کرتے ہیں۔ اور ان کے لئے استغفار اور التجاء کرتے ہیں کہ یا اللہ! یہ لوگ آپ کے دین کی خاطر جمع ہوئے ہیں۔ یا اللہ! آپ اپنی رحمت سے ان کی مغفرت فرما دیجئے۔ ان پر رحمتیں نازل فرمائیے۔ ان کے گناہ معاف فرمائیے۔ ان کو دین کی توفیق عطا فرمائیے۔

تم اللہ کا ذکر کرو، اللہ تمہارا ذکر کریں گے

اگلا جملہ یہ ارشاد فرمایا:

((وَذَكَرَهُمُ اللّٰهُ فِيْمَنْ عِنْدَهُ))

یعنی اللہ تعالیٰ اپنی محفل میں ان اہل مجلس کا ذکر فرماتے ہیں کہ یہ میرے بندے اپنے سارے کام چھوڑ کر صرف میری خاطر اور میرا ذکر کرنے کے لئے، میرا ذکر سننے کے لئے، میرے دین کی باتیں سننے کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ اور اپنے اردگرد کے ملائکہ کے سامنے اس محفل کا تذکرہ فرماتے ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات ہے! ارے یہ بہت بڑی بات ہے۔

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

یہ کوئی معمولی بات ہے کہ محبوبِ حقیقی ہمارا ذکر کرے۔ ارے یہ کام تو ہمارا تھا کہ ہم ان کا ذکر کرتے، ہمیں پہلے حکم دیا کہ "فَاذْكُرُوْنِيْ" تم میرا ذکر کرو، لیکن ساتھ ہی اس ذکر کا صلہ اور بدلہ بھی عطا فرما دیا کہ "اَذْكُرْكُمْ" تم میرا ذکر کرو گے میں تمہارا ذکر کروں گا۔ تم مجھے یاد کرو گے میں تمہیں یاد کروں گا۔ حالانکہ ہمارا ذکر کیا حقیقت رکھتا ہے۔ ذکر کرلیں تو کیا، نہ کریں تو کیا۔ ہمارے ذکر کرنے سے ان کی عظمت اور جلال میں ذرہ برابر بھی اضافہ نہیں ہوتا۔ اور اگر ہم ان کا ذکر چھوڑ دیں، بلکہ ساری دنیا ان کا ذکر کرنا چھوڑ دے تو بھی ان کی عظمت اور جلال میں ذرہ برابر کمی نہیں آئے گی۔ ہماری مثال تو ایک تنکے جیسی ہے۔ ایک تنکے نے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرلیا تو کیا کمال کیا۔ لیکن وہ بندے کا ذکر کریں، یہ معمولی بات نہیں۔

حضرت اُبیّ بن کعب سے قرآن پاک سنانے کی فرمائش

حضرت اُبیّ بن کعب رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں۔ ہر صحابی میں اللہ تعالیٰ نے الگ الگ خصوصیات رکھی تھیں۔ حضرت اُبیّ بن کعب رضی اللہ عنہ کی خصوصیت یہ تھی کہ قرآن کریم بہترین پڑھا کرتے تھے۔ اسی لئے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں فرمایا:

((اَقْرَؤُهُمْ اُبَیُّ بْنُ كَعْبٍ))(۱)

"سارے صحابہ میں سب سے بہتر قرآن کریم پڑھنے والے اُبیّ بن کعب رضی اللہ عنہ ہیں"

(۱) سنن الترمذی، کتاب المناقب عن رسول اللّٰہ، باب مناقب (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

ایک دن حضرت اُبیّ بن کعب رضی اللہ عنہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اُبیّ بن کعب رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل امین کے واسطے سے یہ پیغام بھیجا ہے کہ تم اُبیّ بن کعب سے کہو کہ وہ تمہیں قرآن شریف سنائیں۔ جب حضرت اُبیّ بن کعب رضی اللہ عنہ نے یہ بات سنی تو فوراً یہ سوال کیا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے میرا نام لے کر فرمایا ہے کہ اُبیّ بن کعب سے ایسا کہو؟ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں! تمہارا نام لے کر فرمایا ہے۔ بس اسی وقت حضرت اُبیّ بن کعب رضی اللہ عنہ پر گریہ طاری ہو گیا، اور روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں، اور فرمایا کہ میں اس قابل کہاں کہ اللہ تعالیٰ میرا ذکر فرمائیں، اور میرا نام لیں۔ (۱)

اللہ کا ذکر کرنے پر عظیم بشارت

بہر حال، اللہ تعالیٰ کسی بندے کا ذکر فرمائیں، یہ اتنی بڑی دولت اور نعمت ہے کہ ساری دنیا کی نعمتیں اور دولتیں ایک طرف، یہ نعمت ایک طرف۔ اس حدیث میں اسی عظیم نعمت کے بارے میں فرمایا کہ جب اللہ کا دین سیکھنے کی خاطر، اور دین کے پڑھنے پڑھانے کی خاطر لوگ کسی جگہ جمع ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے ملائکہ کے مجمع میں ان کا ذکر فرماتے ہیں۔ ایک حدیث قدسی ہے۔ ''حدیث قدسی'' اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اللہ جل شانہ کا کلام نقل فرمائیں، ایک حدیث قدسی میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ جل شانہ نے فرمایا:

((مَنْ ذَکَرَنِیْ فِیْ نَفْسِہٖ ذَکَرْتُہٗ فِیْ نَفْسِیْ، وَمَنْ ذَکَرَنِیْ فِیْ مَلَإٍ ذَکَرْتُہٗ فِیْ مَلَإٍ خَیْرٍ مِنْہُ))(۲)

''جو شخص میرا ذکر تنہائی میں کرتا ہے تو میں اس کا ذکر تنہائی میں کرتا ہوں، اور اس کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) معاذ بن جبل و زید بن ثابت و أبی بن کعب، رقم: ۳۷۲۳، سنن ابن ماجه، المقدمة، باب فضائل خباب، رقم: ۱۵۱، مسند أحمد، مسند انس بن مالك، رقم: ۱۲۴۳۷۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب مناقب أبی بن کعب، رقم: ۳۵۲۵، صحیح مسلم، باب فضائل أبی بن کعب وجماعة من الأنصار، رقم: ۴۵۰۹، سنن الترمذی، کتاب المناقب عن رسول الله، باب مناقب معاذ بن جبل وزید بن ثابت وأبی بن کعب، رقم: ۳۷۲۵، مسند أحمد، مسند انس بن مالك، رقم: ۱۱۸۔

(۲) صحیح البخاری، کتاب التوحید، باب قول الله تعالی ویحذرکم الله نفسه، رقم: ۶۸۵۶، صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والإستغفار، رقم: ۴۸۳۲، سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول الله، رقم: ۲۳۱۰، سنن ابن ماجه، کتاب الأدب، رقم: ۳۸۱۲، مسند أحمد، رقم: ۷۱۱۵۔

یاد کرتا ہوں۔ اور جو شخص میرا ذکر کسی مجمع میں کرتا ہے تو میں اس کا ذکر اس سے بہتر مجمع میں کرتا ہوں۔ یعنی وہ میرا ذکر انسانوں کے مجمع میں کرتا ہے، میں اس کا ذکر ملائکہ کے مجمع میں کرتا ہوں"

ذکر کی کتنی بڑی فضیلت بیان فرمادی۔ اس میں وہ سب لوگ داخل ہیں جو دین کی درس و تدریس کے لئے، یا دین کے افہام و تفہیم کے لئے کسی جگہ جمع ہو جائیں۔ وہ سب اس فضیلت کے اندر داخل ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم سب کو اس کا مصداق بننے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ہم لوگ جو یہاں ہفتے میں ایک دن جمع ہو کر بیٹھ جاتے ہیں، اور دین کی باتوں کا تذکرہ کر لیتے ہیں، یہ معمولی چیز نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بڑی فضیلت اور ثواب اور اجر کی چیز ہے، بشرطیکہ دل میں اخلاص ہو۔ اور اللہ کے دین کی طلب ہو۔

اُونچا خاندان ہونا نجات کے لئے کافی نہیں

اس حدیث میں آخری جملہ یہ ارشاد فرمایا:

((مَنْ بَطَّأَ بِهِ عَمَلُهُ لَمْ تُسْرِعْ بِهِ نَسَبُهُ))

یہ جملہ بھی جوامع الکلم میں سے ہے، معنی اس کے یہ ہیں کہ جس شخص کے عمل نے اس کو پیچھے چھوڑ دیا، یا جو شخص اپنے عمل کی وجہ سے پیچھے رہ گیا، تو محض اس کا نسب اس کو آگے نہیں بڑھا سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ کسی کا عمل خراب ہے، اور اس خراب عمل کی وجہ سے جنت تک نہیں پہنچ سکا، بلکہ پیچھے رہ گیا۔ جبکہ دوسرے لوگ جلدی جلدی قدم بڑھا کر جنت میں پہنچ گئے۔ بقول کسی کے۔

یارانِ تیز گام نے محمل کو جالیا
ہم محوِ نالہ جرسِ کارواں رہے

وہ لوگ آگے چلے گئے۔ اور یہ اپنے عمل کی خرابی کی وجہ سے پیچھے رہ گیا۔ اور عمل کی اصلاح نہ کر پایا تو اب صرف نسب کی وجہ سے کہ چونکہ یہ فلاں خاندان سے تعلق رکھتا ہے، یا فلاں بزرگ کا یا فلاں عالم کا بیٹا ہے، محض اس بنیاد پر وہ جلدی نہیں پہنچ سکے گا۔ اشارہ اس طرف فرمادیا کہ محض اس پر بھروسہ اور تکیہ کر کے مت بیٹھ جاؤ کہ میں فلاں کا صاحب زادہ ہوں، فلاں خاندان سے تعلق رکھتا ہوں، بلکہ اپنا عمل صحیح کرنے کی فکر کرو۔ اگر یہ چیز کارآمد ہوتی تو حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا جہنم میں نہ جاتا۔ جبکہ حضرت نوح علیہ السلام اتنے بڑے جلیل القدر پیغمبر ہیں۔ اور اپنے بیٹے کی مغفرت کے لئے دعا بھی فرما رہے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمادیا:

﴿ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ﴾(۱)

اس نے جو عمل کیا ہے وہ صالح عمل نہیں ہے، اس لئے اس کے حق میں آپ کی دعا قبول نہیں کی جائے گی۔ تو اصل چیز عمل ہے۔ البتہ عمل کے ساتھ اگر کسی بزرگ سے تعلق بھی ہوتا ہے تو ان بزرگ کے تعلق کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کچھ سہارا فرما دیتے ہیں۔ لیکن اپنی طرف سے عمل اور توجہ اور فکر شرط ہے۔ اب اگر کسی کو توجہ فکر اور طلب ہی نہیں ہے، بلکہ غفلت کے اندر مبتلا ہے تو محض اُونچے خاندان سے تعلق کی وجہ سے آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنا عمل درست کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

خلاصہ

آج کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کا تقاضا بھی یہ ہے، اور اللہ تعالیٰ سے محبت کی لازمی شرط یہ ہے کہ اللہ کی مخلوق سے محبت کرو۔ اور اللہ کی مخلوق پر شفقت اور رحم کرو، جب تک یہ چیز حاصل نہیں ہوگی اس وقت تک اللہ تعالیٰ سے محبت کا دعویٰ جھوٹا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں اپنی محبت اور اپنی مخلوق کی محبت پیدا فرما دے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

(۱) هود: ٤٦
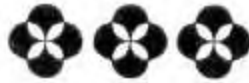
دوسروں کو خوش کیجئے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أما بعد!

"عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰه عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((أَحَبُّ الْاَعْمَالِ إِلَى اللّٰهِ سُرُوْرٌ يَدْخُلُهُ عَلٰى مُسْلِمٍ)) (۱)

"حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو اعمال اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں، ان اعمال میں سے ایک عمل کسی مؤمن کے دل میں خوشی داخل کرنا اور اس کو خوشی سے ہم کنار کرنا ہے"

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں اور اپنے قول و فعل کے ذریعہ یہ بات واضح فرمائی ہے کہ کسی بھی صاحبِ ایمان کو خوش کرنا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔

اللہ کے بندوں کو خوش رکھو

حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے تو اللہ جل جلالہ جواب میں زبانِ حال سے گویا یوں فرماتے ہیں کہ اگر مجھ سے محبت کرتے ہو تو میں تو تمہارے ساتھ دنیا میں ملنے والا نہیں ہوں کہ تم کسی وقت مجھ سے ملاقات کر کے اپنی محبت کا اظہار کرو۔ لیکن اگر تم کو میرے ساتھ محبت ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ میرے بندوں کے ساتھ محبت کرو، میری مخلوق سے محبت کرو۔ اور میری مخلوق سے محبت کرنے کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو حتی الامکان خوش کرنے کی اور خوش رکھنے کی کوشش کرو۔

دل بدست آور کہ حج اکبر است

اس بارے میں ہمارے معاشرے میں افراط و تفریط پائی جاتی ہے، اعتدال نہیں ہے۔ کچھ

☆ اصلاحی خطبات (۹/ ۲۸۰ تا ۲۸۸) ۳۰ مارچ ۱۹۹۷ء، بروز اتوار، بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) المعجم الكبير، رقم: ۱۳۶۴۶

لوگ تو وہ ہیں جو کسی دوسرے مسلمان کو خوش کرنے کی کوئی اہمیت ہی نہیں سمجھتے اور ان کو یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ کتنی بڑی عبادت ہے۔ کسی بھی مسلمان کو خوش کر دیا یا کسی انسان کو خوش کر دیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس پر کتنا اجر وثواب عطا فرماتے ہیں، اس کا ہمیں احساس ہی نہیں۔ بزرگوں نے فرمایا کہ ؎

دل بدست آور کہ حج اکبر است

یعنی کسی مسلمان کے دل کو خوش کر دینا یہ حجِ اکبر ہے۔ بزرگوں نے ویسے ہی اس کو حجِ اکبر نہیں کہہ دیا بلکہ کسی مسلمان کے دل کو خوش کر دینا واقعی اللہ تعالیٰ کے محبوب اعمال میں سے ہے۔

دوسروں کو خوش کرنے کا اجر

ذرا اس بات کو سوچیں کہ اگر اس حدیث کی تعلیم پر ہم سب عمل کرنے لگیں اور ہر انسان اس بات کی فکر کرے کہ میں کسی دوسرے کو خوش کروں تو یہ دنیا جنت کا نمونہ بن جائے، کوئی جھگڑا باقی نہ رہے، پھر کوئی حسد باقی نہ رہے اور کسی بھی شخص کو دوسرے سے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ لہٰذا اہتمام کر کے دوسرے کو خوش کرو، تھوڑی سی تکلیف اُٹھا کر اور قربانی دے کر دوسروں کو خوش کرو۔

اگر تم تھوڑی سی تکلیف اُٹھا لو گے اور اس کے نتیجے میں دوسرے کو راحت اور خوشی مل جائے گی تو دنیا میں چند لمحوں اور چند منٹوں کی جو تکلیف اُٹھائی ہے اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ آخرت میں جو ثواب تمہیں عطا فرمائیں گے وہ دنیا کی اس معمولی سی تکلیف کے مقابلے میں کہیں زیادہ عظیم ہے۔

خندہ پیشانی سے ملاقات کرنا ''صدقہ'' ہے

ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے صدقہ کی بہت سی قسمیں بیان فرمائی ہیں کہ یہ عمل بھی صدقہ ہے، فلاں عمل بھی صدقہ ہے، فلاں عمل بھی صدقہ ہے، اور صدقہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس عمل پر ایسا ہی ثواب ہے جیسے صدقہ کرنے کا ثواب ہے، پھر اسی حدیث کے آخر میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

((وَاَنْ تَلْقَى اَخَاكَ بِوَجْهٍ طَلْقٍ)) (۱)

یعنی ایک صدقہ یہ ہے کہ اپنے بھائی کے ساتھ شگفتہ اور مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ ملو۔ جب تم کسی سے ملاقات کرو تو اس کو یہ احساس ہو کہ تمہاری ملاقات سے اس کو خوشی ہوئی ہے اور اس

(۱) صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب استحباب طلاقة الوجه عند اللقاء، رقم: ۴۷۶۰، سنن الترمذي، كتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ما جاء في طلاقة الوجه وحسن البشر، رقم: ۱۸۹۳، مسند أحمد، رقم: ۱۴۱۸۲

ملاقات سے اس کے دل میں ٹھنڈک محسوس ہو۔اس کو صدقہ کرنے میں شمار فرمایا ہے۔

لہٰذا جو لوگ دوسروں سے ملاقات کے وقت اور برتاؤ کے وقت لیے دیے رہتے ہیں اور وقار کے پردے میں اپنے آپ کو ریزرو رکھتے ہیں، وہ لوگ سنت طریقہ پر عمل نہیں کرتے۔ سنت طریقہ یہ ہے کہ جب اپنے مسلمان بھائی سے ملے تو خوش خلقی کے ساتھ اور شگفتگی کے ساتھ ملے اور اس کو خوش کرنے کی کوشش کرے۔

گناہ کے ذریعے دوسروں کو خوش نہ کریں

دوسری طرف بعض لوگوں میں یہ بے اعتدالی پائی جاتی ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ چونکہ دوسرے مسلمان کو خوش کرنا بڑی عبادت ہے، لہٰذا ہم تو یہ عبادت کرتے ہیں کہ دوسروں کو خوش کرتے ہیں، چاہے وہ خوش کرنا کسی گناہ کے ذریعہ ہو یا کسی ناجائز کام کے ذریعہ ہو، جب اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا کہ دوسروں کو خوش کرو تو ہم یہ عبادت انجام دے رہے ہیں۔ حالانکہ یہ گمراہی کی بات ہے، اس لئے کہ دوسروں کو خوش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مباح اور جائز طریقے سے خوش کرو، اگر ناجائز طریقے سے دوسروں کو خوش کرو گے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ گناہ کر کے اللہ تعالیٰ کو تو ناراض کر دیا اور بندے کو خوش کر دیا، یہ کوئی عبادت نہیں۔ لہٰذا اگر دوسرے کی مروّت میں آ کر یا اس کے تعلقات سے مرعوب ہو کر گناہ کا ارتکاب کر لیا تو یہ کوئی دین نہیں، یہ کوئی عبادت نہیں۔

فیضی شاعر کا واقعہ

اکبر بادشاہ کے زمانے میں ''فیضی'' بہت بڑے ادیب اور شاعر گزرے ہیں، ایک مرتبہ وہ حجام سے داڑھی منڈوا رہے تھے، ایک صاحب ان کے پاس سے گزرے، انہوں نے جب دیکھا کہ فیضی صاحب داڑھی منڈوا رہے ہیں تو ان سے کہا:

آغا! ریش می تراشی؟

''جناب! آپ یہ داڑھی منڈوا رہے ہیں؟''

جواب میں فیضی نے کہا:

بلے! ریش می تراشم، ولے دلے کسے نمی خراشم''

''جی ہاں! داڑھی تو منڈوا رہا ہوں لیکن کسی کا دل نہیں دکھا رہا ہوں''

مطلب یہ تھا کہ میرا عمل میرے ساتھ ہے اور میں کسی کی دل آزاری نہیں کر رہا ہوں، اور تم نے جو میرے اس عمل پر مجھے ٹوکا تو اس کے ذریعہ تم نے میرا دل دکھایا۔

اس پر ان صاحب نے جواب میں کہا:

''دلے کسے نمی خراشی، ولے دلے رسول اللہ می خراشی (ﷺ)''

جو یہ کہہ رہے ہو کہ میں کسی کا دل نہیں دکھا رہا ہوں، ارے اس عمل کے ذریعہ تم رسول اللہ ﷺ کا دل دکھا رہے ہو۔

دوسروں کو خوش کرنے کی حدود

لہٰذا بعض لوگوں کے ذہن میں بھی اور زبان پر بھی یہ بات رہتی ہے کہ ہم تو دوسرے لوگوں کا دل خوش کرتے ہیں، اور اب دوسروں کا دل خوش کرنے کے لئے کسی گناہ کا ارتکاب بھی کرنا پڑا تو کر گزریں گے۔

بھائی! اللہ تعالیٰ کو ناراض کر کے، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے، اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو پامال کر کے کسی انسان کا دل خوش کیا تو کیا خوش کیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کو تو ناراض کر دیا، یہ تو کوئی عبادت نہیں ہے۔ اس حدیث کا منشا یہ ہے جو جائز امور ہیں، ان میں مسلمانوں کو خوش کرنے کی فکر کرو۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا:

''یہ معمول صوفیاء کا مثل طبعی کے ہے''

یعنی صوفیاء کرام جو اللہ کے دوست اور اللہ کے ولی ہوتے ہیں، ہر مسلمان کو خوش کرنے کی فکر ان کی طبیعت بن جاتی ہے، ان کے پاس آکر آدمی ہمیشہ خوش ہو کر جاتا ہے، ملول ہو کر نہیں۔ اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل سے ان کو اس سنت پر عمل کی توفیق ہوتی ہے کہ وہ اللہ کے بندوں کو خوش کرتے ہیں۔ پھر آگے فرمایا:

خود گناہ میں مبتلا نہ ہوں

''اس کی ایک شرط ہے، وہ یہ کہ اس سرور کو داخل کرنے سے خود شرور میں داخل نہ ہو جائے''

یعنی دوسروں کا تو دل خوش کر رہا ہے اور اس کو سرور دینے کی فکر میں ہے لیکن اس کے نتیجے میں خود شرور میں یعنی معاصی اور گناہ میں داخل ہو گیا، یہ نہ کرے۔ آگے فرمایا:

''جیسا ان لوگوں کا طریقہ ہے جنہوں نے اپنے مسلک کا لقب ''صلح کل'' رکھا ہوا ہے''

یعنی بعض لوگوں نے اپنا مسلک ''صلح کل'' بنایا ہے، ان کا کہنا یہ ہے کہ ہم تو ''صلح کل'' ہیں،

لہٰذا کوئی کچھ بھی کرے، ہم کسی کو بھی کسی غلطی پر نہیں ٹوکیں گے، کسی بُرائی کو برائی نہیں کہیں گے، کسی بُرائی کی تردید نہیں کریں گے، ہم تو "صلح کُل" ہیں۔ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے، چنانچہ آگے حضرت والا فرماتے ہیں:

اچھے کام کا حکم دینا نہ چھوڑے

"بعض لوگ تو اسی وجہ سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کرتے"

مثلاً اگر فلاں کو نماز پڑھنے کے لئے کہیں گے تو اس کا دل بُرا ہوگا، اگر فلاں کو کسی گناہ پر ٹوکیں گے تو اس کا دل برا ہوگا، اور ہم سے کسی کا جی برا نہ ہو۔ پھر فرمایا:

"کیا ان کو قرآن پاک کا یہ حکم نظر نہیں آیا کہ ﴿وَلَا تَأْخُذْكُم بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ﴾ (۱) کہ تم کو اللہ کے دین کے بارے میں ان پر ترس نہ آئے"

یعنی ایک شخص دین کی خلاف ورزی کر رہا ہے، گناہ کا ارتکاب کر رہا ہے، اس کے بارے میں تمہارے دل میں یہ شفقت پیدا نہ ہو کہ اگر میں اس کو گناہ کرنے پر ٹوکوں گا تو اس کا دل دکھے گا۔

برائی سے نرم انداز میں روکے

البتہ یہ ضروری ہے کہ اس کو کہنے کے لئے طریقہ ایسا اختیار کرے جس سے اس کا دل کم سے کم دُکھے، دل آزار اسلوب اختیار نہ کرے بلکہ نرمی کا انداز ہو، اس میں ہمدردی ہو، محبت ہو، شفقت ہو، خیر خواہی ہو، اخلاص ہو، غصہ نکالنا مقصود نہ ہو۔ لیکن یہ سوچنا کہ اگر میں اس کو ٹوکوں گا تو اس کا دل دکھے گا، چاہے کتنے بھی نرم انداز میں کہوں تو یہ سوچ درست نہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا تمام مخلوق کو راضی کرنے سے مقدم ہے۔ لہٰذا دونوں انتہائیں غلط ہیں، افراط بھی اور تفریط بھی۔ بس اپنی طرف سے ہر مسلمان کو خوش کرنے کی کوشش کرو، لیکن جہاں اللہ کی حدود آجائیں، حرام اور ناجائز امور آجائیں تو پھر کسی کا دل دکھے یا خوش ہو اس وقت بس اللہ ہی کا حکم ماننا ہے، اس وقت اطاعت صرف اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ ہی کی کرنی ہے، کسی اور کی پروا نہیں کرنی ہے۔ البتہ حتی الامکان نرمی کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

❀❀❀

---

(۱) النور: ۲

دوسروں کے مزاج کی رعایت ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

اما بعد!

"عَنْ اَبِی ذَرٍّ الْغِفَارِیِّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم: ((خَالِقُوا النَّاسَ بِاَخْلَاقِهِمْ)) ...... اَوْ كَمَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم." (۱)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "لوگوں کے ساتھ ان کے مزاج و مذاق اور اخلاق کے مطابق برتاؤ کرو"

یہ بھی دین کا ایک حصہ ہے کہ انسان کو جن لوگوں سے واسطہ پڑے، ان کے مزاج اور مذاق کی رعایت کرے اور وہ کوئی ایسا کام نہ کرے جو ان کے مزاج و مذاق کے خلاف ہو اور جس سے ان کو تکلیف پہنچے، چاہے وہ کام فی نفسہٖ جائز ہو، حرام اور ناجائز کام نہ ہو، لیکن یہ خیال کرکے کہ اس کام کے کرنے سے ان کے مزاج پر بار ہوگا تو وہ کام نہ کیا جائے تاکہ اس سے ان کی طبیعت پر کوئی گرانی پیدا نہ ہو۔

"دوسرے کے مزاج و مذاق کی رعایت" دینی معاشرت کے ابواب میں ایک بڑا عظیم باب ہے۔ اللہ تعالیٰ حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے درجات بلند فرمائے۔ انہوں نے اس باب کو واضح کیا ہے، اس لئے کہ یہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا بڑا عظیم پہلو ہے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے مزاج کی رعایت

حدیث شریف میں واقعہ آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں تشریف فرما تھے اور آپ اس حالت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ نے ایک تہبند پہنا ہوا تھا اور وہ تہبند کافی اُوپر تک چڑھا ہوا تھا، اور بعض روایات میں آتا ہے کہ گھٹنے تک چڑھا ہوا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہو جب

☆ اصلاحی خطبات (۹/۲۹۱ تا ۳۰۷)، ۳۰ مارچ ۱۹۹۷ء، بروز اتوار، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) اتحاف السادة المتقين (٦/ ٣٥٤)

گھٹنے کا حصہ ستر میں داخل قرار نہیں دیا گیا تھا۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ گھٹنے ڈھکے ہوئے تھے۔ اتنے میں کسی نے دروازے پر دستک دی۔ معلوم ہوا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تشریف لائے ہیں۔ آپ نے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ وہ اندر آ کر آپ کے پاس بیٹھ گئے اور آپ جس انداز میں بیٹھے ہوئے تھے اسی انداز میں بیٹھے رہے اور آپ کے پاؤں مبارک کھلے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر دروازے پر دستک دی۔ پتہ چلا کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ تشریف لائے ہیں۔ آپ نے ان کو بھی اندر آنے کی اجازت دے دی۔ وہ بھی آ کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ گئے۔ آپ اسی حالت میں بیٹھے رہے اور اپنی ہیئت میں آپ نے کوئی تبدیلی نہیں فرمائی۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ آپ نے پوچھا کہ کون ہیں؟ پتہ چلا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تشریف لائے ہیں۔ آپ نے فوراً اپنا تہبند نیچے کر کے اپنے پاؤں مبارک اچھی طرح ڈھک لیے۔ پھر فرمایا کہ ان کو اندر بلالو۔ چنانچہ وہ بھی اندر آ کر بیٹھ گئے۔

ایک صاحب یہ سب منظر دیکھ رہے تھے، انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو آپ نے اپنا تہبند نیچے نہیں کیا بلکہ ویسے ہی بیٹھے رہے، جب حضرت فاروق اعظم تشریف لائے تب بھی آپ اسی طرح بیٹھے رہے، لیکن جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو آپ نے اپنی ہیئت میں تبدیلی پیدا فرمائی، اس کی کیا وجہ ہے؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا: میں اس شخص سے کیوں حیا نہ کروں جس سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں۔ (۱)

حیاء حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا وصفِ خاص

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا خاص وصف ''حیاء'' تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ''حیاء'' میں ان کو بہت اونچا مقام عطا فرمایا تھا، اور آپ کا لقب ''کامل الحیاء والایمان'' تھا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام صحابہ کے مزاجوں سے واقف تھے اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بارے میں جانتے تھے کہ ان کے اندر حیاء بہت ہے۔ اگرچہ گھٹنے تک پاؤں کھلا ہونا کوئی ناجائز بات نہیں تھی اس لئے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے آنے پر بھی کھلا رکھا اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے آنے پر بھی کھلا رکھا لیکن حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے آنے پر یہ سوچا کہ چونکہ ان کی طبیعت میں حیاء زیادہ ہے، اگر ان کے سامنے اسی طرح بیٹھا رہوں گا تو ان کی طبیعت پر ناگوار ہوگا اور ان کی طبیعت پر بار ہوگا۔ اس وجہ سے ان کے اندر آنے سے پہلے پاؤں کو

(۱) صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل عثمان بن عفان، رقم: ٤٤١٤، مسند أحمد، مسند العشرة المبشرة بالجنة، رقم: ٤٨٤۔

ڈھک لیا اور تہبند کو نیچے کر لیا۔

وہ حضرات صحابہ جو حضورِ اقدس ﷺ کے ایک اشارے پر اپنی جانیں قربان کرنے کے لئے تیار تھے، ان کے مزاجوں کی آپ نے اتنی رعایت فرمائی۔ فرض کریں کہ اگر حضورِ اقدس ﷺ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے آنے پر اسی طرح بیٹھے رہتے جس طرح بیٹھے ہوئے تھے تو ان کو حضورِ اقدس ﷺ سے کیا شکوہ ہوسکتا تھا، لیکن آپ نے اس بات کی تعلیم دے دی کہ تمہارے تعلق والوں میں جو شخص جیسا مزاج رکھتا ہو اس کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرو۔ دیکھئے حضورِ اقدس ﷺ کتنی باریک بینی سے اپنے رفقاء کے مزاجوں کا خیال فرمایا کرتے تھے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مزاج کی رعایت

ایک مرتبہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اے عمر! میں نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے۔ میں نے خواب میں جنت دیکھی اور اس جنت میں ایک بڑا عالیشان محل بنا ہوا دیکھا۔ میں نے پوچھا کہ یہ محل کس کا ہے؟ مجھے بتایا گیا کہ یہ عمر کا محل ہے، ان کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ وہ محل مجھے اتنا اچھا لگا کہ میرا دل چاہا کہ اندر چلا جاؤں اور اندر جا کر دیکھوں کہ عمر کا محل کیسا ہے، لیکن پھر اے عمر! تمہاری غیرت یاد آگئی کہ تمہاری طبیعت میں اللہ تعالیٰ نے غیرت بہت رکھی ہے، مجھے یہ خیال ہوا کہ عمر سے پہلے ان کے محل میں داخل ہو جانا اور اس کو دیکھنا ان کی غیرت کے مطابق نہیں ہوگا، اس وجہ سے میں اس محل میں داخل نہیں ہوا۔ جب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ سنا تو رو پڑے اور عرض کیا:

"اَوَ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَغَارُ"

''یارسول اللہ! کیا میں آپ پر غیرت کروں گا''

اگر غیرت ہے بھی تو وہ دوسروں کے حق میں ہے، کیا آپ پر غیرت کروں گا کہ حضورِ اقدس ﷺ مجھ سے پہلے محل میں کیوں داخل ہوئے۔ (۱)

آپ اس سے اندازہ لگائیں کہ حضورِ اقدس ﷺ نے کیسے کیسے لطیف پیرائے میں اپنے اصحاب کے مزاجوں کی رعایت کی۔ یہ نہیں تھا کہ چونکہ ہم امام ہیں اور یہ ہمارے مقتدی ہیں، ہم پیر ہیں اور یہ ہمارے مرید ہیں، ہم استاد ہیں اور یہ ہمارے شاگرد ہیں، لہٰذا سارے حقوق ہمارے ہو گئے

(۱) صحيح البخاری، كتاب المناقب، باب مناقب عمر بن الخطاب أبی حفص القرشی العدوی، رقم: ۳۴۰۳، صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل عمر، رقم: ۴۴۰۸، سنن ابن ماجه، المقدمة، باب فضل عمر، رقم: ۱۰۴، مسند أحمد، رقم: ۸۱۱۵۔

اور ان کا کوئی حق نہ رہا۔ بلکہ حضورِ اقدس ﷺ نے ایک ایک صحابی کے مزاج کی رعایت کر کے دکھائی۔

اُمہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کے مزاج کی رعایت

ایک مرتبہ جب حضورِ اقدس ﷺ نے اعتکاف کا ارادہ فرمایا تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرا دل بھی چاہتا ہے کہ آپ کے ساتھ اعتکاف میں بیٹھوں۔ ویسے تو خواتین کے لئے مسجد میں اعتکاف کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے، خواتین کو اعتکاف کرنا ہو تو اپنے گھر میں کریں، لیکن حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا معاملہ اس لحاظ سے مختلف تھا کہ ان کے گھر کا دروازہ مسجد میں کھلتا تھا، اب اگر ان کے گھر کے دروازے کے ساتھ ہی ان کی اعتکاف کی جگہ بنادی جاتی، اور اس کے ساتھ ہی حضورِ اقدس ﷺ کے اعتکاف کی جگہ ہوتی تو کسی بے پردگی کا احتمال نہ ہوتا، جب ضرورت ہوتی تو گھر میں چلی جاتیں اور پھر واپس آکر اپنے اعتکاف میں بیٹھ جاتیں، اس لئے اگر وہ مسجد میں اعتکاف فرماتیں تو کوئی خرابی لازم نہ آتی۔ اسی وجہ سے جب حضورِ اقدس ﷺ سے اجازت طلب کی کہ میں آپ کے ساتھ اعتکاف کرنا چاہتی ہوں تو آپ نے اجازت دے دی۔

لیکن جب ۲۰/ رمضان المبارک کی تاریخ آئی تو اس دن آپ کہیں باہر تشریف لے گئے تھے، جب واپس تشریف لائے اور مسجد نبوی میں پہنچے تو آپ نے دیکھا کہ مسجد نبوی میں بہت سارے خیمے لگے ہوئے ہیں۔ آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ خیمے کس کے ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ اُمہات المؤمنین کے خیمے ہیں۔ جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو اعتکاف کرنے کی اجازت مل گئی تو دوسری ازواج مطہرات نے چاہا کہ ہم بھی یہ سعادت حاصل کرلیں، لہٰذا انہوں نے اب اعتکاف کے لئے اپنے اپنے خیمے لگادیئے۔ اس وقت حضورِ اقدس ﷺ کو یہ احساس ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا معاملہ تو مختلف تھا اس لئے کہ ان کا گھر تو مسجد نبوی سے بالکل متصل تھا اور دوسری ازواج مطہرات کے مکان تو مسجد نبوی سے دور ہیں، اگر انہوں نے بھی اعتکاف کیا تو ان کا بار بار آنا جانا رہے گا، اس میں بے پردگی کا احتمال ہے اور اس طرح خواتین کا مسجد کے اندر اعتکاف کرنا مناسب بھی نہیں ہے۔ اس لئے آپ نے ان کے خیمے دیکھ کر ارشاد فرمایا:

((”البر یردن؟“))

”کیا یہ خواتین کوئی نیکی کرنا چاہتی ہیں؟“

مطلب یہ تھا کہ اس طرح خواتین کا مسجد میں اعتکاف کرنا کوئی نیکی کی بات نہیں۔

اس سال، ہم بھی اعتکاف نہیں کریں گے

لیکن اب مشکل یہ تھی کہ حضرت عائشہ ؓ کو آپ اعتکاف کی اجازت دے چکے تھے، اگرچہ ان کو اجازت دینے کی وجہ واضح تھی اور دوسری اُمہات المؤمنین میں وہ وجہ موجود نہیں تھی، لیکن آپ نے سوچا کہ اگر میں حضرت عائشہ ؓ کا خیمہ باقی رکھوں گا اور دوسری اُمہات المؤمنین کو منع کردوں گا تو ان کے مزاج پر بار ہوگا کہ حضرت عائشہ ؓ کو تو اجازت دے دی اور ہمیں اجازت نہ ملی، لہٰذا جب آپ نے دوسری اُمہات المؤمنین کے خیمے اُٹھوائے تو حضرت عائشہ ؓ سے فرمایا کہ تم بھی اپنا خیمہ اُٹھالو۔ لیکن پھر خیال آیا کہ حضرت عائشہ ؓ کو چونکہ پہلے صراحۃً اجازت دیدی گئی تھی، اب اگر اچانک ان سے خیمہ اُٹھانے کو کہا جائے گا تو ان کی طبیعت پر بار ہوگا، اس لئے ان کا خیال کرتے ہوئے آپ نے یہ اعلان فرمادیا کہ اس سال ہم بھی اعتکاف نہیں کریں گے۔ چنانچہ اس سال آپ نے اعتکاف ہی نہیں فرمایا۔ (۱)

اعتکاف کی تلافی

بہرحال، اُمہات المؤمنین کے مزاجوں کی رعایت کے نتیجے میں حضرت عائشہ ؓ کا خیمہ اُٹھوادیا اور پھر حضرت عائشہ ؓ کے مزاج کی رعایت کرتے ہوئے اپنے ساتھ یہ معاملہ فرمایا کہ وہ معمول جو ساری عمر کا چلا آرہا تھا کہ ہر رمضان المبارک میں آپ اعتکاف کیا کرتے تھے، محض حضرت عائشہ ؓ کی دل شکنی کے اندیشہ میں اس معمول کو توڑ دیا۔ پوری حیاتِ طیبہ میں یہ سال ایسا تھا جس میں آپ نے اعتکاف نہیں فرمایا لیکن بعد میں اس کی تلافی اس طرح فرمائی کہ اس سے اگلے سال دس دن کے بجائے بیس دن کا اعتکاف فرمایا۔

یہ بھی سنت ہے

اس سے آپ اندازہ لگائیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے کیسی کیسی رعایتیں اپنے چھوٹوں کے ساتھ بھی فرمائیں اور ایک شرعی حکم کی وضاحت کے معاملے میں بھی ایسا طریقہ اختیار فرمایا جس سے

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الاعتکاف، باب متی یدخل من أراد الاعتکاف فی معتکفه، رقم: ۲۰۰۷، سنن النسائی، کتاب المساجد، باب ضرب الخباء فی المساجد، رقم: ۷۰۲، سنن أبی داؤد، کتاب الصوم، باب الاعتکاف، رقم: ۲۱۰۸، سنن ابن ماجه، کتاب الصیام، باب ما جاء فیمن یبتدئ الاعتکاف وقضاء الاعتکاف، رقم: ۱۷۶۱۔

دوسرے کی طبیعت پر بار نہ ہو۔ حکم کی وضاحت بھی فرمادی، اس پر عمل بھی کرلیا اور دوسروں کی دل شکنی سے بھی بچ گئے۔ اور ساتھ میں آپ نے اپنے عمل سے یہ تعلیم بھی دے دی کہ جو عمل فرض یا واجب نہیں ہے بلکہ مستحب ہے، اگر آدمی کسی کی دل شکنی سے بچنے کے لئے اس مستحب کام کو مؤخر کردے یا چھوڑ دے تو یہ عمل بھی نبی کریم ﷺ کی سنت کا حصہ ہے۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا معمول

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہر رمضان میں یہ معمول تھا کہ جب عصر کی نماز کے لئے مسجد میں تشریف لے جاتے تو مغرب تک اعتکاف کی نیت سے مسجد ہی میں قیام فرمایا کرتے تھے۔ وہاں تلاوت، ذکر و اذکار، تسبیحات اور مناجات میں مشغول رہتے تھے اور جو باقی وقت ملتا تو آخر میں لمبی دعا فرمایا کرتے تھے اور وہ دعا افطار کے وقت تک جاری رہتی تھی۔

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ اپنے متوسلین کو بھی یہ مشورہ دیا کرتے تھے کہ وہ بھی اپنا یہ معمول بنالیں، کیونکہ اس کے اندر آدمی کا وقت مسجد میں گذر جاتا ہے، اعتکاف کی فضیلت بھی حاصل ہو جاتی ہے اور معمولات بھی پورے ہو جاتے ہیں اور آخر میں دعا کی توفیق بھی ہو جاتی ہے۔ اور یہ دعا تو رمضان المبارک کا حاصل ہے اس لئے کہ اس وقت دن ختم ہو رہا ہوتا ہے اور افطار کا وقت قریب ہوتا ہے اور اس وقت آدمی کی طبیعت میں شکستگی ہوتی ہے اور اس شکستگی کی حالت میں جو دعائیں کی جاتی ہیں وہ بڑی ہی قبول ہوتی ہیں۔ حضرت والا اکثر اپنے متوسلین کو مشورہ دیا کرتے تھے بلکہ تاکید فرمایا کرتے تھے کہ ایسا کرلیا کرو، چنانچہ حضرت والا کے متوسلین میں اس طریقہ پر عمل اب بھی جاری ہے۔

ایک مرتبہ حضرت والا کے متوسلین میں سے ایک صاحب نے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ حضرت! میں نے آپ کے ارشاد کے مطابق اپنا یہ معمول بنایا ہوا تھا کہ عصر سے لے کر مغرب تک کا وقت مسجد میں گزارتا اور وہاں بیٹھ کر تلاوت، ذکر و اذکار اور تسبیحات اور دعا میں مشغول رہتا، ایک دن میری بیوی نے مجھ سے کہا کہ آپ سارا دن ویسے بھی باہر رہتے ہیں، لے دے کر عصر کے بعد کا وقت ہوتا تھا، اس میں ہم بیٹھ کر کچھ باتیں کرلیا کرتے تھے اور افطار کے وقت ایک ساتھ افطار کرنے کی راحت حاصل ہوتی تھی، اب آپ نے چند روز سے یہ طریقہ اختیار کرلیا ہے کہ عصر کی نماز کے بعد آپ مسجد میں جا کر بیٹھ جاتے ہیں اور مغرب تک آپ وہیں رہتے ہیں اور عصر کے بعد اکٹھے بیٹھ کر بات چیت کرنے اور ایک ساتھ افطار کرنے کا سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔ حضرت! اب کشمکش میں مبتلا ہوگیا ہوں کہ عصر کے بعد کا وقت مسجد میں گزارنے کا یہ معمول جاری رکھوں یا بیوی کے کہنے کے مطابق اس معمول کو چھوڑ دوں اور گھر پر وقت گزاروں۔ حضرت والا نے ان کی بات سنتے ہی فرمایا کہ آپ کی بیوی

ٹھیک کہتی ہیں، لہٰذا آپ ان کے کہنے کے مطابق مسجد میں وقت گزارنے کے بجائے گھر پر ہی وقت گزارا کریں اور گھر میں ان کے پاس بیٹھ کر جو تلاوت، ذکر واذکار کر سکتے ہیں کرلیا کریں اور پھر ایک ساتھ روزہ افطار کیا کریں۔

تمہیں اس پر پورا ثواب ملے گا

پھر خود ہی ارشاد فرمایا کہ میں نے جو معمول بنایا تھا وہ زیادہ سے زیادہ مستحب عمل ہے، اور جو بات ان کی بیوی نے کہی تو اس کے حقوق میں یہ بات داخل ہے کہ شوہر جائز حدود میں رہتے ہوئے اس کی دلداری کرے، اور بعض اوقات یہ دلداری واجب ہو جاتی ہے، لہٰذا اگر اس کا دل خوش کرنے کے لئے تم اپنا یہ معمول چھوڑ دو گے تو انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ اس معمول کی برکات سے محروم نہیں فرمائیں گے، اس لئے کہ اس کا دل رکھنے کے لئے اور اس کے مزاج کی رعایت کرنے کے لئے یہ معمول چھوڑا ہے، انشاء اللہ تمہیں وہی اجر و ثواب حاصل ہوگا جو اس معمول کے پورا کرنے پر حاصل ہوتا۔

عیادت کرنا بھی دین ہے

ایک مرتبہ ہمارے حضرت والا نے فرمایا کہ ایک شخص نے اپنے معمولات پورے کرنے کے لئے ایک خاص وقت مقرر کیا ہوا تھا۔ اس وقت میں وہ تنہائی میں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ سے عرض معروض کیا کرتا تھا، ذکر و تسبیح کیا کرتا تھا۔ اب اچانک گھر میں کوئی بیمار ہوگیا، والد بیمار ہو گئے یا والدہ بیمار ہو گئیں یا بیوی بچے بیمار ہو گئے۔ اب یہ شخص ان کی تیمارداری اور خدمت میں لگا ہوا ہے جس کے نتیجے میں اس کے ذکر واذکار اور تسبیحات کا معمول پورا نہیں ہو رہا ہے اور اس کی وجہ سے اس کا دل دکھ رہا ہے کہ یہ وقت اب تک تو عبادت اور ذکر واذکار میں گزر رہا تھا اور اب یہ تیمارداری اور خدمت میں گزر رہا ہے۔

فرمایا کہ یہ دل دکھانے کی بات نہیں، کیونکہ اس وقت ان لوگوں کی تیمارداری اور خدمت کرنا یہی عبادت ہے اور ذکر واذکار سے زیادہ افضل ہے۔

وقت کا تقاضا دیکھئے

فرمایا کہ دین دراصل وقت کے تقاضے پر عمل کرنے کا نام ہے، دیکھو اس وقت تم سے کیا مطالبہ ہے؟ اس وقت تم سے مطالبہ یہ ہے کہ اس ذکر کو چھوڑو اور بیمار کی خدمت کرو، اور یہ کام کرتے وقت یہ مت خیال کرو کہ جو ذکر و تسبیح کیا کرتے تھے اس سے محرومی ہوگئی ہے، اللہ تعالیٰ محروم نہیں فرمائیں گے، کیونکہ ایک صحیح داعیے کے تحت تم نے ذکر واذکار کو چھوڑا ہے۔

رمضان کی برکات سمیٹنے کا طریقہ

اسی طرح ایک مرتبہ حضرت والا نے فرمایا کہ فرض کریں کہ ایک شخص رمضان میں بیمار ہو گیا یا سفر پر چلا گیا اور اس بیماری یا سفر کی وجہ سے رمضان کا روزہ نہ رکھ سکا، تو اس کے لئے حکم یہ ہے کہ اگر بیماری اور سفر کے عذر کی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکے تو بعد میں قضا کرلے، چنانچہ بعد میں اس نے اس روزے کی قضا کرلی، تو چونکہ عذر شرعی تھا اس لئے جب وہ شخص عام دنوں میں رمضان کے اس روزے کی قضا کرے گا، تو جس دن میں وہ قضا روزہ رکھے گا اس شخص کے حق میں اس دن رمضان ہی کا دن واپس آگیا، وہ سارے انوار و برکات جو رمضان کے دنوں میں تھے وہ سب اس دن اس کے حق میں لوٹ آئیں گے، اس لئے کہ عذر کی وجہ سے جب اللہ تعالیٰ نے اس کو رخصت عطا کی تھی تو کیا اس کو رمضان کی برکات سے محروم کردیں گے؟ نہیں، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یہ بات بعید ہے کہ اس کو رمضان کی برکات سے محروم کردیں۔

لہٰذا اگر کوئی شخص جائز عذر کی بنا پر اپنا کوئی معمول چھوڑ رہا ہے یا مؤخر کر رہا ہے تو انشاء اللہ اس کام کے اندر بھی اس کو وہ سارے انوار و برکات حاصل ہو جائیں گے۔ بس وقت کے تقاضے پر عمل کرنے کا نام دین ہے۔ یہ نہ ہو کہ آپ یہ کہہ دیں کہ یہ وقت تو ہمارے ذکر و اذکار کا ہے یا تلاوت کا ہے، کوئی اگر مر رہا ہے تو مرے یا اگر کوئی بیمار پڑا ہے تو پڑا رہے۔ یہ کوئی دین کی بات نہیں ہے بلکہ وقت کے تقاضے پر عمل کرنے کا نام دین ہے۔

بے جا اصرار نہ کریں

لہٰذا مزاجوں کی رعایت کرو اور کسی شخص کے ساتھ برتاؤ کرتے وقت یہ دیکھو کہ میرے اس عمل سے اس شخص کے مزاج کے پیشِ نظر اس کی طبیعت پر کوئی گرانی تو نہیں ہوگی، کوئی بار تو نہیں ہوگا، اس کی رعایت رکھو۔ اور یہ اصلاحِ معاشرت کی تعلیم کا بڑا عظیم باب ہے۔ آج کل لوگ اس کا خیال نہیں کرتے، مثلاً کسی کی طبیعت پر کوئی کام بہت بوجھ ہوتا ہے، اب اگر آپ اس کو اس کام پر اصرار کریں گے تو ہو سکتا ہے کہ وہ بیچارہ اصرار سے مغلوب ہو کر آپ کی بات مان لے، لیکن آپ نے اس کی طبیعت پر جو بوجھ ڈالا اور جو گرانی آپ نے پیدا کی اور اس سے جو تکلیف اس کو پہنچی اس کا سبب آپ بنے، کیا معلوم اس کے سبب آپ گناہ میں مبتلا ہو گئے ہوں۔ العیاذ باللہ

سفارش کا ایک ادب

آج کل سفارش کرانے کا سلسلہ چل پڑا ہے، کسی دوسرے سے تعلقات کا ایک لازمی حصہ یہ ہے کہ ضرور وہ میری سفارش کرے، اور سفارش کرنے کے بارے میں قرآن کریم کی یہ آیت بہت یاد رہتی ہے:

﴿مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا﴾(۱)

یعنی جو شخص اچھی سفارش کرے تو اللہ تعالیٰ اس کام میں اس کا حصہ بھی لگا دیتے ہیں۔ اور اچھی سفارش کرنے کی بڑی فضیلت ہے اور واقعۃً بڑی فضیلت ہے، لیکن لوگ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ سفارش اس وقت باعثِ فضیلت ہے جب اس بات کا لحاظ کرتے ہوئے سفارش کی جائے کہ جس سے سفارش کی جارہی ہے اس کی طبیعت پر بار نہ ہو۔ اب اگر آپ نے ایک شخص کی رعایت اور اس کی دلداری کی خاطر اس کی سفارش تو کردی لیکن جس کے پاس سفارش کی اس کی طبیعت پر ایک پہاڑ ڈال دیا، وہ تو یہ سوچے گا کہ اتنا بڑا شخص مجھ سے سفارش کررہا ہے، اب اگر میں اس سفارش کو قبول کروں تو مشکل، اس لئے کہ اس کی وجہ سے اپنے اصول اور قاعدے توڑنے پڑتے ہیں، اور اگر سفارش قبول نہ کروں تو اس کی دل شکنی ہوتی ہے۔ یہ سفارش نہ ہوئی، یہ تو دباؤ ڈالنا ہوا۔ لہٰذا دوسرے کے مزاج کی رعایت رکھتے ہوئے سفارش کرنی چاہئے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہمیشہ کا معمول یہ تھا کہ جب بھی کسی کی سفارش کرتے تو یہ عبارت ضرور لکھتے کہ ''اگر آپ کی مصلحت اور اصول کے خلاف نہ ہو تو آپ ان کا یہ کام کردیجئے''۔ بعض اوقات یہ عبارت بھی بڑھا دیتے کہ ''اگر آپ کی کسی مصلحت کے خلاف ہو اور آپ یہ کام نہ کریں تو مجھے ادنیٰ ناگواری نہیں ہوگی''

یہ عبارت اس لئے لکھ دیتے تاکہ اس کے دل پر بوجھ نہ ہو۔ یہ ہے سفارش کا طریقہ۔

ایک صاحب میرے پاس آئے اور تعلقات کی مد میں کہنے لگے کہ دیکھو بھائی! میں تم سے ایک کام کہنا چاہتا ہوں۔ میں نے پوچھا کہ کیا کام ہے؟ کہنے لگے کہ ایسے نہیں، بلکہ پہلے یہ وعدہ کرو کہ یہ کام کروگے۔ میں نے کہا کہ جب تک مجھے پتہ نہیں کہ وہ کام کیا ہے، میں کیسے وعدہ کرلوں کہ میں یہ کام کروں گا۔ وہ کہنے لگے کہ نہیں، پہلے وعدہ کرو کہ میرا وہ کام کروگے۔ میں نے کہا کہ اگر وہ کام ایسا ہوا جو میرے بس میں نہ ہو تو پھر کیا کروں گا۔ کہنے لگے کہ وہ کام آپ کے بس میں ہے۔ میں نے کہا، بتادیں کہ وہ کیا کام ہے؟ کہنے لگے کہ میں اس وقت تک نہیں بتاؤں گا جب تک آپ یہ وعدہ نہ کریں

---

(۱) النساء: ۸۵، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''جو شخص کوئی اچھی سفارش کرتا ہے، اس کو اس میں سے حصہ ملتا ہے''

کہ میں یہ کام کروں گا۔

میں نے ان کو ہزار سمجھایا کہ پہلے اس کام کی کچھ تفصیل معلوم ہو تو وعدہ کروں، ایسے کیسے وعدہ کرلوں۔ کہنے لگے کہ اگر آپ انکار کررہے ہیں تو یہ تعلقات کے خلاف بات ہوگی۔

اب آپ بتائیے کہ کیا یہ طریقہ صحیح ہے؟ یہ تو ایک شخص کو دباؤ میں ڈالنا ہے کہ جب تک اس کام کو کرنے کا وعدہ نہیں کرو گے اس وقت تک بتائیں گے بھی نہیں۔ چنانچہ آج کے تعلقات کا یہ لازمی حصہ ہے کہ آدمی دوسرے کی سفارش کرے۔ حالانکہ یہ بات اسلامی آدابِ معاشرت کے قطعی خلاف ہے۔ اس لئے کہ آپ نے ایک آدمی کو ذہنی کشمکش میں مبتلا کردیا اور بلاوجہ ایک آدمی کو کشمکش اور ذہنی پریشانی میں ڈالنا گناہ ہے۔

تعلق رسمیات کا نام ہوگیا ہے

آج کل تعلق اور محبت صرف ''رسمیات'' کا نام ہوگیا ہے، اب اگر وہ ''رسمیات'' پوری ہورہی ہیں تو تعلقات کا حق ادا ہورہا ہے، اور اگر ''رسمیات'' پوری نہیں ہورہی ہیں تو تعلقات کا حق ہی ادا نہ ہوا۔ مثلاً اگر کسی کو دعوت دی تو بس اب اس کے سر پر بیٹھے ہوئے ہیں کہ ضرور اس دعوت کو قبول کریں۔ اس کا احساس نہیں کہ اس دعوت کی وجہ سے وہ کتنی دور سے آئے گا، کتنی تکلیف اُٹھا کر اس دعوت میں شرکت کرے گا، اس کے حالات دعوت قبول کرنے کی اجازت دیتے ہیں یا نہیں، اس سے اس دعوت دینے والے کو کوئی بحث نہیں، اس کو تو دعوت ضرور دینی ہے اور اس کو بلانا ہے۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت

ہمارے ایک بزرگ گزرے ہیں حضرت مولانا ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، یہ بزرگ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بچپن کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ ایک مرتبہ لاہور سے کراچی تشریف لائے اور والد صاحب سے ملاقات کے لئے دارالعلوم تشریف لائے اور ایسے وقت تشریف لائے کہ وہ کھانے کا وقت نہیں تھا۔ ان کے آنے پر حضرت والد صاحب بہت خوش ہوئے اور بڑے شاندار طریقے سے ان کا استقبال کیا۔ جب وہ رخصت ہونے لگے تو حضرت والد صاحب نے عرض کیا کہ ''بھائی مولانا ادریس صاحب! میرا دل چاہ رہا تھا کہ ایک وقت کا کھانا آپ ہمارے ساتھ کھالیتے، لیکن مصیبت یہ ہے کہ آپ کا قیام بہت دور ہے اور آپ کے پاس وقت کم ہے، ایک دن کے بعد آپ واپس لاہور جارہے ہیں، اب اگر میں آپ پر یہ اصرار کروں کہ آپ ایک وقت کا کھانا میرے ساتھ کھائیں تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ دعوت نہ

ہوگی بلکہ عداوت ہو جائے گی، اس لئے کہ آپ کے پاس وقت کم ہے، آپ اتنی دور سے دعوت کھانے کے لئے آئیں گے تو اس میں چار پانچ گھنٹے آپ کے صرف ہو جائیں گے، اس میں آپ کو مشقت اور تکلیف ہوگی، اس لئے میں آپ کی دعوت تو نہیں کرتا اگر چہ میرا دل دعوت کرنے کو چاہ رہا ہے، لیکن دعوت کے بغیر بھی دل نہیں مانتا، اس لئے میں آپ کی خدمت میں تھوڑا سا ہدیہ پیش کرتا ہوں اور جتنے پیسے میں دعوت میں خرچ کرتا اتنے پیسے آپ میری طرف سے ہدیہ میں قبول کر لیجئے۔ حضرت مولانا ادریس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے وہ پیسے ان سے لیے اور اپنے سر پر رکھ لیے اور فرمایا کہ یہ میرے لئے بڑی عظیم نعمت ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ میرا دل بھی یہ چاہ رہا تھا کہ آپ کے پاس حاضر ہو کر آپ کے ساتھ کھانا کھاؤں لیکن وقت میرے پاس اتنا کم ہے کہ اس کے اندر گنجائش نظر نہیں آ رہی تھی اور آپ نے پہلے ہی میرے لئے یہ راستہ آسان کر دیا۔

اب بتایئے! اگر والد صاحب ان سے یہ کہتے کہ نہیں، ایک وقت کا کھانا آپ کو میرے ساتھ ضرور کھانا پڑے گا اور وہ جواب میں یہ کہتے کہ میرے پاس تو وقت نہیں ہے، والد صاحب کہتے کہ نہیں بھائی! دوستی کا تقاضا تو یہ ہے کہ ایک وقت کا کھانا آپ ضرور میرے ساتھ آ کر کھائیں۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ جس کام کے لئے وہ اتنا لمبا سفر کر کے آئے ہیں وہ کام چھوڑتے اور دعوت کھانے کے لئے پانچ گھنٹے قربان کرتے۔ یہ دعوت نہ ہوتی بلکہ عداوت ہوتی۔

محبت نام ہے محبوب کو راحت پہنچانے کا

آج ان رسمیات نے نہ صرف ہمارے معاشرے کو تباہ کر رکھا ہے بلکہ دین کے اخلاق و آداب سے بھی ہمیں دور کر دیا ہے۔ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوبصورت بات ارشاد فرمائی ہے، اگر اللہ تعالیٰ یہ بات ہمارے دلوں میں اتار دے تو ہمارے سارے کام سنور جائیں، فرمایا کہ ''محبت نام ہے محبوب کو راحت پہنچانے کا''، جس سے محبت ہے اس کو آرام پہنچاؤ، اپنی من مانی کرنے اور اپنی خواہشات کو پورا کرنے کا نام محبت نہیں، اگر محبت کرنے والا عاشق نادان اور بیوقوف ہو تو اس کی محبت سے محبوب کو تکلیف پہنچ جاتی ہے، لیکن ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کا مذاق یہ ہے کہ محبت سے تکلیف پہنچنے کے کوئی معنی نہیں ہیں، اگر تم کو کسی سے محبت ہے تو اس کو تکلیف مت پہنچاؤ بلکہ راحت پہنچاؤ، چاہے اپنے جذبات کو قربان کرنا پڑے لیکن راحت پہنچاؤ۔

یہ سب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تشریح ہو رہی ہے کہ خالقوا الناس باخلاقھم، لوگوں کے ساتھ ان کے مزاج کے مطابق معاملہ کرو، جس سے معاملہ کرنے جا رہے ہو پہلے یہ دیکھ لو کہ اس کا مزاج کیا ہے، اس کے مزاج پر یہ بات بار تو نہیں ہوگی، ناگوار تو نہیں ہوگی۔ اور یہ چیز بزرگوں

کی صحبت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی، ہمارا تو یہی تجربہ ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی خانقاہ میں لوگوں کی اس طرح تربیت فرمائی کہ لوگوں کے مزاج کی کس طرح رعایت رکھی جاتی ہے۔ لوگوں کے ایک ایک عمل پر نگاہ رکھی اور ان کو یہ تعلیم دی کہ کس موقع پر انسان کو کیا عمل کرنا چاہئے۔

یہ آداب المعاشرت کے سلسلے کی آخری حدیث تھی، اس حدیث میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے سارے آداب کی بنیادیں بیان فرمادی ہیں کہ اپنی ذات سے دوسروں کو ادنیٰ تکلیف نہ پہنچے، اس بات کا آدمی اہتمام اور دھیان کرے۔ ہر کام کرنے سے پہلے آدمی یہ سوچے کہ اس کام سے دوسروں کو تکلیف تو نہیں پہنچے گی، اور دوسروں کے مزاج کی رعایت کرے۔

ایک شاعر گزرے ہیں جن کا نام ہے "جگر مراد آبادی مرحوم" یہ بھی حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں پہنچ گئے تھے، ان کا ایک شعر بڑے کام کا ہے، اگر یہ شعر ہمارا لائحہ عمل بن جائے تو یہ سارے اسلامی آدابِ معاشرت کا خلاصہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ

اس نفع وضرر کی دنیا میں یہ ہم نے لیا ہے درسِ جنوں
اپنا تو زیاں منظور سہی، اوروں کا زیاں منظور نہیں

یعنی اس دنیا میں سارے کام اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق نہیں ہوتے لیکن اس دنیا کے کام اپنی طبیعت کے خلاف ہو جائیں اور اپنے اوپر مشقت اُٹھالیں اور اپنی طرف سے قربانی دیدیں، تو یہ ہمیں منظور ہے لیکن دوسروں کو ہم سے کوئی مالی، جانی، ذہنی، نفسیاتی نقصان پہنچ جائے تو یہ ہمیں منظور نہیں۔ یہ ہی سارے دین کی تعلیم ہے اور یہی آدابِ معاشرت کا خلاصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

خندہ پیشانی سے ملنا سنت ہے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أما بعد!

عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى قَالَ: لَقِيْتُ عَبْدَاللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، فَقُلْتُ اَخْبِرْنِىْ عَنْ صِفَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِى التَّوْرَاةِ قَالَ فَقَالَ "أَجَلْ وَاللّٰهِ إِنَّهُ لَمَوْصُوْفٌ فِى التَّوْرَاةِ بِبَعْضِ صِفَتِهِ فِى الْقُرْآنِ يٰاَيُّهَا النَّبِىُّ إِنَّا أَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّحِرْزًا لِّلْاُمِّيِّيْنَ أَنْتَ عَبْدِىْ وَرَسُوْلِىْ سَمَّيْتُكَ الْمُتَوَكِّلَ لَيْسَ بِفَظٍّ وَلَا غَلِيْظٍ وَّلَا سَخَّابٍ فِى الْاَسْوَاقِ وَلَا يَدْفَعُ السَّيِّئَةَ بِالسَّيِّئَةِ وَلٰكِنْ يَّعْفُوْ وَ يَصْفَحُ وَلَنْ يَّقْبِضَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى حَتّٰى يُقِيْمَ بِهِ الْمِلَّةَ الْعَوْجَاءَ بِأَنْ يَّقُوْلُوْا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ فَيَفْتَحُ بِهَا اَعْيُنًا عُمْيًا وَآذَانًا صُمًّا وَقُلُوْبًا غُلْفًا"(۱)

خندہ پیشانی سے پیش آنا انسانیت کا حق ہے

یہ ایک طویل حدیث ہے اور اس پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے "باب الانبساط الی الناس" کا عنوان قائم فرمایا ہے۔ یعنی لوگوں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آنا اور لوگوں میں گھلے ملے رہنا۔

یہ کتاب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے "الأدب المفرد" کے نام سے لکھی ہے، اور اس میں حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ احادیث جمع کی ہیں جو زندگی کے مختلف شعبوں میں اسلامی آداب سے متعلق ہیں، اور ان آداب کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و فعل سے تلقین فرمائی ہے۔ ان میں سے ایک ادب اور ایک سنت یہ ہے کہ مخلوق کے ساتھ گھلے ملے رہو اور ان کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آؤ۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۲/ ۱۳۰ تا ۱۵۶)، بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد بیت المکرّم، کراچی، زیرِ نظر بیان امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "الادب المفرد" کے ایک حصے کا درس ہے۔

(۱) صحيح البخاری، كتاب البيوع، باب كراهية السخب فى السوق، رقم: ۱۹۸۱، مسند أحمد، مسند عبدالله بن عمرو بن العاص، رقم: ۲۳۳۳، الأدب المفرد، ص: ۸۴-۸۵

اور یہ خلقِ خدا کا حق ہے کہ جب اللہ کے کسی بندے سے ملاقات ہو تو اس سے آدمی خندہ پیشانی سے ملے، اپنے آپ کو بہ تکلف تندخو اور سخت مزاج نہ بنائے کہ لوگ قریب آتے ہوئے وحشت کریں، خواہ اللہ پاک نے دین کا یا دنیا کا بڑے سے بڑا مقام یا منصب عطا فرمایا ہو، وہ اس مقام کی وجہ سے اپنے آپ کو لوگوں سے الگ کر کے سخت مزاج بن کر نہ بیٹھے بلکہ گھلا ملا رہے، یہ انبیاء کرام علیہم السلام کی سنت ہے۔

اس سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر کافروں کا اعتراض

بلکہ یہ وہ سنت ہے جس پر بعض کافروں نے اعتراض کیا تھا۔ قرآن پاک میں آتا ہے:

﴿وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ﴾(۱)

''اور کفار کہتے ہیں کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھانا بھی کھاتا ہے اور بازاروں میں بھی پھرتا ہے''

کفار سمجھتے تھے کہ بازاروں میں پھرنا منصبِ پیغمبری کے خلاف ہے۔ یہ اس وجہ سے سمجھتے تھے کہ انہوں نے اپنے بادشاہوں اور سرداروں کو دیکھا تھا کہ جب وہ بادشاہت کے منصب پر فائز ہو جاتے تھے تو عوام سے کٹ کر بیٹھ جاتے تھے، عام آدمی کی طرح بازاروں میں نہیں آتے تھے، بلکہ خاص شاہانہ شان و شوکت سے آتے تھے۔ تو وہ یہ سمجھتے تھے کہ پیغمبری اتنا بڑا اور اونچا مقام ہے کہ بادشاہت تو اس کے مقابلے میں گرد ہے۔

لیکن قرآن کریم نے ان کے اس خیالِ باطل کی تردید کی، اس لئے کہ پیغمبر تو آتے ہی تمہاری اصلاح کے لئے ہیں، لہٰذا دنیا کا بھی ہر کام عام انسانوں میں گھل مل کر کر کے دکھاتے ہیں، اور اس کے آداب اور اس کی شرائط بتاتے ہیں، نہ یہ کہ اپنے آپ کو عوام سے کاٹ کر ایک طرف بیٹھ جاتے ہیں۔ لہٰذا پیغمبروں کا بازاروں میں چلنا پھرنا اور ملنسار ہونا کوئی عیب کی بات نہیں۔

حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ جو شخص مقتدیٰ (مقتدیٰ کا مطلب ہوتا ہے جس کو دیکھ کر لوگ اطاعت کرتے ہوں) بننے کے بعد لوگوں سے کٹ کر بیٹھ گیا اور اپنی شان بنالی تو اس کو اس طریق کی ہوا بھی نہیں لگی۔

اور یہ بھی فرمایا کہ ایک عام آدمی کی طرح رہو جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رہا کرتے تھے۔

---

(۱) الفرقان: ۷

حضور ﷺ کی ملنساری کا نرالا انداز

شمائل ترمذی میں روایت ہے:

''حضور اقدس ﷺ ایک مرتبہ مدینہ منورہ کے سوق مناقہ (سوق مناقہ مدینہ منورہ کا ایک بازار تھا جواب حرم شریف کی توسیع والے حصے میں شامل ہوگیا ہے، میں نے بھی کسی زمانے میں اس کی زیارت کی تھی) میں تشریف لے گئے، تو وہاں ایک دیہاتی تھے حضرت زاہر رضی اللہ عنہ، دیہات سے سامان لاکر شہر میں بیچا کرتے تھے، سیاہ رنگ تھا اور غریب آدمی تھے، حضور اقدس ﷺ ان سے بہت محبت فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضور ﷺ چپکے سے ان کے پیچھے گئے اور ان کی کولی بھرلی اور ان کو پیچھے سے کمر سے پکڑلیا، پھر آواز لگائی کہ مَنْ یَّشْتَرِیْ هٰذَا الْعَبْدَ مِنِّیْ، کون ہے جو مجھ سے یہ غلام خریدے گا، آپ ﷺ نے مزاح فرمایا۔ جب حضرت زاہر رضی اللہ عنہ نے آواز پہچان لی تو ان کی خوشی کی انتہاء نہ رہی۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی پشت نبی کریم ﷺ کے جسد اطہر کے ساتھ اور ملانے کی کوشش کی اور میں نے کہا کہ یارسول اللہ ﷺ! اگر آپ اس غلام کو فروخت کریں گے تو بہت کم پیسے ملیں گے، اس لئے کہ سیاہ فام ہے اور معمولی درجے کا آدمی ہے۔ تو سرکارِ دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ نہیں اے زاہر! اللہ کے ہاں تمہاری قیمت بہت زیادہ ہے''[1]

اس واقعہ سے اندازہ لگائیں کہ آنحضرت ﷺ بازار میں تشریف لے جارہے ہیں اور کس طرح ایک معمولی درجے کے آدمی کے ساتھ مزاح فرمارہے ہیں۔ دیکھنے والا یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ کتنا اولوالعزم پیغمبر ہے کہ جس کے سامنے جبرئیل امین کے بھی پر جلتے ہیں۔ علیہ الصلوٰۃ والسلام۔

مفتی اعظم پاکستان ہے یا عام راہگیر؟

میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں اپنے مطب میں بیٹھا ہوا تھا (حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا مطب اس وقت برنس روڈ پر ہوتا تھا اور ہمارا گھر بھی اس زمانے میں اس کے قریب ہی ہوا کرتا تھا) دیکھا کہ مطب کے سامنے فٹ پاتھ پر مفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہاتھ میں پتیلی لیے ہوئے ایک عام آدمی کی طرح جارہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ میں دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مفتی اعظم پاکستان جس

(۱) مسند أحمد، رقم: ١٢١٨٧، الشمائل الترمذي، ص: ١٦

کے چار دانگ عالم میں علم وفضل اور تقویٰ کے گن گائے جاتے ہیں، وہ اس طرح ایک عام آدمی کی طرح ہاتھ میں پتیلی لے کر پھر رہا ہے۔ تو میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ کیا ان کو دیکھ کر کوئی پہچان سکتا ہے کہ یہ مفتی اعظم پاکستان ہیں؟

پھر حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ اپنے ساتھ خاص تعلق عطاء فرما دیتے ہیں، وہ اپنے آپ کو عام مسلمانوں کے ساتھ اس طرح گھلا ملا کر رکھتا ہے کہ کسی کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ یہ کس مقام کے آدمی ہیں۔

اور یہی سنت ہے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی، نہ یہ کہ آدمی اپنی شان بنا کر رکھے اور لوگوں کے ساتھ معاملات کرنے میں تکلف سے کام لے۔

مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے مسجد قباء کی طرف عاجزانہ چال

ایک مرتبہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی سے پیدل چل کر ایسے ہی دوستانہ ملاقات کے لئے حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئے جو مسجد قباء کے قریب رہتے تھے، تقریباً تین میل کا فاصلہ ہے۔ ان کے گھر کے دروازے پر جا کر تین دفعہ آواز دی، شاید وہ صحابی کسی ایسی حالت میں تھے کہ جواب نہیں دے سکتے تھے، تو قرآن پاک کے حکم کے مطابق:

﴿وَإِن قِيلَ لَكُمُ ارْجِعُوا فَارْجِعُوا هُوَ أَزْكَى لَكُمْ﴾(۱)

''جب تم سے کہا جائے کہ واپس چلے جاؤ تو واپس ہو جاؤ''

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم واپس مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔ کوئی ناگواری کا اظہار نہیں فرمایا۔ دوست سے ملنے گئے تھے، اپنی طرف سے دوستی کا حق ادا کیا، ملاقات نہیں ہوئی، واپس تشریف لے آئے۔

بعد میں حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو وہ دوڑتے ہوئے آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور فداء ہونے لگے کہ میری کیا حیثیت کہ آپ میرے در پہ تشریف لائے۔

شاید یہ مشکل ترین سنت ہو

ویسے تو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری سنتیں ایسی ہیں کہ ہر سنت پہ انسان قربان ہو جائے۔ لیکن ایک سنت ترمذی شریف کی ایک روایت میں آئی ہے، میں سمجھتا ہوں شاید اس پر عمل کرنا مشکل ترین کام ہے، لیکن سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا۔

---

(۱) النور: ۲۸

روایت میں آتا ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ سے کوئی بات کرتا تو آپ ﷺ اس وقت تک اس سے چہرہ نہیں پھیرتے تھے جب تک کہ وہ خود ہی چہرہ نہ پھیر لے، اپنی طرف سے بات کاٹتے نہیں تھے۔ (۱)

کہنے کو آسان بات ہے، اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب سینکڑوں آدمی رجوع کرتے ہوں، کوئی مسئلہ پوچھ رہا ہے، کوئی اپنی مشکل بیان کر رہا ہے، تو آدمی کا دل چاہتا ہے کہ میں جلدی جلدی ان سے نمٹ جاؤں۔

اور بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ جب بولنے پر آجائیں تو رکنے کا نام ہی نہیں لیتے، تو ان کے ساتھ یہ معاملہ کرنا کہ جب تک وہ نہ رک جائے اس وقت تک اس سے نہ ہٹے، یہ بہت زیادہ مشکل کام ہے۔

لیکن جناب نبی کریم ﷺ جو جہاد میں بھی مشغول ہیں، تبلیغ میں بھی مصروف ہیں، تعلیم میں بھی مصروف ہیں، جو پوری دنیا کی اصلاح کے لئے مبعوث ہوئے ہیں، ایک بوڑھیا بھی راستہ میں پکڑ کر کھڑی ہو جاتی ہے تو اس وقت تک اس سے نہیں پھرتے جب تک کہ پوری طرح اس کو مطمئن نہیں کر دیتے۔

مخلوق سے محبت کرنا، حقیقتاً اللہ سے محبت کرنا ہے

یہ صفت انسان کے اندر اس وقت پیدا ہو سکتی ہے کہ جب مخلوق کے ساتھ اس وجہ سے محبت ہو کہ یہ میرے اللہ کی مخلوق ہے۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر تمہیں اللہ تعالیٰ سے محبت ہے تو تم اللہ تعالیٰ سے کیا محبت کرو گے، اللہ کی ذات کو نہ دیکھا، نہ سمجھا، نہ اس کو تم تصور میں لا سکتے ہو۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر مجھ سے محبت ہے تو میری مخلوق سے محبت کرو اور میری مخلوق کے ساتھ اچھا سلوک کرو تو اللہ تعالیٰ کی محبت کا ایک عکس تمہاری زندگی میں آئے گا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اسی لئے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ یہ باب قائم کر رہے ہیں "باب الانبساط إلى الناس" کہ لوگوں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آنا اور ان کے ساتھ گھلا ملا رہنا اور اس طرح رہنا "کأحد من الناس" جیسے ایک عام آدمی ہوتا ہے، یعنی اپنا کوئی امتیاز پیدا نہ کرنا، یہ مقصود ہے اس باب کا۔ اس میں حدیث نقل کی ہے حضرت عطاء ابن یسار تابعی رحمۃ اللہ علیہ کی، وہ کہتے ہیں کہ میری ملاقات ہوئی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے۔

(۱) شعب الایمان للبیھقی، فصل فی لین الجانب وسلامة الصدر، رقم: ۸۱۳۲ (۲۷۳/۶)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی امتیازی خصوصیت

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی ہیں، اور ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہیں جو اپنی کثرتِ عبادت میں مشہور تھے، بہت عابد و زاہد بزرگ تھے، اور انہوں نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث بھی کثیر تعداد میں روایت کی ہیں۔

ایک خصوصیت ان کی یہ ہے کہ انہوں نے تورات، زبور، انجیل کا علم بھی کسی ذریعہ سے حاصل کیا ہوا تھا، حالانکہ یہ کتابیں ایسی ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اس میں بہت تحریفیں کردی ہیں اور اپنی اصلی حالت میں برقرار نہیں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کو اس نکتۂ نظر سے پڑھنا تا کہ ان کی حقیقت معلوم ہو اور یہودیوں اور عیسائیوں کو تبلیغ کرنے میں مدد ملے تو پڑھنے کی اجازت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کچھ تورات یہودیوں سے پڑھی ہوئی تھی۔

تورات میں اب بھی کتاب اللہ کا نور جھلکتا ہے

تورات اگرچہ مکمل طور پر پہلے کی طرح نہیں ہے، یہودیوں نے اس میں بہت زیادہ تحریفات کردی ہیں، بہت سے حصے حذف کردیئے ہیں، نئے اضافے کردیئے، الفاظ کو بدل دیا، لیکن اس کے باوجود کہیں کہیں پھر بھی کتاب اللہ کا نور جھلکتا ہے۔

اسی وجہ سے اس میں اب بھی جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی بشارتیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات موجود ہیں، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تو اور زیادہ واضح تھیں، اسی وجہ سے قرآن کریم کہتا ہے:

"یہ یہودی آپ کو اس طرح جانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں"(۱)

اس لئے کہ تورات میں جو علامتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان ہوئی تھیں کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم ایسی ایسی صفات کے حامل ہوں گے، ایسا ان کا حلیہ ہوگا، اس خاندان کے ہوں گے، اس شہر میں ہوں گے، یہ ساری تفصیل مذکور تھی۔ تو جو یہودی ان کتابوں کے عالم تھے وہ اپنی آنکھوں سے وہ علامتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں دیکھتے تھے کہ پائی جارہی ہیں، مگر اپنی ضد اور ہٹ دھرمی اور عناد کی وجہ سے مانتے نہیں تھے۔ حضرت عطاء بن یسار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب میری ملاقات حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے ہوئی تو میں نے ان سے کہا کہ آپ نے تورات پڑھی ہے، تورات میں جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صفات مذکور ہیں وہ ہمیں بتلائیں۔

(۱) البقرۃ: ۱۴٦

بائبل سے قرآن تک

یہ کتابیں ان لوگوں نے اتنی بگاڑ دی ہیں، اس کے باوجود اس میں بعض ٹکڑے ایسے ہیں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے قرآن کریم کا ترجمہ ہے۔ ان کی مشہور کتاب بائبل جس کو ''کتاب مقدس'' بھی کہتے ہیں، اس کو یہودی بھی مانتے ہیں اور عیسائی بھی مانتے ہیں، اس میں حضور ﷺ کی بشارتیں آج بھی موجود ہیں۔ مجھے تورات کا ایک جملہ یاد آ گیا جس میں حضور ﷺ کی بشارت دیتے ہوئے فرمایا گیا:

''جو فاران سے طلوع ہوگا۔ سلاح میں بسنے والے گیت گائیں گے، قیدار کی بستیاں حمد کریں گی''

فاران نام ہے اس پہاڑ کا جس پر غارِ حرا واقع ہے۔ ''سلاح'' نام ہے اس پہاڑ کا جس کا ایک حصہ ثنیۃ الوداع ہے، جب حضورِ اقدس ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو اس پر بچیوں نے کھڑے ہو کر یہ ترانے پڑھے تھے:

"طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ"(۱)

اور قیدار نام ہے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے صاحبزادے کا، اور ان کی بستیاں عرب میں آباد ہیں، ان کی طرف اشارہ ہے کہ جب ان کی اولاد میں نبی آخر الزماں پیدا ہوں گے تو ان کی بستیاں حمد کریں گی۔

آپ ﷺ کی صفات تورات میں بھی موجود ہیں

بہر حال، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ہاں میں بتاتا ہوں۔

"وَاللّٰهِ إِنَّهُ لَمَوْصُوفٌ فِي التَّوْرَاةِ بِبَعْضِ صِفَتِهِ فِي الْقُرْآنِ"

''اللہ کی قسم حضور علیہ السلام کی بعض صفات تورات میں ایسی مذکور ہیں جو کہ قرآن پاک میں بھی مذکور ہیں''

پھر انہوں نے قرآن پاک کی آیت تلاوت فرمائی:

﴿ يٰأَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا ﴾(۲)

''اے نبی! ہم نے آپ کو گواہ بنا کر اور خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا''

---

(۱) الرياض النضرة في مناقب العشرة (۱/۵٦)، دلائل النبوة (۲/۳٦۳)، رقم: ۷۵۲، السيرة النبوية، لابن كثير (۲/۲٦۹)

(۲) الاحزاب: ۴۵

گواہ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن آپ ﷺ گواہی دیں گے کہ اس اُمت کو اللہ تعالیٰ کی توحید کا پیغام دیا گیا تھا تو کس نے اس پر عمل کیا اور کس نے نہیں کیا، اس بات کی گواہی دیں گے۔

وَّمُبَشِّرًا: اور نبی کریم ﷺ لوگوں کو جنت کی خوشخبری دینے والے ہوں گے۔

وَّنَذِيْرًا: اور جہنم سے ڈرانے والے ہوں گے۔

یہ آیت قرآن کریم کی تلاوت فرمائی، پھر آگے تورات کی عبارت پڑھ کر سنائی:

"وَّحِرْزًا لِّلْاُمِّيِّيْنَ"

یعنی حضورِ اقدس ﷺ اَن پڑھ لوگوں کے واسطے نجات دہندہ بن کر آئیں گے۔ اُمی کا لفظ خاص طور سے لقب کے طور پر عربوں کے لئے بولا جاتا تھا، اس لئے کہ ان کے ہاں لکھنے پڑھنے کا رواج نہیں تھا، تو یہ تورات میں تھا کہ امیوں کے لئے نجات دہندہ بن کر آئیں گے۔ آگے فرمایا:

"اَنْتَ عَبْدِیْ وَرَسُوْلِیْ"

''اللہ تعالیٰ اس وقت تورات میں فرمارہے ہیں کہ اے نبی محمد ﷺ! تم میرے بندے ہو اور پیغمبر ہو''

"سَمَّیْتُكَ الْمُتَوَكِّلَ"

''میں نے تمہارا نام متوکل رکھا ہے'' یعنی اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرنے والا۔

آگے صفات بیان فرمائیں کہ وہ نبی کیسا ہوگا؟ فرمایا:

"لَیْسَ بِفَظٍّ وَّلَا غَلِیْظٍ"

''وہ نہ تو سخت گو ہوگا اور نہ سخت طبیعت والا ہوگا''

فظ کے معنی ہیں جس کی باتوں میں سختی ہو، کرختگی ہو۔

"وَّلَا سَخَّابٍ فِی الْاَسْوَاقِ"

''اور نہ بازاروں میں شور مچانے والا ہوگا''

"وَلَا یَدْفَعُ السَّیِّئَةَ بِالسَّیِّئَةِ"

''اور وہ برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دے گا''

"وَلٰكِنْ یَّعْفُوْ وَیَصْفَحُ"

''لیکن وہ معاف کرنے والا اور درگزر کرنے والا ہوگا''

"وَلَنْ یَّقْبِضَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی حَتّٰی یُقِیْمَ بِهِ الْمِلَّةَ الْعَوْجَآءَ بِاَنْ یَّقُوْلُوْا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ"

''اور اللہ تعالیٰ اس وقت تک اس کو اپنے پاس نہیں بلائیں گے جب تک کہ اس ٹیڑھی قوم کو سیدھا نہ کردے، اس طرح کہ وہ کہہ دیں: لا إله إلا الله''

'' فَيَفْتَحُ بِهَا اَعْيُنًا عُمْيًا وَآذَانًا صُمًّا وَقُلُوبًا غُلْفًا''

''اور اس کلمہ توحید کے ذریعے ان کی اندھی آنکھیں کھول دے گا اور بہرے کان کھول دے گا، اور وہ دل جن کے اُوپر پردے پڑے ہوئے ہیں وہ ان کے ذریعے کھل جائیں گے''

اور یہ صفات تقریباً انہی الفاظ کے ساتھ تورات میں آج بھی موجود ہیں۔

تورات کی عبرانی زبان میں آپ علیہ السلام کی صفات

چونکہ محاورے ہر زبان کے مختلف ہوتے ہیں، تو اصل تورات عبرانی زبان میں تھی، اس کا ترجمہ جب اردو میں کرتے ہیں تو اس طرح کرتے ہیں:

''وہ مسلے ہوئے سرکنڈے کو نہ توڑے گا، ٹمٹماتی ہوئی بتی کو نہ بجھائے گا''

اور عبرانی زبان کے محاورے میں ترجمہ اس طرح کرتے ہیں:

''وہ کسی برائی کا بدلہ برائی سے نہ دے گا اور عفو و درگزر سے کام لے گا اور اس کے آگے پتھر کے بت اوندھے منہ گریں گے''

اور یہ واقعہ اس وقت پیش آیا کہ جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ فتح کیا تو پتھر کے بت جو خانہ کعبہ میں نصب تھے وہ اوندھے منہ گرے، یہ ساری تفصیل آئی ہے۔ میں نے جو ''اظہار الحق'' کا ترجمہ ''بائبل سے قرآن تک'' کے نام سے کیا ہے، اس کی تیسری جلد کا چھٹا باب انہی بشارتوں پر مشتمل ہے۔ میں نے دو کالم بنا کر ایک کالم میں بائبل کی عبارت دوسرے کالم میں وہ احادیث لکھی ہیں جن میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات آئی ہیں، پھر ان کو موازنہ کرکے دکھایا کہ بائبل میں یہ آیا ہے اور قرآن کریم میں یا حدیث میں یہ آیا ہے۔ تو اتنی تحریفات کے باوجود آج بھی یہ صفات بائبل میں باقی ہیں۔

حدیثِ مذکورہ سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی غرض

لیکن جس غرض سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ یہ حدیث لے کر آئے ہیں، وہ یہ ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے جو حالات پچھلی کتابوں میں بیان ہوئے وہ کیا تھے، اور اس پیشگوئی میں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امتیازی صفات ہیں اور سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہیں وہ کیا ہیں؟

وہ یہ ہیں کہ آپ کرخت نہیں ہیں اور ترش مزاج نہیں ہیں اور برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے۔

یہ سنت ہے نبی کریم ﷺ کی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے شریعت میں اجازت دی ہے کہ اگر کسی شخص نے تمہارے ساتھ برائی کی ہے تو جتنی برائی کی ہے اتنا بدلہ لے سکتے ہو، ایک تماچہ مارا ہے تو تم بھی اتنے ہی زور سے ایک طمانچہ مار سکتے ہو جتنا زور سے اس نے مارا، اس سے کم و بیش نہ ہو، اس کی اجازت ہے۔ لیکن اجازت ہونا اور بات ہے اور آپ ﷺ کی سنت ہونا اور بات ہے۔ آپ نے ساری عمر کبھی کسی شخص سے اپنی ذات کا بدلہ نہیں لیا۔

برائی کا جواب حسنِ سلوک سے دینا

یہ بھی نبی کریم ﷺ کی بڑی عظیم الشان سنت ہے۔ ہم نے سنتوں کو چند ظاہری سنتوں کی حد تک محدود کرلیا ہے، مثلاً سنت ہے کہ مسواک کرنا چاہئے، داڑھی رکھنی چاہئے، اور ظاہری وضع قطع سنت کے مطابق کرنی چاہئے، یہ سب سنتیں ہیں، ان کی اہمیت سے بھی جو انکار کرے وہ سنتوں سے ناواقف ہے، لیکن سنتیں اس حد تک محدود نہیں، عام تعلقات اور معاملات میں نبی کریم ﷺ کا جو طرزِ عمل تھا، وہ بھی آپ ﷺ کی سنت کا ایک بہت بڑا حصہ ہے۔ اور جس اہتمام کے ساتھ دوسری سنتوں پر عمل کرنے کا دل میں داعیہ پیدا ہوتا ہے، اس سے بھی زیادہ اہتمام کے ساتھ اس سنت پر عمل کرنے کی فکر کرنی چاہئے کہ برائی کا بدلہ برائی سے نہ دیں بلکہ برائی کا بدلہ حسنِ سلوک سے دیں، سنت کے مطابق اچھائی سے دیں۔ اب ذرا ہم اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں کہ ہم اس سنت پہ کتنا عمل کررہے ہیں؟ ہمارے ساتھ اگر کسی نے برائی کی ہے تو کتنا انتقام کا جذبہ دل میں پیدا ہوتا ہے اور کتنی اس کو تکلیف پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں؟ اگر غور کرو تو معاشرے کے فساد کا بہت بڑا سبب یہ ہے کہ ہم نے نبی کریم ﷺ کی اس سنت کو چھوڑ دیا ہے۔ ہماری سوچ یہ ہوتی ہے کہ اس نے چونکہ میرے ساتھ برائی کی ہے، میں بھی اس سے برائی کروں گا، اس نے مجھے گالی دی ہے، میں بھی دوں گا، اس نے مجھے میری شادی پر کیا تحفہ دیا تھا تو میں بھی اتنا ہی دوں گا، اور اس نے شادی پر تحفہ نہیں دیا تھا تو میں بھی نہیں دوں گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ سب کچھ بدلہ کرنے کے لئے ہورہا ہے، بدلہ کرنے والا درحقیقت صلہ رحمی کرنے والا نہیں ہوتا۔ حدیث میں نبی کریم ﷺ نے یہ فرمایا ہے:

((لَيْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُكَافِئِ، وَلٰكِنَّ الْوَاصِلَ مَنْ اِذَا قُطِعَتْ رَحِمُهٗ وَصَلَهَا))(۱)

یعنی حقیقت میں صلہ رحمی کرنے والا وہ شخص ہے کہ دوسرا تو قطع رحمی کررہا ہے اور رشتہ داری

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب لیس الواصل بالمکافئ، رقم: ۵۵۳۲، سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول اللہ، باب ما جاء فی صلة الرحم، رقم: ۱۸۳۱، سنن أبی داود، کتاب الزکاة، باب فی صلة الرحم، رقم: ۱٤٤٦، مسند أحمد، ٦٢٣٨۔

کے حقوق ادا نہیں کر رہا ہے، اور یہ جواب میں قطع رحمی کرنے کی بجائے اس کے ساتھ اچھا معاملہ کر رہا ہے۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا عجیب واقعہ

ایک دن حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے گھر پر متوسلین اور خدام وغیرہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، اچانک ایک صاحب آئے جو حضرت کے کوئی رشتہ دار تھے، داڑھی مونچھ صاف، عام آدمیوں کی طرح تھے۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی گالیاں دینا شروع کر دیں۔ انتہائی بے ادبانہ لہجے میں جتنے الفاظ برائی کے ان کے منہ میں آئے کہتے ہی گئے۔ آگے سے حضرت ان کی ہر بات پہ کہہ رہے ہیں کہ بھائی ہم سے غلطی ہوگئی ہے، تم ہمیں معاف کر دو، ہم انشاء اللہ تلافی کر دیں گے، تمہارے پاؤں پکڑتے ہیں، معاف کر دو۔ بہر حال، ان صاحب کا اس قدر شدید غصے کا عالم کہ دیکھنے والے کو بھی برداشت نہ ہو، بالآخر ٹھنڈے ہو گئے۔

بعد میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرمانے لگے کہ اس اللہ کے بندے کو کوئی غلط اطلاع مل گئی تھی، اس وجہ سے ان کو غصہ آ گیا تھا، اگر میں چاہتا تو ان کو جواب دے سکتا تھا اور بدلہ لے سکتا تھا، لیکن اس واسطے میں نے اس کو ٹھنڈا کیا کہ بہر حال یہ رشتہ دار ہے اور رشتہ داروں کے بھی حقوق ہوتے ہیں۔ رشتہ داروں کے ساتھ قطع تعلق کر لینا آسان ہے، لیکن تعلق جوڑ کر رکھنا یہ ہے درحقیقت تعلیم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی، اور یہ ہے لا یدفع السیئة بالسیئة کہ برائی کا بدلہ برائی سے نہیں بلکہ پیار سے، محبت سے، شفقت سے اور خیر خواہی سے دو۔

مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم تھے، عجیب ولی اللہ بزرگ تھے۔ دارالعلوم میں مہتمم کے معنی گویا کہ سب سے بڑے عہدے پر فائز۔ حضرت نے ایک گائے پال رکھی تھی۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ اس کو لے کر آ رہے تھے کہ راستے میں مدرسہ کا کوئی کام آ گیا، اسی طرح مدرسہ آئے اور گائے مدرسے کے صحن میں درخت کے ساتھ باندھ کر دفتر میں چلے گئے۔ وہاں دیوبند کے ایک صاحب آئے اور چیخنا شروع کر دیا ''یہ گائے کس کی بندھی ہے؟'' لوگوں نے بتایا ''مہتمم صاحب کی ہے'' تو کہنے لگے'' اچھا! مدرسہ مہتمم کا کمیلا بن گیا، ان کی گائے کا باڑا بن گیا، اور مہتمم صاحب مدرسے کو اس طرح کھا رہے ہیں کہ مدرسے کے صحن کو انہوں نے اپنی گائے کا باڑا بنا لیا ہے''

شور سن کر وہاں ایک مجمع اکٹھا ہوگیا، اب سراسر الزام سراسر ناانصافی۔ حضرت وہاں کام کررہے تھے، اندر آواز آئی تو باہر نکلے کہ کیا قصہ ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ صاحب ناراض ہورہے ہیں کہ مہتمم صاحب نے یہاں گائے باندھ دی۔ کہنے لگے ''ہاں واقعی یہ مدرسہ ہے اللہ کا، مجھے گائے یہاں نہیں باندھنی چاہئے تھی، یہ گائے میری ذاتی ہے اور یہ صحن مدرسہ کا ہے، مجھ سے غلطی ہوگئی، میں اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا ہوں، اس غلطی کا کفارہ یہ ہے کہ میرا دل چاہ رہا ہے کہ یہ گائے آپ ہی لے جاؤ'' وہ بھی اللہ کا بندہ ایسا تھا کہ لے کر چلتا بنا۔

اب آپ دیکھئے کہ سراسر ناانصافی اور ظلم ہے، اتنے بڑے ولی اللہ اور اتنے بڑے خادمِ دین کے اوپر ایک معمولی آدمی اتنی گرمی دکھا رہا ہے سب لوگوں کے سامنے، بجائے اس کے کہ اس کو بدلہ دیا جاتا، گائے بھی اسی کو دے دی، یہ ہے نبی کریم ﷺ کی سنت اور لا یدفع السیئة بالسیئة پر عمل۔

آپ ﷺ کی ساری سنتوں پر عمل ضروری ہے

درحقیقت سنت صرف یہ نہیں ہے کہ آسان آسان سنتوں پر عمل کرلیا جائے، بلکہ ہر ایک سنت پر عمل کی فکر کرنی چاہئے، اور انسان اس سنت کے جتنا قریب ہوگا، اتنا ہی معاشرے کا فساد ختم ہوگا۔ غور کرکے دیکھ لو اور تجربہ کرکے دیکھ لو کہ جو بگاڑ پھیلا ہوا ہے وہ جناب نبی کریم ﷺ کی سنتوں سے دور ہونے کا نتیجہ ہے۔

''وَلٰكِنْ يَّعْفُوْ وَ يَصْفَحُ''

لیکن وہ معاف فرمادیتے ہیں اور درگزر سے کام لیتے ہیں۔ کوئی کچھ بھی کہہ دے لیکن حضورِ اقدس ﷺ جواب نہیں دیتے۔ اور جو اللہ کے ولی ہوتے ہیں، وہ نبی کریم ﷺ کے متبع ہوتے ہیں اور ان کا طریقہ بھی یہی ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس کا کچھ حصہ ہم کو بھی عطا فرمادے۔

یہ سب کچھ اس لئے عرض کیا جاتا ہے کہ ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ معلوم نہیں ہم کہاں چلے گئے ہیں، کس وادی میں بھٹک رہے ہیں۔ یہاں بیٹھنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی سنتوں کا کم از کم تھوڑی دیر دھیان ہو تو شاید دلوں میں کچھ داعیہ پیدا ہوجائے اور اللہ تبارک وتعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمادے۔ اس کی عادت ڈالو، اس کے لئے خون کے گھونٹ پینے پڑتے ہیں، اس کے لئے مشق کرنی پڑتی ہے، دل پر جبر کرنا پڑتا ہے، دل پر پتھر رکھنے پڑتے ہیں۔ اگر نبی کریم ﷺ کی سنت کی منزل کی طرف جانا ہے تو یہ کڑوے گھونٹ پینے پڑیں گے۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ گھونٹ

حدیث پاک میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کوئی گھونٹ جو انسان پیتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کو اتنا پسند نہیں جتنا کہ غصے کا گھونٹ پینا۔ (۱)

یعنی جب غصہ آرہا ہو اور غصے میں آدمی آپے سے باہر ہو رہا ہو اور اس میں اندیشہ ہو کہ وہ کسی کو کوئی نقصان پہنچا دے گا، اس وقت غصے کے گھونٹ کو محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے پی جانا اور اس کے تقاضے پر عمل نہ کرنا، یہ اللہ تعالیٰ کو بہت ہی پسند ہے۔

﴿ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ﴾(۲)

قرآن کریم نے ایسی ہی مدح فرمائی ہے ایسے لوگوں کی کہ جب بھی غصہ آئے اور انتقام کے جذبات پیدا ہوں، تو ٹھیک ہے تمہیں شریعت نے جائز حدود میں بدلہ لینے کا حق دیا ہے، لیکن یہ دیکھو کہ بدلہ لینے سے تمہیں کیا فائدہ؟ فرض کرو کہ ایک شخص نے تمہیں طمانچہ مار دیا تو اگر تم بدلہ لینے کے لئے ایک طمانچہ اس کے مار دو تو تمہیں کیا فائدہ حاصل ہوا؟ اگر تم نے اس کو معاف کر دیا اور یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ کے لئے اس کو معاف کرتا ہوں تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟

اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں صابرین کا اجر

اس کا نتیجہ یہ ہوگا:

﴿ إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾(۳)

''بے شک صبر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ بے حساب اجر عطا فرمائیں گے''

اور حدیث پاک میں آتا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے بندوں کو معاف کرنے کا عادی ہو، اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب اس نے میرے بندوں کو معاف کیا تھا، تو میں اس کو معاف کرنے کا زیادہ حقدار ہوں، تو اس کی خطائیں بھی اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتے ہیں۔

عفو وصبر کا مثالی واقعہ

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں دو آدمی آپس میں لڑے، لڑائی میں ایک کا دانت ٹوٹ

---

(۱) مسند أحمد بن حنبل، ومن سند بني هاشم، رقم: ۲۸٦۰

(۲) آل عمران: ۱۳٤، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اور جو غصے کو پی جانے اور لوگوں کو معاف کر دینے کے عادی ہیں''

(۳) الزمر: ۱۰

گیا۔ جس کا دانت ٹوٹا وہ شخص اس کو پکڑ کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس لے گیا اور کہا کہ دانت کا بدلہ دانت ہوتا ہے، لہٰذا قصاص دلوائیے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے تمہیں حق ہے، لیکن کیا فائدہ، تمہارا دانت تو ٹوٹ ہی گیا، اس کا بھی توڑیں، اس کی بجائے تم دانت کی دیت لے لو، دیت پر صلح کرلو۔ وہ شخص کہنے لگا کہ میں دانت ہی توڑوں گا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے دوبارہ اس کو سمجھانے کی کوشش کی، لیکن وہ نہ مانا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ پھر چلو، اس کا بھی دانت توڑتے ہیں۔

راستے میں حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے، بڑے درجے کے مشہور صحابی ہیں، انہوں نے کہا کہ بھئی دیکھو! تم قصاص تو لے رہے ہو مگر ایک بات تو سنتے جاؤ، میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کو تکلیف پہنچائے اور پھر جس کو تکلیف پہنچی ہے وہ اس کو معاف کردے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس وقت معاف فرمائیں گے جبکہ اس کو معافی کی سب سے زیادہ حاجت ہوگی، یعنی آخرت میں۔

تو یہ شخص یا تو اتنے غصے میں آیا تھا کہ پیسے لینے پر بھی راضی نہیں تھا، جب یہ بات سنی تو کہا:

"أَأَنْتَ سَمِعْتَهٗ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ"

کیا آپ نے یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاں میں نے سنی ہے اور میرے ان کانوں نے سنی ہے۔ وہ شخص کہنے لگا کہ اگر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فرمائی ہے تو جاؤ اس کو بغیر کسی پیسے کے معاف کرتا ہوں، چنانچہ معاف کردیا۔ (۱)

ہم میں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں فرق

احادیث ہم بھی سنتے ہیں اور وہ حضرات بھی سنتے تھے، لیکن ان کا حال یہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد کان میں پڑا تو بڑے سے بڑا قصد و ارادہ اور بڑے سے بڑا منصوبہ اس ارشاد کے آگے ایک پل میں ڈھیر کردیا۔

ہم صبح سے شام تک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پڑھتے اور سنتے رہتے ہیں لیکن ان پر عمل کا داعیہ پیدا نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ اس پڑھنے اور سننے کے نتیجے میں ہماری زندگی میں کوئی انقلاب نہیں آتا، لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیا میں بھی عزت دی تھی اور آخرت میں بھی ان شاء اللہ ان کا عظیم مقام ہوگا۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدیات عن رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب ما جاء فی العفو، رقم: ۱۳۱۳، سنن ابن ماجہ، کتاب الدیات، باب العفو فی القصاص، رقم: ۲۶۸۳

مذکورہ حدیث کا آخری ٹکڑا

اس میں دوسری بات آگے یہ فرمائی کہ اللہ تعالیٰ حضور اقدس ﷺ کو اس وقت تک اپنے پاس نہیں بلائیں گے جب تک کہ اس ٹیڑھی قوم کو سیدھا نہ کرلیں۔ ٹیڑھی قوم سے مراد بت پرستوں والی عرب قوم، کہ ان کے اندر شرک تو تھا ہی اور دماغ میں یہ خناس بھی تھا کہ ہم ساری مخلوق سے برتر ہیں، اپنے آپ کو خدا جانے کیا کچھ سمجھتے تھے، ان کو سیدھا کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ کو بھیجا۔

چنانچہ ۲۳ سال کی مدت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور اقدس ﷺ کے ذریعے پورے جزیرہ عرب پر لا الٰہ الا اللہ کی حکومت قائم فرمادی۔ اور آگے فرمایا:

"فَيَفْتَحُ بِهَا اَعْيُنًا عُمْيًا وَآذَانًا صُمًّا وَقُلُوْبًا غُلْفًا"

اس کلمہ توحید کے ذریعے ان کی اندھی آنکھوں کو کھولے گا اور ان کے دلوں کے پردوں کو ہٹائے گا۔ یہ سب الفاظ تورات کے ہیں جو حضور اقدس ﷺ کی صفات کے بارے میں آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان اخلاق کو اپنے اندر پیدا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

غریبوں کی تحقیر نہ کیجئے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ،
﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ﴾ (۱)

یہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دوسرا باب قائم فرمایا:

"باب فضل ضعفة المسلمين والفقراء والخاملين"

یعنی کمزور مسلمانوں کی فضیلت کے بیان میں یعنی ایسے مسلمان جو مالی اعتبار سے کمزور، منصب اور عہدہ کے اعتبار سے کمزور، جسمانی اعتبار سے کمزور ہیں، ان کے فضائل کے بیان میں یہ باب قائم فرمایا ہے۔ (۲)

اس باب کے قائم کرنے کا مقصد درحقیقت اس بات کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا ہے کہ بعض لوگ جن کو اللہ تعالیٰ دنیاوی اعتبار سے کوئی مقام عطا فرما دیتے ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ نے پیسے زیادہ دے دیئے، یا بڑا منصب دے دیا، عہدہ دے دیا، یا شہرت دیدی، یہ لوگ عام طور پر کمزور قسم کے لوگوں کو حقیر سمجھنے لگتے ہیں، اور ان کے ساتھ تحقیر آمیز برتاؤ کرتے ہیں، ان کو متنبہ کرنے کے لئے یہ بتایا جا رہا ہے کہ ایک آدمی جو بظاہر کمزور نظر آ رہا ہے، چاہے وہ مالی اعتبار سے کمزور ہو، یا جسمانی اعتبار سے کمزور ہو، اس کے بارے میں یہ خیال مت کرو کہ وہ حقیر ہے۔ کیا پتہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں یہ شخص تم سے کہیں زیادہ آگے نکل جائے۔ چنانچہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب کے شروع میں پہلے قرآن کریم کی آیت نقل کی ہے۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

☆ اصلاحی خطبات (۲/۱۹۰-۲۰۱)، ۲۱ فروری ۱۹۹۲ء، بروز جمعۃ المبارک، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرّم کراچی۔ زیر نظر بیان علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "ریاض الصالحین" کے ایک حصے کا درس ہے۔

(۱) الكهف: ۲۸

(۲) رياض الصالحين، باب فضل ضعفة المسلين والفقراء والخاملين، باب نمبر ۲۸، ص: ۱۱۵

﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾(۱)

اس آیت میں حضور نبی کریم ﷺ کو خطاب کیا جا رہا ہے کہ اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روکے رکھیں جو صبح و شام اپنے پروردگار کی عبادت محض اس کی رضا جوئی کے لئے کرتے ہیں، اور کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کی آنکھیں ان سے تجاوز کر کے دنیاوی زندگی کی رونق کی طرف بڑھنے لگیں ــــ یعنی آپ کہیں نہ سوچیں کہ یہ تو غریب، فقیر اور معمولی قسم کے لوگ ہیں، اور معمولی حیثیت کے آدمی ہیں، ان کی طرف دیکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور آپ مالداروں کی طرف دیکھنا شروع کر دیں۔

اللہ کے محبوب کون؟

آنحضرت ﷺ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا جو رابطہ اور تعلق ہے، کون مسلمان اس سے ناواقف ہوگا، اللہ تعالیٰ کو ساری کائنات میں سب سے زیادہ محبوب حضورِ اقدس ﷺ ہیں، آپ ﷺ سے زیادہ محبوب اس کائنات میں کوئی ہو نہیں سکتا، ایسے محبوب ہیں کہ سارا قرآن کریم آپ ﷺ کی وصف و ثنا میں آپ ﷺ کی تعریف میں آپ ﷺ کے اوصاف کے بیان میں بھرا ہوا ہے، فرمایا:

﴿اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا﴾(۲)

جب اللہ تعالیٰ اپنے محبوب ﷺ کی تعریف کرنے پر آتے ہیں تو الفاظ کے ڈھیر لگا دیتے ہیں.

محبوبانہ عتاب

لیکن سارے قرآن کریم میں دو یا تین جگہیں ایسی ہیں جہاں اللہ تعالیٰ نے حضورِ اقدس ﷺ کو تھوڑا سا محبوبانہ عتاب کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ کا یہ عمل ہمیں پسند نہیں آیا۔ ان میں سے ایک "سورہ عبس" میں ہے، جس کا واقعہ یہ ہوا کہ آنحضرت ﷺ کے پاس مشرکین کے کچھ سردار آئے ہوئے تھے۔ آپ نے یہ محسوس کیا کہ چونکہ یہ بااثر اور سردار لوگ ہیں، اگر ان کی اصلاح ہو جائے تو ان کے ذریعہ پوری قوم کی اصلاح کا راستہ کھل سکتا ہے، اس لئے آپ کے دل میں ان کو تبلیغ کرنے اور

---

(۱) الکہف: ۲۸، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: اور اپنے آپ کو استقامت سے ان لوگوں کے ساتھ ساتھ رکھو جو صبح و شام اپنے رب کو اس لئے پکارتے ہیں کہ وہ اس کی خوشنودی کے طلبگار ہیں۔ اور تمہاری آنکھیں دنیوی زندگی کی خوبصورتی کی تلاش میں ایسے لوگوں سے ہٹنے نہ پائیں"

(۲) الاحزاب: ۴۵، ۴۶

دعوتِ اسلام دینے کی زیادہ اہمیت پیدا ہوگئی، اس لئے آپ ان کی طرف زیادہ متوجہ ہوگئے۔ اسی دوران حضرت عبداللہ ابن اُمّ مکتوم رضی اللہ عنہ جو نابینا صحابی تھے، جنہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی میں مؤذن بھی مقرر فرمایا تھا، وہ حضور کی خدمت میں آگئے، اور حضور سے کوئی مسئلہ پوچھنے لگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس کیا کہ یہ تو اپنے ہی آدمی ہیں، روزانہ ملاقات ہوتی ہے، اگر ان کو اس وقت مسئلہ نہ بتایا تو بعد میں بتادیں گے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کیا کہ تم ذرا سا ٹھہر جاؤ، اور مشرکین کے جو سردار تھے، ان کے ساتھ گفتگو میں مشغول رہے، تاکہ ان کو اسلام کی توفیق ہو جائے، اس لئے کہ اگر یہ مسلمان ہو جائیں گے تو پوری قوم کے مسلمان ہونے کا راستہ کھل جائے گا۔ بس اتنا ہی واقعہ پیش آیا، لیکن اللہ جل جلالہ نے اس پر بھی تنبیہ فرمائی، اور یہ آیات نازل ہوئیں۔ (١)

﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰى ۝ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۝﴾

ان آیات میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو غائب کے صیغے سے خطاب فرمایا:

''انہوں نے تیوری چڑھائی اور منہ موڑا، اس لئے کہ ان کے پاس ایک نابینا شخص آگیا'' (گویا کہ یہ عمل اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں آیا)

﴿وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى ۝ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۝﴾

''تمہیں کیا پتہ شاید وہ نابینا شخص سنور جاتا۔ اور نصیحت حاصل کر لیتا تو آپ کی نصیحت اس کو فائدہ پہنچا دیتی''

﴿اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۝ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۝﴾

''جو شخص بے پروائی کرتا ہے (اور طلب لے کر آپ کے پاس نہیں آئے، بلکہ دینِ حق کی طرف سے استغناء کا اظہار کرتے ہیں) آپ ان کی فکر میں پڑتے ہیں''

﴿وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ۝﴾

''حالانکہ (یاد رکھو) اگر وہ ٹھیک نہ ہوں تو آپ پر کوئی وبال نہیں (جب ان کے اندر خود طلب نہیں، بلکہ ان کے اندر استغناء ہے تو پھر آپ پر کوئی گرفت نہیں۔ اور آپ سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا)

﴿وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۝ وَهُوَ يَخْشٰى ۝ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۝﴾

''اور جو شخص دوڑ کر آپ کے پاس آیا ہے اور دل میں اللہ کا خوف لیے ہوئے ہے، تو آپ اس سے اعراض کرتے ہیں'' (٢)

(١) تفسیر ابن کثیر (٤/ ٦٠٦-٦٠٥)

(٢) عبس: ١ تا ١٠

طالب کو ترجیح دینی چاہئے

یہ حضور نبی کریم ﷺ کو ایک محبوبانہ عتاب فرمایا گیا۔ ظاہر ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ کا ہرگز یہ منشا نہیں تھا کہ یہ کمزور آدمی ہے، اور وہ طاقتور ہیں، لہٰذا ان سے اعراض کریں، اور طاقتور کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ بلکہ آپ کے ذہن میں یہ مصلحت تھی کہ یہ تو اپنا آدمی ہے، ان سے تو بعد میں بھی بات ہو سکتی ہے، اور یہ لوگ پتہ نہیں پھر دوبارہ آئیں یا نہ آئیں، لہٰذا ان کو حق کا کلمہ پہنچا دیا جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی گوارہ نہیں فرمایا، اور فرمایا کہ یہ شخص جو طلب لے کر آیا ہے وہ اس شخص پر مقدم ہے جو طلب کے بغیر بیٹھا ہے، اور استغناء کا اظہار کرتا ہے، اس کی طرف زیادہ متوجہ ہونے کی ضرورت نہیں، جو طلب لے کر آیا ہے اس کی طرف توجہ کریں۔

ان آیات میں اگرچہ حضور ﷺ کو خطاب ہے، لیکن آپ کے واسطے سے پوری اُمت کو یہ تاکید فرمائی گئی ہے کہ بظاہر معمولی حیثیت کے آدمی کو حقیقت میں معمولی مت سمجھو۔ کیا پتہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں اس کا کیا درجہ ہے۔ لہٰذا اس کے ساتھ عزت واکرام سے پیش آؤ۔

جنتی اور جہنمی لوگوں کا ذکر

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب میں پہلی حدیث یہ نقل کی ہے:

عَنْ حَارِثَةَ بْنِ وَهْبٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ ((أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَهْلِ الْجَنَّةِ؟ كُلُّ ضَعِيْفٍ مُتَضَعِّفٍ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهُ، أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَهْلِ النَّارِ؟ كُلُّ عُتُلٍّ جَوَّاظٍ مُسْتَكْبِرٍ))(۱)

حضورِ اقدس ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ جنتی کون ہے؟ پھر فرمایا کہ ہر وہ شخص جو کمزور ہے اور لوگ بھی اس کو کمزور سمجھتے ہیں، یا تو جسمانی اعتبار سے کمزور ہو، یا مالی اعتبار سے کمزور ہو، یا حیثیت اور رتبے کے اعتبار سے کمزور ہو یعنی دنیا والے اس کو کم حیثیت اور کم رتبہ والا سمجھتے ہیں، لیکن وہ کمزور شخص اللہ کے یہاں اتنا محبوب ہے کہ اگر وہ اللہ کے اوپر کوئی قسم کھالے تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم کو پورا کر دیتے ہیں، یعنی اگر وہ شخص یہ قسم کھالے کہ فلاں

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب تفسير القرآن، باب عتل بعد ذلك زنيم، رقم: ٤٥٣٧، صحيح مسلم، كتاب الجنة وصفة نعيمها وأهلها، باب النار يدخلها الجبارون والجنة يدخلها الضعفاء، رقم: ٥٠٩٢، سنن الترمذي، كتاب صفة جهنم عن رسول الله، باب ما جاء أن أكثر أهل النار النساء، رقم: ٢٥٣٠، مسند أحمد، مسند أنس بن مالك، رقم: ١٢٠١٩

کام اس طرح ہوگا تو اللہ تعالیٰ وہ کام اسی طرح فرما دیتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب ہے، اور اللہ تعالیٰ اس کی محبت اور قدر کی بنا پر ایسا ہی کر دیتے ہیں۔

اولیاء اللہ کی شان

حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ دو عورتوں میں جھگڑا ہو گیا، اور جھگڑے میں ایک عورت نے دوسری عورت کا دانت توڑ دیا، اور اسلامی قانون یہ ہے کہ دانت کے بدلے دانت۔ جب یہ سزا سنائی گئی تو وہ عورت قصاص میں جس کا دانت توڑنے کا فیصلہ ہوا تھا۔ اس کے سرپرست نے کھڑے ہو کر حضورِ اقدس ﷺ کے سامنے یہ کہہ دیا ''یا رسول اللہ! میں قسم کھاتا ہوں کہ اس کا دانت نہیں ٹوٹے گا۔ اس کا مقصد (معاذ اللہ) حضور ﷺ کے فیصلے پر اعتراض کرنا نہیں تھا، اور نہ عناد تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے اس نے کہا کہ حالات ایسے پیدا ہو جائیں گے کہ انشاء اللہ اس کا دانت نہیں ٹوٹے گا۔ چونکہ اس کا جذبہ معاندانہ نہیں تھا، اور نہ آپ کے فیصلے پر اعتراض مقصود تھا، اس لئے آپ نے اس کی بات کا برا نہیں مانا۔

جہاں اسلام میں یہ قاعدہ ہے کہ دانت کے بدلے دانت، آنکھ کے بدلے آنکھ، وہاں اسلام نے یہ بھی رکھا ہے کہ اگر ورثاء معاف کر دیں، یا صاحبِ حق معاف کر دے تو پھر قصاص ساقط ہو جاتا ہے۔ اور پھر بدلہ لینے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ جس عورت کا دانت ٹوٹا تھا اس کے دل میں بات آ گئی اور اس نے کہا کہ میں معاف کرتی ہوں، اور اس کا دانت نہیں تڑوانا چاہتی۔ چنانچہ اس کے معاف کرنے سے قصاص ختم ہو گیا۔ اس وقت حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بعض لوگ اللہ کے یہاں بڑے محبوب ہوتے ہیں۔ اور ظاہری حالت ان کی یہ ہوتی ہے کہ ان کے بال پراگندہ، دیکھنے میں کمزور، اور اگر لوگوں کے دروازے پر جائیں تو لوگ دھکا دے کر نکال دیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کی ایسی عزت ہوتی ہے کہ اللہ پر اگر کوئی قسم کھا لیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو پورا کر دیں۔ اور یہ بھی ایسا شخص ہے کہ اس نے قسم کھائی تھی کہ اس کا دانت نہیں توڑا جائے گا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی قسم پوری کر دی۔ اور وارثوں نے خود ہی معاف کر دیا۔ (۱)

اس حدیث شریف میں حضور ﷺ اسی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ ایسا شخص جو دیکھنے میں

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الصلح، باب الصلح فی الدیۃ، رقم: ۲۵۰۴، سنن النسائی، کتاب القسامۃ، باب القصاص فی الثنیۃ، رقم: ٤٦٧٥، سنن أبی داود، کتاب الدیات، باب القصاص من السن، رقم: ۳۹۷۹، سنن ابن ماجہ، کتاب الدیات، باب القصاص فی السن، رقم: ۲٦۳۹، مسند أحمد، رقم: ۱۱۸٥٤

کمزور ہے، اور لوگ اسے کمزور سمجھتے ہیں، لیکن اپنے تقوی کے لحاظ سے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کے لحاظ سے، اللہ تعالیٰ کی بندگی کے لحاظ سے وہ اللہ تعالیٰ کو ایسا محبوب ہے کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ پر قسم کھالے تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم کو پورا کر دیتے ہیں، ایسے لوگ جنت والے ہیں۔

سخت مزاجی سخت نقصان دہ ہے

اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا میں تم کو اہل جہنم کے بارے میں نہ بتلاؤں کہ اہل جہنم کون لوگ ہیں؟ پھر آپ نے فرمایا:

((كُلُّ عُتُلٍّ جَوَّاظٍ مُسْتَكْبِرٍ))

ہر وہ شخص جو سخت مزاج ہو، لفظ "عتل" کے معنی ہیں، درشت مزاج، اور کھردرا آدمی جو بات کرے تو لٹھ مارے، اور بات کرتے وقت نرمی سے بات نہ کرے، سختی سے بات کرے، غصہ سے بات کرے، اور دوسروں کو حقیر سمجھے، ایسے شخص کو "عتل" کہا جاتا ہے، دوسرا لفظ فرمایا "جواظ"، اس کے معنی ہیں "نک چڑھا" جس کی پیشانی پر ہر وقت بل پڑے رہتے ہوں، اور معمولی قسم کے آدمی سے بات کرنے کو تیار نہیں، اور کمزور، کم حیثیت اور کم رتبہ آدمی سے بات کرنے میں اپنی توہین سمجھتا ہو، اور ہر وقت اکڑتا ہو، شیخی باز ہو۔ تیسرا لفظ فرمایا "مستکبر" جو تکبر کرنے والا ہو، اور اپنے کو بڑا سمجھنے والا ہو، اور دوسروں کو چھوٹا سمجھنے والا ہو۔ ان صفات والوں کے بارے میں فرمایا کہ جہنم والے ہیں۔ اس لئے کہ یہ لوگ عتل، جواظ اور مستکبر ہیں، اور اپنے کو بڑا سمجھنے والے ہیں۔

یہ بڑی فضیلت والے ہیں

اس حدیث سے اس طرح اشارہ فرمادیا کہ غریب اور مسکین لوگوں کو کم حیثیت اور کم رتبہ سمجھ کر ان کی حقارت دل میں مت لاؤ، اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں ان کی بڑی فضیلت ہے۔ حضورِ اقدس ﷺ کے ساتھ ایمان لانے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ہر طرح کے لوگ تھے، بلکہ زیادہ تعداد ایسے حضرات کی تھی جو مالی اعتبار سے بڑی حیثیت نہیں رکھتے تھے، اور حضورِ اقدس ﷺ کی مجلس میں سب مل کر بیٹھا کرتے تھے۔ ایک طرف حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور عثمان غنی رضی اللہ عنہ بیٹھے ہیں، جو بڑے صاحبِ ثروت اور دولت مند تھے، اور دوسری طرف حضرت بلال حبشی، سلمان فارسی اور صہیب رومی رضی اللہ عنہم بھی بیٹھے ہیں، جو کبھی دو دو تین تین وقت کے فاقے سے ہوتے تھے۔

یہ فاقہ مست لوگ

چنانچہ ایک دن کفارِ مکہ نے حضورِ اقدس ﷺ سے کہا کہ ہم آپ کے پاس آنے کو تیار ہیں، اور آپ کی بات سننے کو تیار ہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ کے پاس ہر وقت معمولی قسم کے فاقہ مست لوگ بیٹھے رہتے ہیں، اور ان کے ساتھ بیٹھنا ہماری شان کے خلاف ہے۔ اس سے ہماری شان میں فرق آتا ہے۔ اس لئے آپ ان کی مجلس الگ کر دیں اور ہمارے لئے علیحدہ مجلس منعقد کریں۔ اس وقت ہم آپ کے پاس آکر آپ کی باتیں سننے کے لئے تیار ہیں۔ بظاہر اس میں کوئی خرابی نہیں تھی کہ ان کے لئے علیحدہ وقت مقرر کر دیا جاتا۔ تاکہ اس وقت میں آکر آپ کی باتیں سن لیتے۔ اور ہوسکتا ہے دین کی باتیں سن کر ان کی اصلاح ہو جائے۔ ہم جیسا کوئی ہوتا تو ان کی بات مان بھی لیتا۔ لیکن بات اصول کی تھی۔ اس لئے فوراً قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ﴾(۱)

''اور ان لوگوں کو مت دور کیجئے جو اپنے پروردگار کو صبح و شام اس کی رضا کا قصد کرتے ہوئے پکارتے ہیں''

چنانچہ آپ نے اعلان فرمایا کہ حق کی طلب لے کر آنا چاہتے ہو تو ان لوگوں کے ساتھ بیٹھنا ہوگا۔ اور اگر نہیں بیٹھنا چاہتے تو اللہ تعالیٰ تم سے بے نیاز ہے۔ اور اللہ کا رسول تم سے بے نیاز ہے۔ لیکن تمہارے لئے الگ مجلس منعقد نہیں کی جائے گی۔ (۲)

انبیاء کرام علیہم السلام کے متبعین نادار ہوتے ہیں

دوسرے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا کہ اس وقت کے کفار نے بھی ان سے یہی کہا:

﴿مَا نَرٰكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ﴾(۳)

''ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کی اتباع انہی لوگوں نے کی ہے، جو ہم میں بالکل رذیل قسم کے لوگ ہیں، وہ بھی محض سرسری رائے سے''

مطلب یہ ہے کہ ہم آپ کے پیچھے کس طرح آسکتے ہیں، اس لئے کہ ہم تو بڑے عقل مند اور

---

(۱) الانعام: ۵۲

(۲) صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب فی فضل سعد بن أبی وقاص، رقم: ۴۴۳۴، سنن ابن ماجه، کتاب الزهد، رقم: ۴۱۱۸

(۳) هود: ۲۷

بڑی شان والے لوگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ لوگ جن کو تم رذیل کہہ رہے ہو، کمزور غریب اور فقیر سمجھ رہے ہو، اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں یہ لوگ بڑے رتبے والے ہیں، لہٰذا ان کو حقارت کی نگاہ سے مت دیکھو۔ یہاں اصول کا معاملہ ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ تمہاری امارت اور تمہاری سرداری اور دولت مندی کے بل بوتے پر تمہیں فوقیت دے دی جائے اور یہ وہ اصول ہے جس پر اللہ اور اللہ کے رسول نے کبھی مصالحت نہیں کی، وہ ہمارے بندے دیکھنے میں چاہے کتنے کمزور ہوں اور کتنے برے لگتے ہوں، لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا بہت اونچا مقام ہے۔

حضرت زاہر رضی اللہ عنہ ۔۔۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک دوست

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کبھی کبھی گاؤں سے ایک صاحب آیا کرتے تھے، اور ان کا نام زاہر تھا، اور بالکل سیاہ فام آدمی اور دیہاتی تھے، اور روپے پیسے کے اعتبار سے کم حیثیت تھے۔ اور لوگوں کے دلوں میں ان کی کوئی حیثیت اور کوئی وقعت نہیں تھی۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ بڑی محبت فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بازار سے گزر رہے تھے تو دیکھا کہ زاہر بازار میں کھڑے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ بازار میں ایک دیہاتی، سیاہ فام، کم حیثیت، کم رتبہ والا شخص کھڑا ہو تو اس کی طرف کون دھیان کرے گا۔ اور لباس بھی پھٹا پرانا اس کی طرف کوئی التفات بھی نہ کرے، لیکن حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب اس بازار سے گزرے تو سارے بازار والوں کو چھوڑ کر حضرت زاہر کے پاس پیچھے سے تشریف لے گئے۔ اور پیچھے سے کولی بھر کر اس کی آنکھیں بند کرلیں۔ جیسے کہ ایک دوست دوسرے دوست کی مذاق میں پیچھے سے آنکھیں بند کرلیتا ہے۔ جب آپ نے آنکھیں بند کرلیں تو حضرت زاہر اپنے آپ کو چھڑانے لگے کہ معلوم نہیں کس نے آکر پکڑ لیا۔ اور پھر آپ نے اس طرح آواز لگائی جس طرح سامان بیچنے والا آواز لگاتا ہے کہ

((مَنْ یَّشْتَرِیْ هٰذَا الْعَبْدَ؟)) ”غلام کون خریدے گا؟

اب تک تو حضرت زاہر رضی اللہ عنہ کو معلوم نہیں تھا کہ مجھے کس نے پکڑ لیا ہے۔ اس لئے چھڑانے کی کوشش کررہے تھے۔ لیکن جب یہ الفاظ سنے تو فوراً پہچان گئے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور اب اپنے آپ کو چھڑانے کے بجائے اپنی کمر کو زیادہ سے زیادہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک سے متصل کرنے لگے۔ اور بے ساختہ ان کی زبان پر یہ جملہ آیا:

”یا رسول اللہ! اگر آپ مجھے غلام بنا کر بیچیں گے تو میری قیمت بہت کم لگے گی۔ اس لئے کہ میری قیمت لگانے والا کوئی بڑی قیمت نہیں لگائے گا، اس لئے کہ میری حیثیت تو معمولی ہے۔“

سبحان اللہ! نبی کریم ﷺ نے جواب میں کیا عجیب جملہ ارشاد فرمایا:

((لٰکِنْ عِنْدَاللّٰہِ لَسْتَ بِکَاسِدٍ))

اے زاہر، لوگ تمہاری قیمت کچھ لگائیں یا نہ لگائیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمہاری قیمت کم نہیں۔ بلکہ بہت زیادہ ہے۔ اب دیکھئے کہ سارے بازار میں بڑے بڑے تاجر بیٹھے تجارت کر رہے ہوں گے، اور وہ روپے پیسے والے ہوں گے، لیکن حضور نبی کریم ﷺ سارے بازار والوں کو چھوڑ کر ان کا دل رکھنے اور بشارت سنانے کے لئے ان کے پاس تشریف لے گئے۔ اور ان کے ساتھ اس طرح پیش آئے جس طرح بے تکلف دوست کے ساتھ انسان پیش آتا ہے۔ (۱)

اور ساری عمر حضورِ اقدس ﷺ یہ دعا فرماتے رہے:

((اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَاَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا وَاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنِ)) (۲)

''اے اللہ! مجھے مسکین بنا کر زندہ رکھئے، مسکینی کی حالت میں مجھے موت دیجئے، اور مسکینوں کے ساتھ میرا حشر فرمائیے''

ملازم کا بھی احترام کیجئے

آج قدریں بدل گئیں، تصورات بدل گئے، اب دنیا کے اندر جو باوقعت ہے، اونچے مقام اور منصب والا ہے، روپے پیسے والا ہے تو اس کی عزت بھی ہے، اس کا اکرام بھی ہے، اس کی طرف توجہ بھی ہے۔ اور جو شخص دنیاوی اعتبار سے کمزور ہے، اس کی عزت دل میں نہیں، اس کی طرف توجہ نہیں، اس کے ساتھ حقارت کا معاملہ کیا جاتا ہے۔ یاد رکھئے، اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں، بعض اوقات ہم زبان سے تو کہہ دیتے ہیں: ﴿اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ﴾ (۳)

جو شخص جتنا زیادہ متقی ہے، اتنا ہی وہ اللہ کے نزدیک مکرم اور معزز ہے۔ لیکن عملاً ہمارا ان کے ساتھ برتاؤ کیسا ہے۔ تمہارے گھر میں جو نوکر کام کر رہے ہیں یا تمہارے پاس جو فقیر لوگ آتے ہیں ان کے ساتھ کس طرح بات کرتے ہو؟ ان کا دل ٹھنڈا کرتے ہو؟ یا ان کی تحقیر کرتے ہو؟ کیا ان احادیث پر عمل کرتے ہو؟ (اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے) ان کے ساتھ حقارت آمیز معاملہ کرنا بڑی خطرناک بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

---

(۱) مسند أحمد بن حنبل، مسند أنس بن مالك، رقم: ۱۲۱۸۷، الشمائل الترمذی، ص: ۱٦

(۲) سنن الترمذی، کتاب الزھد عن رسول اللہ، باب ما جاء أن فقراء المھاجرین......، رقم: ۲۲۷۵، سنن ابن ماجه، کتاب الزھد، باب مجالسة الفقراء، رقم: ٤۱۱٦

(۳) الحجرات: ۱۳

مساکین کی فضیلت ☆

عَنْ أَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِحْتَجَّتِ الْجَنَّۃُ وَالنَّارُ، فَقَالَتِ النَّارُ: فِیَّ الْجَبَّارُوْنَ وَالْمُتَکَبِّرُوْنَ، وَقَالَتِ الْجَنَّۃُ: فِیَّ ضُعَفَاءُ النَّاسِ وَمَسَاکِیْنُھُمْ، فَقَضَی اللّٰہُ بَیْنَھُمَا: اِنَّکِ الْجَنَّۃُ رَحْمَتِیْ اَرْحَمُ بِکِ مَنْ اَشَاءُ، وَاِنَّکِ النَّارُ عَذَابِیْ اُعَذِّبُ بِکِ مَنْ اَشَاءُ، وَلِکِلَیْکُمَا عَلَیَّ مِلْؤُھَا)) (۱)

جنت اور دوزخ کے درمیان مناظرہ

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جنت اور دوزخ کے درمیان آپس میں مناظرہ اور مباحثہ ہو گیا کہ دونوں میں سے کون بہتر ہے۔ دوزخ نے کہا کہ میری شان اونچی ہے۔ اس لئے کہ میرے اندر بڑے بڑے جبار اور متکبر لوگ آکر آباد ہوں گے۔ یعنی جتنے جابر اور متکبر لوگ ہیں، بڑے منصب والے، بہت زیادہ مال و دولت والے، اپنے آپ کو بڑا سمجھنے والے، بڑا کہنے والے، وہ سب میرے اندر گئے۔ اور اس بات پر اس نے فخر کیا۔ اس کے مقابلے میں جنت نے کہا کہ میرے اندر کمزور اور مسکین قسم کے لوگ آباد ہوں گے، اور جنت نے اس بات پر فخر کیا، پھر ان دونوں کے درمیان اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمایا اور جنت سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ تو جنت ہے اور میری رحمت کا نشان اور علامت اور اس کا مورد ہے۔ تیرے ذریعہ سے میں جس پر چاہوں گا، اپنی رحمت نازل فرمادوں گا، اور دوزخ سے خطاب کر کے فرمایا کہ تو دوزخ ہے، جو میرے عذاب کا نشان اور علامت اور اس کا مورد ہے۔ اور تیرے ذریعہ سے میں جس کو چاہوں گا، عذاب دوں گا، اور

☆ اصلاحی خطبات (۲/۲۰۲۔۲۲۴) بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم کراچی۔ زیر نظر بیان علامہ نووی رحمہ اللہ کی کتاب ''ریاض الصالحین'' کے ایک حصے کا درس ہے۔

(۱) صحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة نعيمها وأهلها، باب النار يدخلها الجبارون...... الخ، رقم: ۵۰۸۲، سنن الترمذی، کتاب صفة الجنة عن رسول الله، باب ما جاء في احتجاج الجنة والنار، رقم: ۲٤۸٤، مسند أحمد، رقم: ۷۳۹۳

دونوں سے میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں تم دونوں کو بھروں گا، جنت کو ایسے لوگوں سے بھروں گا جن کے اوپر میری رحمت نازل ہوئی، اور دوزخ کو ایسے لوگوں سے بھروں گا جن کے اوپر میرا عذاب نازل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے آمین۔

جنت اور دوزخ کیسے کلام کریں گی؟

نبی کریم ﷺ نے جنت اور دوزخ کے درمیان یہ ایک مباحثہ اور مناظرہ بیان فرمایا، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے حقیقی معنی مراد ہوں کہ جنت اور دوزخ کے درمیان واقعی یہ مکالمہ ہوا ہو، کیونکہ جنت اور دوزخ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے، اور اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے کہ ان دونوں کو زبان عطا فرمادیں، ان کو بولنے کی صلاحیت دیدیں، ان کے درمیان آپس میں بات چیت ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کچھ بعید نہیں ہے۔ لوگ حیران ہوتے ہیں کہ ایسی چیز کیسے بول دے گی جس کے پاس زبان نہیں ہے۔ جنت تو ایک علاقے، زمین اور باغات کا نام ہے۔ اور دوزخ آگ کا نام ہے۔ وہ کیسے بولیں گی؟ تو یہ دیکھئے کہ انسان کیسے بولتا ہے؟ انسان کے پاس بولنے کی قدرت کہاں سے آگئی ہے؟ جب اللہ تعالیٰ نے یہ طاقت عطا فرمائی، تب انسان بولنے لگا۔ اگر اللہ تعالیٰ نہ دیتے تو انسان کے پاس بولنے کی طاقت کہاں سے آتی، اگر یہ طاقت اللہ تعالیٰ کسی پتھر کو دے دے تو وہ بول پڑے گا۔ اگر کسی درخت کو دے دے تو وہ بول پڑے گا، کسی زمین کو دیدی تو وہ بول پڑے گی۔

قیامت کے روز اعضاء کس طرح بولیں گے؟

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ کہیں سفر پر تشریف لے جارہے تھے۔ راستے میں نئی تعلیم کے دلدادہ ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کسی حدیث یا آیت پر یہ شبہ پیش کیا کہ حضرت! قرآن شریف میں آتا ہے کہ قیامت میں انسان کے اعضاء بولیں گے، قرآن کریم میں ہے کہ یہ اعضاء گواہی دیں گے، ہاتھ گواہی دے گا کہ مجھ سے یہ گناہ کیا گیا تھا۔ ٹانگ بول پڑے گی کہ میرے ذریعہ سے یہ گناہ کیا گیا تھا۔ ان صاحب نے کہا کہ حضرت! یہ عجیب بات ہے کہ ہاتھ بول پڑے گا، ٹانگ بول پڑے گی، یہ کیسے بول پڑے گی؟ حضرت نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے، اللہ تعالیٰ جس کو چاہے، گویائی دیدیں، بولنے کی طاقت دیدیں۔ ان صاحب نے کہا کہ ایسا کبھی ہوا بھی ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ تم دلیل پوچھ رہے تھے یا نظیر پوچھ رہے تھے؟ یہ ایک منطق کی اصطلاح ہے۔ دلیل تو اتنی بھی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے، جس کو چاہے گویائی عطا فرمادیں، اور ہر چیز کی نظیر ہونا ضروری نہیں ہے کہ اس کی کوئی نہ کوئی مثال بھی ہو۔ وہ صاحب کہنے

لگے: ویسے اطمینان کے لئے کوئی نظیر بتادیں۔ حضرت نے فرمایا کہ اچھا یہ بتاؤ: یہ زبان کیسے بولتی ہے؟ چونکہ اس نے پوچھا کہ ہاتھ بغیر زبان کے کیسے بولے گا؟ حضرت نے فرمایا کہ زبان بغیر زبان کے کیسے بولتی ہے؟ یہ بھی تو ایک گوشت کا لوتھڑا ہی ہے، اس کے اندر گویائی کی قوت کہاں سے آ گئی؟ بس اللہ تبارک وتعالیٰ نے عطا فرمادی، تو جو اللہ تعالیٰ اس گوشت کے اس لوتھڑے کو زبان عطا فرما سکتا ہے، وہ ہاتھ کو بھی عطا فرما سکتا ہے۔ اس لئے اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟

بہرحال! نبی کریم سرورِ دو عالم ﷺ نے جنت اور دوزخ کے درمیان جو یہ مکالمہ بیان فرمایا، اس کے بالکل ٹھیک ٹھیک حقیقی معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں کہ جنت اور دوزخ کو اللہ تعالیٰ بولنے کی طاقت دیدیں، اور ان کے درمیان مکالمہ ہو، تو یہ کوئی بعید بات نہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ایک تمثیل ہو۔

متکبرین جہنم میں جائیں گے

بہرحال! جہنم جبار اور متکبر لوگوں سے بھری ہوگی، جو لوگوں پر اپنی بڑائی جتاتے ہیں، اور تکبر کا معاملہ کرتے ہیں۔ اور لوگوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، لوگوں کے ساتھ بڑائی جتاتے اور شیخیاں بھگارتے ہیں، ایسے لوگوں سے جہنم بھری ہوگی۔

کمزور اور مسکین لوگ جنت میں جائیں گے

اور جنت ضعفاء اور مساکین سے بھری ہوگی، جو بظاہر دیکھنے میں کمزور معلوم ہوں، جو متواضع اور مسکین طبع ہوں، جو دوسروں کے ساتھ نرمی کے ساتھ پیش آئیں، تواضع کے ساتھ پیش آئیں، اپنے آپ کو کمتر سمجھیں، ایسے لوگوں سے جنت بھری ہوگی۔

تکبر اللہ کو ناپسند ہے

جہنم اللہ تعالیٰ نے متکبرین سے بھردی ہے۔ اس واسطے کہ متکبر وہ شخص ہے جو دوسروں پر اپنی بڑائی جتائے، اپنے آپ کو بڑا سمجھے، اور دوسروں کو چھوٹا سمجھے، اپنے آپ کو عظیم سمجھے، دوسروں کو حقیر سمجھے، اور اللہ تعالیٰ کو یہ تکبر اور بڑائی ایک لمحے کے لئے بھی پسند نہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

((اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِیْ فَمَنْ نَازَعَنِیْ فِيْهِ قَذَفْتُهُ فِی النَّارِ)) (۱)

بڑائی تو درحقیقت میری چادر ہے، میری صفت ہے، اللہ اکبر، اللہ بڑا ہے، جو شخص مجھ سے اس

(۱) سنن أبی داؤد، کتاب اللباس، باب ما جاء فی الکبر، رقم: ۳۵٦۷، مسند أحمد، رقم: ۷۰۷۸

چادر میں جھگڑا کرے گا، میں اس کو آگ میں ڈال دوں گا۔ حقیقت میں یہ تکبر جہنم کی طرف لے جانے والا عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس گناہ سے بچائے۔ اور یہ اتنا شدید گناہ ہے کہ یہ اُم الامراض ہے، گناہوں کی جڑ ہے۔ اس ایک تکبر سے نہ جانے کتنے گناہ نکلتے ہیں۔ ایک مرتبہ جب انسان کے دل میں تکبر آ گیا، اور اپنی بڑائی کا خیال آ گیا تو اس کے بعد وہ انسان کو طرح طرح کے گناہوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔

متکبر کی مثال

عربی زبان کی ایک بڑی عجیب اور حکیمانہ مثل ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ متکبر کی مثال اس شخص کی سی ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہو، اور وہ بلند ہونے کی وجہ سے دوسروں کو چھوٹا سمجھتا ہے، اور دوسرے اس کو چھوٹا سمجھتے ہیں، تو متکبر جب کبھی وہ دوسرے پر نگاہ ڈالے گا تو اس کے دل میں دوسروں کی حقارت آئے گی۔ اور کسی بھی مؤمن کے اوپر، مؤمن تو کجا، کافر کے اوپر بھی حقارت کی نگاہ ڈالنا گناہِ کبیرہ ہے، اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے۔ آمین۔ اب جو شخص متکبر ہوگا وہ دوسروں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھے گا۔ اور جتنے انسانوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھے گا، اتنے ہی گناہِ کبیرہ اس کے نامۂ اعمال میں بڑھتے چلے جائیں گے۔

پھر متکبر جب دوسروں سے بات کرے گا تو ایسے کرخت انداز میں بات کرے گا جس سے دوسرے کا دل ٹوٹے۔ اور کسی مسلمان کا دل توڑنا بھی گناہ ہے۔

کافر کو بھی حقارت سے مت دیکھو

اور یہ جو میں نے کہا کہ کسی کافر کو بھی حقارت کی نگاہ سے مت دیکھو، یہ بھی گناہ ہے۔ اس لئے کہ کیا پتہ کہ کسی وقت اللہ تعالیٰ اس کافر کو ایمان کی توفیق دیدیں، اور وہ تم سے آگے بڑھ جائے۔ لہٰذا کافر کی حقارت نہیں ہونی چاہئے۔ البتہ کفر کی حقارت ہونی چاہئے۔ فسق اور گناہ کی حقارت تو دل میں ہو، لیکن گناہ گار کی ذات سے حقارت نہیں ہونی چاہئے۔ لیکن یہ فرق کہ کس وقت دل میں گناہ اور کفر کی حقارت ہے، اور کس وقت اس آدمی کی حقارت دل میں ہے جو اس کفر اور گناہ میں مبتلا ہے، آدمی کو بسا اوقات اس کا پتہ نہیں چلتا۔ یہ چیز بزرگوں کی صحبت سے حاصل ہوتی ہے۔

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع

ہم اور آپ تو کس شمار میں ہیں۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی

قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں:

''میں اپنے آپ کو ہر مسلمان سے فی الحال اور کافر سے فی المآل والاحتمال کمتر سمجھتا ہوں۔ یعنی اپنے آپ کو ہر مسلمان سے اس وقت اور کسی کافر کو اس احتمال پر کہ شاید یہ کسی وقت مسلمان ہو جائے، اور مجھ سے آگے بڑھ جائے، اپنے آپ کو کمتر سمجھتا ہوں''

''تکبر'' اور ''ایمان'' جمع نہیں ہو سکتے

اور تکبر ایمان کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا، جب انسان کے دل میں تکبر آ جاتا ہے ___ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ تو بعض اوقات ایمان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ آخر یہ تکبر ہی تو تھا جو شیطان اور ابلیس کو لے ڈوبا۔ اس سے کہا گیا کہ سجدہ کر، بس دماغ میں یہ تکبر آ گیا کہ میں تو آگ سے بنا ہوا ہوں، اور یہ مٹی سے بنا ہوا ہے، دل میں اس کی حقارت آ گئی، اور اپنی بڑائی آ گئی۔ ساری عمر کے لئے راندۂ درگاہ اور متروک اور مردود ہو گیا، یہ تکبر اتنی خطرناک چیز ہے۔

''تکبر'' ایک خفیہ مرض ہے

اس لئے حضورِ اقدس ﷺ جو ہم اور آپ پر کہیں زیادہ مہربان ہیں، وہ اس حدیث کے ذریعہ یہ سبق دے رہے ہیں کہ دیکھو، تکبر قریب پھٹکنے نہ پائے۔ یہ ایسی بیماری ہے کہ بسا اوقات بیمار کو بھی پتہ نہیں ہوتا کہ میں اس بیماری میں مبتلا ہوں۔ حقیقت میں وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں، لیکن حقیقت میں اس کے اندر تکبر ہوتا ہے، اس کا پتہ چلانا بھی آسان نہیں، اسی لئے یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ کسی اللہ والے سے کسی شیخ کامل سے تعلق قائم کرو۔

تصوف کا مقصد

یہ پیری مریدی کا جو رواج ہے کہ کسی شیخ کے ہاتھ پر بیعت ہو گئے، لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا تو برکت ہو گی، اور وہ کچھ وظیفے بتا دیں گے تو وظیفہ پڑھ لیں گے، وغیرہ۔ خوب یاد رکھئے کہ یہ اس کا اصل مقصد نہیں ہے۔ کسی شیخ کے پاس جانے یا کسی مصلح کے پاس جانے کا اصل مقصد یہ ہے کہ یہ جو دل کی بیماریاں ہیں، جن میں سرِ فہرست یہ تکبر کی بیماری ہے، ان کا علاج کرائیں۔ جیسے بیمار کو پتہ نہیں ہوتا کہ میں کس بیماری میں مبتلا ہوں۔ طبیب اسے اس کی بیماری سے مطلع کرتا ہے اور پھر اس کا علاج تجویز کرتا ہے، اسی طرح شیخ روحانی بیماریوں کا علاج کرتا ہے۔ اسی تشخیص کے لئے شیخ سے رجوع کیا جاتا ہے، ہاتھ میں ہاتھ دیدینا معالج سے رابطہ قائم کرنے کی ایک صورت ہے۔

روحانی علاج کی حقیقت

آج کل ایک مصیبت یہ آگئی ہے کہ تعویذ گنڈوں کا نام ''روحانی علاج'' رکھ دیا ہے، تعویذ لکھوالیے، گنڈے لکھوالیے، دم درود کرالیا، بس اس کا نام ''روحانی علاج'' رکھ لیا۔ خوب سمجھ لیجئے۔ یہ روحانی علاج نہیں، بلکہ روحانی علاج یہ ہے کہ اپنے دل کی جو بیماریاں ہیں، مثلاً تکبر، حسد، بغض، عداوت وغیرہ جو انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہیں، ان کے علاج کے لئے کسی شیخ کی طرف رجوع کیا جائے۔ اور شیخ پھر پتہ لگاتا ہے کہ اس کے دل میں تکبر تو نہیں ہے، اگر ہے تو اس کا آسان علاج اس شخص کے لئے کیا ہے؟ پھر وہ اپنے تجربہ سے مناسبِ حال علاج تجویز کرتا ہے۔ اس کی بتائی ہوئی تجویز پر عمل کرنا یہ بیعت کی حقیقت ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا طریقۂ علاج

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ کے یہاں سب سے زیادہ زور اس بات پر تھا کہ ان بیماریوں میں مبتلا لوگ آتے، اور آپ ان کا علاج فرماتے۔ ان کا علاج بھی کوئی دوا پلا کر نہیں ہوتا تھا۔ وظیفے پڑھوا کر نہیں ہوتا تھا، بلکہ عمل سے ہوتا تھا۔ بہت سے لوگوں کا علاج اس طرح کیا گیا کہ ایک تکبر میں مبتلا شخص آیا۔ بس اس کے لئے یہ علاج تجویز کیا کہ جو لوگ مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے آئیں، تم ان کے جوتے سیدھے کیا کرو، بس اس کام پر لگا دیا، نہ کوئی وظیفہ، نہ کوئی تسبیح، نہ کوئی ورد۔ اس کو دیکھ کر پہچان لیا کہ اس کے اندر تکبر کی بیماری ہے، اور اس کا یہ علاج اس کے لئے مناسب ہوگا۔

تکبر کا راستہ جہنم کی طرف

اللہ تعالیٰ اس بیماری سے ہمیں بچائے۔ غرض یہ بیماری انسان کے قلب کے اندر اس طرح داخل ہوتی ہے کہ بسا اوقات اس کو پتہ بھی نہیں ہوتا۔ وہ تو سمجھ رہا ہوتا ہے کہ میں ٹھیک ٹھاک آدمی ہوں۔ لیکن حقیقت میں وہ تکبر کی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے۔ اور پھر اس کا سیدھا راستہ جہنم کی طرف جا رہا ہے۔ اور ایمان حقیقی تکبر کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا، اس واسطے اس کے علاج کی فکر کی ضرورت ہے۔ اور اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تنبیہ فرمائی ہے۔

جنت میں ضعفاء اور مساکین کی کثرت

اس حدیث کے دوسرے حصے میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ جنت ضعفاء اور مساکین سے بھری ہوئی ہے، یعنی جن کو تم دنیا کے اندر بے حقیقت سمجھتے ہو، غریب، غرباء، فقیر فقراء، معمولی حیثیت والے، معمولی کپڑے پہننے والے، ایسے لوگ جن کی طرف لوگ التفات بھی نہیں کرتے، ایسے لوگ اکثر و بیشتر اللہ جل جلالہ سے قریب ہوتے ہیں۔ ان کے دلوں میں اللہ کی عظمت اور محبت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ان پر نازل ہوتی ہیں۔ اور جنت کے اندر اکثر لوگ ایسے ہوں گے۔

قرآن کریم کے اندر انبیاء علیہم السلام کے واقعات دیکھ لیجئے کہ دنیا میں جتنے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے، ان سب کی اتباع کرنے والے اور پیچھے چلنے والے، یہ غریب غرباء اور کمزور مسکین قسم کے لوگ تھے۔ اور یہی وجہ کہ تمام مشرکین یہ اعتراض کرتے تھے ہم ان کے ساتھ کیسے بیٹھیں؟ ان میں تو کوئی ماہی گیر ہے۔ کوئی مچھیرا ہے۔ کوئی بڑھئی ہے۔ کوئی دوسرا معمولی پیشے والا ہے۔ یہ سب آپ کے پاس آکر بیٹھتے ہیں۔ اور ہم تو بڑے سردار ہیں۔ ہم ان کے ساتھ کیسے بیٹھیں؟ لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں کے اوپر فضل فرمایا۔ اور ان کو وہ مقام بخشا کہ دوسرے اس مقام کو ترستے رہے۔ لہٰذا ظاہری اعتبار سے جو لوگ کمزور نظر آتے ہیں ان کو کبھی یہ نہ سمجھو کہ معاذ اللہ یہ حقیر ہیں۔ ان کی تحقیر کبھی دل میں نہ لاؤ۔ اور ان کے ساتھ معاملہ اور برتاؤ ایسا نہ کرو۔

ضعفاء اور مساکین کون ہیں؟

اس حدیث میں دوسری بات جو خاص طور پر عرض کرنے کی ہے، وہ یہ کہ نبی کریم ﷺ نے دو لفظ استعمال فرمائے۔ ایک "ضعفاء"، اور دوسرے "مساکین"۔ ضعفاء کے معنی یہ ہیں کہ جسمانی اعتبار سے کمزور، مالی اعتبار سے کمزور، رتبے کے اعتبار سے کمزور، منصب کے اعتبار سے کمزور، اور لفظ "مساکین" جمع ہے "مسکین" کی۔ اور "مسکین" کے دو معنی آتے ہیں، ایک تو مسکین اس شخص کو کہتے ہیں جس کے پاس پیسے نہ ہوں، اور جو مفلس ہو، دوسرے مسکین اس شخص کو کہتے ہیں جس کے پاس پیسے ہوں یا نہ ہوں لیکن اس کے مزاج میں مسکینی ہو، اس کی طبیعت میں مسکینی ہو، چاہے اس کے پاس پیسے ہوں، اور وہ مالدار بھی ہو، لیکن طبیعت میں تکبر پاس سے نہیں گزرا، وہ مسکینوں کے ساتھ اُٹھتا بیٹھتا ہے، مسکینوں کو اپنے قریب رکھتا ہے، اس کی طبیعت میں عاجزی ہے، تکبر کی بات کبھی نہیں کرتا، ایسا شخص مسکین کے زمرے میں داخل ہے۔

مسکنت اور مالداری جمع ہو سکتے ہیں

لہٰذا یہ شبہ نہ ہونا چاہئے کہ صاحب! اگر کسی کے پاس مال ہے، اور وہ خوشحال ہے تو وہ ضرور جہنم میں جائے گا۔ اللہ تعالیٰ بچائے۔ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ مراد یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اس کو مال دیا ہے، دولت عطا فرمائی ہے، یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمت ہے۔ لیکن اگر طبیعت میں مسکینی اور عاجزی ہے، تکبر نہیں ہے، اور دوسروں کے ساتھ برتاؤ اچھا ہے، اللہ تعالیٰ کے حقوق اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کے حقوق پوری طرح ادا کرتا ہے تو وہ بھی انشاء اللہ مسکین کے زمرے میں داخل ہے۔

فقر اور مسکینی الگ الگ چیزیں ہیں

اور ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے یہ دعا فرمائی ہے:

((اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِيْ مِسْكِيْنًا وَاَمِتْنِيْ مِسْكِيْنًا وَاحْشُرْنِيْ فِيْ زُمْرَةِ الْمَسَاكِيْنِ))(۱)

اے اللہ! مجھے مسکینی کی حالت میں زندہ رکھیو، اور مسکینی کی حالت میں مجھے موت دیجئے، اور مسکینوں کے ساتھ میرا حشر فرمایئے۔ اور ایک دوسری حدیث میں حضور ﷺ نے یہ دعا فرمائی ہے:

((اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْفَقْرِ)) (۲)

اے اللہ! میں فقر سے مفلسی سے اور دوسروں کی احتیاج سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں۔ آپ نے فقر سے تو پناہ مانگی اور مسکینی کی دعا فرمائی، اس سے معلوم ہوا کہ مسکینی کوئی اور چیز ہے۔ یہ فقر وفاقہ مراد نہیں ہے۔ بلکہ مسکینی سے مراد طبیعت کی مسکینی، مزاج کی مسکینی، تواضع، خاکساری اور مسکینوں کے ساتھ اچھا معاملہ وغیرہ ہے۔ اگر یہ خاکساری دلوں میں پیدا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اس بشارت میں داخل ہو سکتے ہیں جو اس حدیث میں بیان کی گئی ہے۔

جنت اور جہنم کے درمیان اللہ تعالیٰ کا فیصلہ

پھر حدیث کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے دونوں کے درمیان اس طرح فیصلہ فرمادیا کہ جنت سے تو یہ کہہ دیا کہ تم تو میری رحمت کا نشان ہو، لہٰذا جس پر مجھے رحمت کرنی ہوگی، تمہارے ذریعے رحمت

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول الله، باب ما جاء أن فقراء المهاجرين...... الخ، رقم: ۲۲۷۵، سنن ابن ماجه، کتاب الزهد، باب مجالسة الفقراء، رقم: ۴۱۱۶۔

(۲) سنن النسائی، کتاب الاستعاذة، باب الاستعاذة من الذلة، رقم: ۵۳۶۵، سنن أبی داؤد، باب فی الاستعاذة، رقم: ۱۳۲۰، مسند أحمد، مسند أبی هريرة، رقم: ۷۷۰۸۔

کروں گا۔ اور جہنم سے فرمادیا کہ تم میرے عذاب کا نشان ہو۔ جس کو عذاب دینا ہوگا، تمہارے ذریعے دوں گا۔ اور دونوں کو بھر کے رہوں گا، جنت کو بھی انسانوں سے بھروں گا اور جہنم کو بھی بھروں گا، اس واسطے کہ دنیا میں دونوں قسم کے انسان پائے جائیں گے، وہ بھی جو جنت کے حقدار ہیں، جنت کے اعمال کرنے والے ہیں، اور وہ بھی جو جہنم کے اعمال کرنے والے ہیں۔ بس! اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں ان لوگوں میں شامل فرمادے جن کو اللہ تعالیٰ نے جنت کے لئے پیدا فرمایا ہے۔ آمین ثم آمین۔

ایک بزرگ کو آخرت کا خوف

ایک بزرگ تھے، ان کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ ساری زندگی میں ساری عمر میں کبھی نہیں ہنسے، ان کے منہ پر کبھی تبسم بھی نہیں دیکھا گیا۔ ہر وقت فکر مند رہتے تھے۔ کسی شخص نے ان سے پوچھا کہ حضرت! ہم نے آپ کو کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ نہ آپ کے چہرے پر کبھی مسکراہٹ نظر آئی۔ آپ ہمیشہ فکر مند نظر آتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ بھائی! بات دراصل یہ ہے کہ میں نے حدیث شریف میں پڑھا ہے کہ کچھ مخلوق تو ایسی ہے جو اللہ تعالیٰ نے جنت کے لئے پیدا فرمائی ہے، اور کچھ مخلوق ایسی ہے جو جہنم کے لئے پیدا فرمائی ہے، مجھے یہ معلوم نہیں کہ میں کونسے زمرے میں داخل ہوں۔ جب تک مجھے یہ پتہ نہ چل جائے کہ میں جنت والے زمرے میں داخل ہوں، اس وقت تک ہنسی کیسے آئے؟ بس اس فکر کے اندر ہر وقت مبتلاء رہتا ہوں۔

مؤمن کی آنکھیں کیسے سو سکتی ہیں؟

کسی بزرگ کا شعر ہے:

وَ کَیْفَ تَنَامُ الْعَیْنُ وَ ھِیَ قَرِیْرَۃٌ
وَ لَمْ تَدْرِ فِیْ اَیِّ الْمَحَلَّیْنِ تَنْزِلُ!

"مؤمن کی آنکھ اطمینان اور چین سے کیسے سو سکتی ہے، جب تک کہ اس کو یہ پتہ نہ چلے کہ دونوں مقامات میں سے کس مقام پر اس کا ٹھکانہ ہوگا"

روح قبض ہوتے ہی مسکراہٹ آگئی

لہٰذا ساری عمر ان بزرگ کو ہنسی نہیں آئی۔ دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ جس وقت انتقال ہوا تو روح قبض ہوتے ہی چہرے پر مسکراہٹ آگئی کہ آج پتہ چل گیا کہ کس زمرے میں اللہ تعالیٰ نے مجھے پیدا فرمایا ہے۔

غفلت کی زندگی بری ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ جن لوگوں کو یہ فکر عطا فرماتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے مقامِ رضا میں ہیں، یا معاذ اللہ، مقامِ غضب میں ہیں، ان کو ہنسی کیسے آسکتی ہے۔ لیکن یہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کا ہم اور آپ پر کرم ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ کیفیت طاری نہیں ہونے دیتے۔ اگر سارے انسانوں پر یہی کیفیت طاری ہوجائے تو دنیا کا کاروبار ٹھپ ہوجائے۔ دنیا کا کاروبار نہ چل سکے۔ اس واسطے یہ کیفیت طاری نہیں ہونے دیتے۔ لیکن حضورِ اقدس ﷺ جابجا احادیث میں متنبہ فرماتے رہتے ہیں کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ غفلت میں مبتلا ہوجاؤ، اور ساری عمر یہ خیال نہ آئے کہ کہاں جارہے ہو۔ جنت کی طرف جارہے ہو یا جہنم کی طرف جارہے ہو۔ بلکہ آنکھیں کھول کر دیکھ لو کہ جس راستے پر تم جارہے ہو وہ جنت کی طرف جانے والا ہے یا جہنم کی طرف جانے والا ہے، اور اپنے اعمال پر نظر رکھو کہ ہم کونسے اعمال کررہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو اس مخلوق میں شامل فرمادے جو اس نے جنت کے لئے پیدا فرمائی ہے۔ آمین

ظاہری صحت وقوت، حسن وجمال پر مت اتراؤ

اگلی حدیث ہے:

"عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ، عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ((اِنَّهُ لَيَأْتِیْ الرَّجُلُ الْعَظِيْمُ السَّمِيْنُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، لَا يَزِنُ عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ)) (۱)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن ایک ایسا شخص لایا جائے گا جو جسمانی اعتبار سے بڑا موٹا تازہ ہوگا اور بڑے مرتبے والا ہوگا لیکن اللہ کے نزدیک اس کا وزن ایک مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں ہوگا، یہ ساری دنیاوی عظمت اور یہ جسمانی صحت اور جسمانی حسن یہ سب دھرا رہ گیا، کیوں؟ اس لئے کہ اس شخص نے باوجود صحت وطاقت کے اللہ جل جلالہ کو راضی کرنے والے کام نہیں کیے، اس لئے اللہ کے نزدیک ایک مچھر کے پر کے برابر بھی اس کی حیثیت نہیں۔

اس حدیث کا مقصود بھی یہی ہے کہ اپنے ظاہری حسن وجمال پر، اپنی صحت پر، اپنی قوت پر،

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب تفسیر القرآن، باب اولئك الذین كفروا بآیات ربهم ولقائه فحبطت، رقم: ٤٣٦٠، صحیح مسلم، کتاب صفة القیامة والجنة والنار، باب، رقم: ٤٩٩١

اپنے مرتبے پر، اپنے مال و دولت پر کبھی نہ اتراؤ، ہوسکتا ہے کہ یہ مال و دولت، یہ مرتبہ، یہ صحت و قوت اللہ تعالیٰ کے نزدیک مچھر کے پر سے بھی زیادہ بے حقیقت ہو، اصل چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ اعمال کیسے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے راستے پر چل رہے ہو یا نہیں۔

مسجد نبوی میں جھاڑو دینے والی خاتون

وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ أَنَّ امْرَأَةً سَوْدَاءَ كَانَتْ تَقُمُّ الْمَسْجِدَ اَوْ شَابًّا فَفَقَدَهَا اَوْ فَقَدَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَأَلَ عَنْهَا اَوْ عَنْهُ، فَقَالُوْا: مَاتَ، قَالَ: اَفَلَا كُنْتُمْ آذَنْتُمُوْنِيْ بِهٖ. فَاَنَّهُمْ صَغَّرُوْا اَمْرَهَا اَوْ اَمْرَهٗ، فَقَالَ: دُلُّوْنِيْ عَلٰى قَبْرِهٖ، فَدَلُّوْهُ فَصَلّٰى عَلَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: اِنَّ هٰذِهِ الْقُبُوْرَ مَمْلُوْءَةٌ ظُلْمَةً عَلٰى اَهْلِهَا وَاِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ يُنَوِّرُهَا لَهُمْ بِصَلَاتِيْ عَلَيْهِمْ))(۱)

اس حدیث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ایک واقعہ بیان فرمارہے ہیں فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک خاتون تھیں، جو کبھی کبھی مسجد نبوی میں آکر جھاڑو دیا کرتی تھیں، اور وہ خاتون سیاہ فام تھیں، لیکن وہ خاتون چند روز تک آپ کو نظر نہیں آئیں، اور مسجد نبوی کی جھاڑو اور صفائی کے لئے نہ آئیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خاتون کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ کافی دن سے وہ خاتون نظر نہیں آرہی ہیں، اور مسجد کی جھاڑو لگانے نہیں آرہی ہیں۔ آپ اس سے اندازہ لگائیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ایک فرد کے ساتھ کس درجہ کا تعلق تھا۔ وہ خاتون آتیں، جھاڑو لگا کر چلی جاتیں۔ لیکن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حافظہ اور یادداشت میں وہ محفوظ تھیں، اس لئے صحابہ کرام سے آپ نے پوچھا کہ کیوں نہیں آئیں "کیا بات ہے؟"

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا "یا رسول اللہ! ان کا تو انتقال ہوگیا"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ان کے انتقال کے بارے میں آپ نے مجھے بتایا تک نہیں"

تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے زبان سے کچھ نہ کہا لیکن انداز ایسا اختیار فرمایا جس سے یہ بتانا مقصود ہو کہ حضور! وہ تو ایک معمولی قسم کی خاتون تھیں، اگر انتقال ہوگیا تو اتنی بڑی اہم بات نہیں تھی کہ آپ جیسی ہستی کو اس کے بارے میں بتایا جاتا، تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مجھے بتاؤ کہ اس کی قبر کہاں

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الجنائز، باب الصلاة على القبر بعد ما يدفن، رقم: ۱۲۵۱، صحيح مسلم، كتاب الجنائز، باب الصلاة على القبر، رقم: ۱۵۸۸، سنن أبي داؤد، كتاب الجنائز، باب الصلاة على القبر، رقم: ۲۷۸۸، سنن ابن ماجه، كتاب ما جاء في الجنائز، باب ما جاء في الصلاة على القبر، رقم: ۱۵۱٦، مسند أحمد، رقم: ۸۲۸۰۔

ہے؟ کس جگہ ان کو دفن کیا ہے؟"

آپ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ساتھ لے کر اس کی قبر پر تشریف لے گئے۔ اور جا کر ان کی قبر پر نمازِ جنازہ پڑھی۔

قبر پر نمازِ جنازہ کا حکم

عام طور سے نمازِ جنازہ کا حکم یہ ہے کہ اگر کسی کی نمازِ جنازہ پڑھ لی گئی ہو تو اس کے بعد قبر پر نمازِ جنازہ پڑھنا جائز نہیں۔ اور اگر کسی کو نمازِ جنازہ پڑھے بغیر دفن کر دیا گیا ہو تب بھی شرعی حکم یہ ہے کہ جب تک میت کے پھولنے پھٹنے کا احتمال نہ ہو اس وقت تک تو اس کی قبر پر نمازِ جنازہ پڑھ سکتے ہیں، اگر اندیشہ ہو کہ اتنے دن گزرنے کی وجہ سے لاش پھول پھٹ گئی ہو گی تو اس کے بعد قبر پر نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔

لیکن سرکارِ دو عالم ﷺ نے اس خاتون کی خصوصیت کے طور پر، اس کے امتیاز کے طور پر اور صحابہ کرام کو جتانے کے لئے آپ اس کی قبر پر تشریف لے گئے اور نمازِ جنازہ پڑھی اور نماز پڑھنے کے بعد فرمایا کہ یہ قبریں ظلمتوں اور اندھیروں سے بھری ہوئی ہوتی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ میری نماز کی برکت سے ان قبروں میں نور پیدا فرما دیتے ہیں۔

کسی کو حقیر مت سمجھیں

یہ عمل آپ نے اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے فرمایا کہ کسی بھی شخص کو، چاہے وہ مرد ہو یا عورت، وہ اگر دنیاوی اعتبار سے معمولی رتبے کا ہے، اس کو یہ نہ سمجھو کہ یہ حقیقت میں بھی معمولی رتبے کا ہے اس کو اہمیت دینے کی کیا ضرورت ہے؟ اس لئے کہ پتہ نہیں کہ وہ اللہ جل شانہ کے نزدیک کیا مقام رکھتا ہو، اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کا کیا مرتبہ ہو۔

ہر بیشہ گماں مبر کر خالی است
شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

لہٰذا کسی بھی انسان کو معمولی ہیئت میں دیکھ کر یہ نہ سمجھو کہ یہ ایک بے حقیقت انسان ہے، کیا پتہ کہ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں کتنا مقبول ہے۔

یہ پراگندہ بالوں والے

وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((رُبَّ اَشْعَثَ مَدْفُوْعٍ بِالْاَبْوَابِ لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ)) (۱)

سرکارِ دوعالم ﷺ نے فرمایا کہ بہت سے ایسے لوگ جو پراگندہ بال والے ہیں، ان کے بالوں میں کنگھی نہیں کی گئی ہے، اور غبار آلود جسم اور چہرہ والے، محنت اور مزدوری کر کے کماتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کے جسم پر اور چہرہ پر گرد کی تہہ جمی ہوئی ہے اور یہ لوگ اگر کسی کے دروازے پر جائیں تو لوگ ان کو دھکا دے کر ان کو نکال دیں، یہ لوگ دنیاوی اعتبار سے تو بے حقیقت ہیں، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں ان کی یہ قدر و قیمت ہوتی ہے کہ اگر اللہ جل جلالہ پر کوئی قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو پورا کردیں۔ یعنی اگر یہ لوگ قسم کھا کر کہہ دیں کہ فلاں کام ہوگا، تو اللہ تبارک وتعالیٰ وہی کام کردیتے ہیں۔ اور اگر یہ لوگ کہہ دیں کہ یہ کام نہیں ہوگا تو اللہ تعالیٰ وہ کام روک دیتے ہیں۔

ناداروں کے ساتھ ہمارا سلوک

ان تمام حدیثوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ظاہری اعتبار سے کسی انسان کو دیکھ کر اس کو معمولی اور بے حقیقت نہ سمجھو۔ زبان سے تو ہم یہ کہتے ہیں کہ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں، اور اللہ کے نزدیک امیر غریب برابر ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں غریب کی بڑی قیمت ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ جب ہم ان کے ساتھ برتاؤ کرتے ہیں، اور جب ان کے ساتھ سلوک کرتے ہیں، کیا اس وقت واقعی یہ باتیں ہمارے ذہن میں رہتی ہیں؟ اپنے نوکروں کے ساتھ، اپنے خادموں کے ساتھ، اپنے ماتحتوں کے ساتھ، اور دنیا میں جو غریب غرباء نظر آتے ہیں، ان کے ساتھ معاملہ کرتے وقت یہ حقیقت ہمارے ذہن میں رہتی ہے یا نہیں؟ ہوتا یہ ہے کہ زبان سے تو میں تقریر کرلوں گا۔ اور آپ تقریر سن لیں گے۔ لیکن جب کرنے کا معاملہ آتا ہے تو اس وقت سب بھول جائیں گے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا اپنے خادم کے ساتھ برتاؤ

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ ان حقائق کو مدنظر رکھنے کی توفیق دیتے ہیں، ان کا قصہ سن لیجئے۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خادم تھے بھائی نیاز۔ خانقاہ میں آنے جانے والے تمام حضرات انہیں ''بھائی نیاز'' کہہ کر پکارتے تھے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خاص منہ چڑھے خادم تھے،

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب فضل الضعفاء والخاملين، رقم: ٤٧٥٤

اور چونکہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت کرتے تھے اور حضرت والا کی صحبت بھی حاصل تھی، تو ایسے لوگوں میں کبھی ناز بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ تھے تو ''نیاز'' لیکن تھوڑا سا ''ناز'' بھی پیدا ہو گیا تھا۔ اس لئے خانقاہ میں آنے جانے والوں سے کبھی سخت ہو جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی صاحب نے حضرت والا سے بھائی نیاز کی شکایت کی حضرت یہ لوگوں کے ساتھ لڑتے جھگڑتے ہیں، اور مجھے بھی انہوں نے برا بھلا کہا ہے۔ چونکہ حضرت والا کو پہلے بھی ان کی کئی شکایتیں پہنچ چکی تھیں، اس لئے حضرت والا کو بہت تکلیف ہوئی کہ یہ دوسروں کے ساتھ ایسا معاملہ کرتے ہیں۔ حضرت والا نے ان کو بلایا، اور ڈانٹ کر فرمایا کہ میاں نیاز! یہ تم کیا ہر آدمی سے لڑتے جھگڑتے پھرتے ہو۔ انہوں نے سن کر چھوٹتے ہی جواب میں کہا کہ حضرت! جھوٹ نہ بولو اللہ سے ڈرو۔ اب یہ الفاظ ایک نوکر اپنے آقا سے کہہ رہا ہے۔ آقا بھی کونسے حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ حقیقت میں ان کا مقصد بھی یہ نہیں تھا کہ حضرت! آپ جھوٹ نہ بولیں۔ بلکہ اصل میں ان کا مقصد یہ تھا کہ جن لوگوں نے آپ تک شکایت پہنچائی ہے، انہوں نے جھوٹی شکایت پہنچائی ہے۔ ان کو چاہئے کہ جھوٹ نہ بولیں، اللہ سے ڈریں۔ لیکن جذبات میں بے اختیار لفظ زبان سے یہ نکلا کہ حضرت! جھوٹ نہ بولو اللہ سے ڈرو۔ اب دیکھئے کہ اگر ایک آقا اپنے نوکر کو ڈانٹ رہا ہو، اور نوکر یہ کہہ دے کہ جھوٹ نہ بولو تو اور زیادہ غصہ آئے گا اور زیادہ اشتعال پیدا ہوگا۔ لیکن یہ حضرت حکیم الامت تھے۔ ادھر انہوں نے کہا کہ جھوٹ نہ بولو اللہ سے ڈرو، ادھر حضرت والا نے فوراً گردن جھکالی اور فرمایا: ''استغفر اللہ، استغفر اللہ، استغفر اللہ''

اللہ تعالیٰ کی حدود پر رک جانے والے

اور پھر بعد میں فرمایا کہ مجھ سے غلطی ہوگئی، وہ یہ کہ میں نے ایک طرفہ بات سن کر ان کو ڈانٹنا شروع کر دیا، اور حالانکہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ کسی ایک کی بات سن کر فوراً فیصلہ نہ کریں، جب تک دوسری طرف کی بات بھی نہ سن لیں۔ پہلے مجھے ان سے پوچھنا چاہئے تھا کہ کیا قصہ ہوا؟ وہ اپنا موقف پہلے بیان کر دیتا، پھر اس کے بعد کوئی فیصلہ کرتے، لیکن میں نے پہلے ہی ڈانٹنا شروع کر دیا۔ تو غلطی مجھ سے ہوئی، اور جب اس نے کہا کہ اللہ سے ڈرو تو میں نے اللہ کی طرف رجوع کیا، معلوم ہوا کہ واقعۃً مجھ سے غلطی ہوئی، اور میں نے استغفر اللہ استغفر اللہ پڑھا۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے کہا گیا کہ

''کان وقافًا عند حدود اللہ''

اللہ کے حدود کے آگے رک جانے والے۔ بھائی نوکروں کے ساتھ اور خادموں کے ساتھ اور اپنے ماتحتوں کے ساتھ بھی حسن سلوک اور اچھا برتاؤ کرنا چاہئے، ان کے ساتھ کسی وقت تحقیر کا معاملہ نہ

کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے محفوظ فرمائیں۔ آمین۔

جنت اور دوزخ میں جانے والے

"وَعَنْ اُسَامَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ((قُمْتُ عَلٰى بَابِ الْجَنَّةِ، فَكَانَ عَامَّةَ مَنْ دَخَلَهَا الْمَسَاكِيْنُ وَاَصْحَابُ الْجَدِّ مَحْبُوْسُوْنَ غَيْرَ اَنَّ اَصْحَابَ النَّارِ قَدْ اُمِرَ بِهِمْ اِلَى النَّارِ، وَقُمْتُ عَلٰى بَابِ النَّارِ، فَاِذَا عَامَّةُ مَنْ دَخَلَهَا النِّسَآءُ))(۱)

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے چہیتے صحابی ہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متبنّٰی حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں، گویا کہ یہ منہ بولے پوتے ہیں، وہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں جنت کے دروازے پر کھڑا ہوا، یہ شاید معراج کا واقعہ ہوگا، کیونکہ معراج کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت اور دوزخ دونوں کی سیر کرائی گئی، یا کسی اور موقع پر عالم رویت یا عالم کشف میں ایسا ہوا ہوگا، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے، میں نے دیکھا کہ اکثر لوگ جو مجھے جنت میں نظر آئے، وہ مسکین قسم کے لوگ تھے، اور میں نے دیکھا کہ دنیا میں جن کو خوش بخت شمار کیا جاتا تھا کہ بڑے خوشحال ہیں، بڑے صاحبِ منصب ہیں، اور دولت مند ہیں، جن کو لوگ دنیا میں بڑی قسمت والے سمجھتے ہیں، وہ سب جنت کے دروازے پر رکے کھڑے ہیں، جیسا کہ ان کو کسی نے روکے رکھا ہے کہ داخل نہیں ہوسکتے۔

اس کے دو معنی ہوسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اس لئے رکے کھڑے تھے کہ وہ جنت میں داخل ہونے کے لائق تو تھے، لیکن حساب و کتاب اتنا لمبا چوڑا تھا کہ جب تک اس حساب کتاب کو صاف نہ کریں، اس وقت تک جنت میں داخلے کی اجازت نہیں، اس لئے وہ دروازے پر کھڑے ہیں - اور ان میں جو جہنم والے تھے ان کے بارے میں حکم ہوگیا تھا کہ ان کو جہنم میں لے جایا جائے اور جہنم کے دروازے پر میں نے کھڑے ہوکر دیکھا تو اکثر اس میں داخل ہونے والی عورتیں ہیں، عورتوں کی تعداد جہنم کے اندر زیادہ نظر آئی۔

(۱) صحيح البخاري، كتاب النكاح، باب لا تأذن المرأة في بيت زوجها لأحد إلا بإذنه، رقم: ٤٧٩٧، صحيح مسلم، كتاب الذكر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب أكثر أهل الجنة الفقراء...... الخ، رقم: ٤٩١٩، مسند أحمد، رقم: ٢٠٨٢٤

مساکین جنت میں ہوں گے

اس حدیث میں دو حصے بیان فرمائے، ایک یہ کہ جنت میں اکثر و بیشتر داخل ہونے والے لوگ مساکین نظر آئے، اس کی تفصیل پیچھے بھی آ چکی ہے، اور یہ بھی عرض کر چکا ہوں کہ یہ ضروری نہیں مساکین سے مفلس اور فقیر مراد ہوں، بلکہ وہ لوگ جو طبیعت کے اعتبار سے مسکین ہیں، وہ بھی ان شاء اللہ اللہ کی رحمت سے مسکین کے اندر داخل ہیں۔

عورتیں دوزخ میں زیادہ کیوں ہوں گی؟

دوسرا حصہ یہ ہے کہ جہنم میں جو اکثر آبادی نظر آئی وہ عورتوں کی نظر آئی۔ ایک دوسری حدیث میں بھی حضور ﷺ نے عورتوں سے خطاب کر کے فرمایا:

((اِنِّیْ اُرِیْتُکُنَّ اَکْثَرَ اَھْلِ النَّارِ))

مجھے دکھایا گیا ہے کہ جہنم کے اکثر باشندے تم ہو، جس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جہنم میں خواتین کی تعداد مردوں سے زیادہ ہوگی، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عورت بحیثیت عورت ہونے کے جہنم کی زیادہ مستحق ہے۔ بلکہ دوسری حدیث میں سرکارِ دو عالم ﷺ نے اس کی وجہ بیان فرمائی وہ یہ کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے عورتوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ جہنم کی آبادی میں اکثر حصہ عورتوں کا ہے۔ تو خواتین نے عرض کیا:

"بِمَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟"

اس کی کیا وجہ ہے کہ جہنم میں خواتین کی تعداد زیادہ ہوگی؟ آپ نے اس کی دو وجہیں بنیادی طور پر بیان فرمائیں وہ یہ کہ

((تُکْثِرْنَ اللَّعْنَ وَتَکْفُرْنَ الْعَشِیْرَ))

دو خرابیاں خواتین کے اندر ایسی ہیں جو جہنم کی طرف لے جانے والی ہیں، جو عورت ان سے بچ جائے گی وہ ان شاء اللہ جہنم سے بھی بچ جائے گی۔ پہلی وجہ بیان فرمائی کہ "تکثرن اللعن" کہ لعن طعن بہت کرتی ہو، یعنی ایک دوسری کو لعنت دینے کا رواج تمہارے اندر بہت زیادہ ہے۔ (۱)

معمولی معمولی بات پر کسی کو بددعا دیدی، کسی کو کوسنا دیدیا، کسی کو برا بھلا کہہ دیا، اور طعنہ دینا

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الحیض، باب ترك الحائض الصوم، رقم: ۲۹۳، صحیح مسلم، کتاب الایمان، رقم: ۱۱٤، سنن النسائی، کتاب صلاة العیدین، رقم: ۱۵۵۸، سنن ابن ماجه، کتاب اقامة الصلاة والسنة فیها، رقم: ۱۲۷۸، مسند أحمد، رقم: ۱۰٦۳۷

بھی بہت ہے۔ طعنہ اس بات کو کہتے ہیں کہ ایسا جملہ بول دیا جس سے دوسرے کے جسم میں آگ لگ گئی اس کا دل ٹوٹ گیا، اس کے نتیجے میں دوسرے کو پریشان کردیا اور یہ مشاہدہ ہے کہ اس میں خواتین بہت مبتلا ہوتی ہیں۔

شوہر کی ناشکری، ایک عظیم گناہ

دوسری وجہ یہ بیان فرمائی کہ "تکفرن العشیر" یعنی تم شوہر کی ناشکری بہت کرتی ہو، یعنی اگر کوئی بیچارہ شریف سیدھا شوہر وہ جان مال اور محنت خرچ کر کے تمہیں راضی کرنے کی فکر کر رہا ہے، لیکن تمہاری زبان پر شکر کا کلمہ مشکل ہی سے آتا ہے بلکہ ناشکری کے کلمات زبان سے نکالتی ہو۔ یہ دو سبب ہیں جن کی وجہ سے تم جہنم میں زیادہ جاؤ گی۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ آمین۔

ناشکری یوں تو ہر حالت میں بری ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو انتہائی ناپسند ہے، اور اس کی ناپسندیدگی کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ عربی زبان اور شریعت کی اصطلاح میں "ناشکری" کا نام "کفر" ہے، اس لئے "کفر" جس سے "کافر" بنا ہے، اس کے اصلی معنی ہیں "ناشکری"، اور کافر کو کافر اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ناشکرا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو اتنی نعمتوں سے نوازا، اس کو پیدا کیا، اس کی پرورش کی، اس پر نعمتوں کی بارش فرمائی اور وہ ناشکری کر کے اللہ کے ساتھ دوسرے کو شریک ٹھیرا دیتا ہے۔ یا ایسی محسن ذات کے وجود کا انکار کرتا ہے، اس لئے یہ اتنی خطرناک چیز ہے۔

شوہر کا مقام

ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں دنیا میں اللہ کے علاوہ کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کے آگے سجدہ کرے، لیکن سجدہ چونکہ کسی اور کے لئے حلال نہیں اس لئے یہ حکم نہیں دیتا۔ بتلانا یہ مقصود ہے کہ یہ عورت کے فرائض میں داخل ہے کہ وہ شوہر کی اطاعت کرے اور اس کی ناشکری نہ کرے اور جب وہ اس کی ناشکری کرے گی تو وہ درحقیقت اللہ کی ناشکری ہوگی۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کو شوہر کی ناشکری اتنی ناپسند ہے کہ خواتین کو بتلا دیا کہ اس کی وجہ سے تم جہنم میں جاؤ گی، یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ (۱)

---

(۱) سنن أبی داؤد، کتاب النکاح، باب فی حق الزوج علی المرأة، رقم: ۱۸۲۸، سنن الدارمی، کتاب الصلاة، باب النهی أن یسجد لأحد، رقم: ۱۴۲۷

جہنم سے بچنے کے دو گُر

اللہ تعالیٰ نے شوہر کے ذمے بیوی کے حقوق رکھے ہیں اور بیوی کے ذمے شوہر کے حقوق رکھے ہیں۔ خاص طور سے ہماری بہنوں کے لئے بڑی یاد رکھنے کی بات ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے باقاعدہ اہتمام کر کے خواتین کے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ تمہارے زیادہ جہنم میں جانے کا سبب یہ دو باتیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ سے زیادہ کون اللہ تعالیٰ کے دین کا رمز شناس ہوگا اور اپنی اُمت کے افراد کا رمز شناس ہوگا؟ آپ سے زیادہ کوئی مرض کو پہچاننے والا نہیں ہوسکتا، اور مرض کی تشخیص کرنے والا اور علاج بتانے والا نہیں ہوسکتا۔ تو عورتوں کو جہنم سے بچانے کے لئے آپ نے دو گُر بتا دیئے، ایک یہ کہ لعن طعن نہ کرو، اور دوسرے شوہر کی ناشکری نہ کرو۔

اس عورت پر فرشتے لعنت کرتے ہیں

حدیث شریف میں یہاں تک فرمایا کہ اگر شوہر عورت کو بستر پر بلائے اور وہ نہ جائے یا فرمایا کہ اگر عورت ایک رات اس طرح گزارے کہ اس کا شوہر اس سے خفا ہو اور اس کے حقوق اس عورت نے ادا نہ کیے ہوں ساری رات فرشتے اس عورت پر لعنت کرتے رہتے ہیں، اتنی خطرناک وعید حضورِ اقدس ﷺ نے بیان فرمائی۔

زبان پر قابو رکھیں

اس وقت یہ بتلانا مقصود ہے کہ یہ جو فرمایا جا رہا ہے کہ عورتوں کی تعداد جہنم میں مردوں کی نسبت زیادہ ہوگی، آج کل یہ عورتوں کے حقوق کا بڑا چرچا ہے اور یہ پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے کہ عورت کو بہت نچلا مقام دیا گیا ہے، یہاں تک کہ جہنم میں بھی عورتیں زیادہ بھر دی گئیں، لیکن خوب سمجھ لیجئے کہ وہ عورتیں جہنم میں اس لئے نہیں بھری گئیں کہ وہ عورتیں ہیں بلکہ اس لئے بھر دی گئیں کہ ان کے اندر بداعمالیوں کی کثرت ہوتی ہے۔ خاص طور پر زبان ان کو جہنم میں لے جانے والی ہے۔ حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ انسان کو جہنم میں اوندھا گرانے والی چیز اس کی زبان ہے، اور عام طور پر جب یہ زبان قابو میں نہیں ہوتی تو اس سے بیشمار گناہ سرزد ہو جاتے ہیں۔ تجربہ کر کے دیکھ لیجئے کہ مرد کی زبان پھر بھی کچھ قابو میں ہوتی ہے۔ اور خواتین زبان کو قابو میں رکھنے کا عام طور پر اہتمام نہیں کرتیں۔ اس کے نتیجے میں یہ فساد پیدا ہوتا ہے۔ خدا کے لئے اپنی زبانوں کو احتیاط سے استعمال کرنے کی کوشش کریں کہ زبان سے کوئی ایسا کلمہ نہ نکالیں جس سے دوسرے کا دل ٹوٹے، اور خاص طور پر

شوہر، جس کا دل رکھنا اللہ تعالیٰ نے بیوی کے فرائض میں شامل فرمایا ہے، لہٰذا یہ جو کہا گیا ہے کہ جہنم میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہوگی اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ زبردستی جہنم میں عورتوں کی تعداد بڑھادی گئی ہے بلکہ وہ تو درحقیقت ان اعمال کا نتیجہ ہے ۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان کو ان اعمال سے بچائیں ۔ اور اگر یہ خود اہتمام سے بچنے کی کوشش کریں تو انشاء اللہ ضرور بچ جائیں گی ۔ آپ کو معلوم ہے کہ جنت کی خواتین کی سردار بھی اللہ تعالیٰ نے ایک خاتون کو بنایا ہے، وہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا، اور اللہ تعالیٰ نے خواتین کو جنت کا مستحق بھی قرار دیا ۔ لیکن سارا مدار ان اعمال پر ہے ۔

حقوق العباد کی اہمیت

دوسری ایک بات اور سمجھ لیں جو اسی حدیث سے نکلتی ہے وہ یہ ہے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے زیادہ جہنم میں جانے کا سبب یہ نہیں بیان فرمایا کہ وہ عبادت کم کرتی ہیں، یہ نہیں فرمایا کہ نفلیں کم پڑھتی ہیں، یہ نہیں فرمایا کہ تلاوت کم کرتی ہیں، وظیفے کم کرتی ہیں، بلکہ سبب کے اندر جو دو باتیں بتائیں لعنت اور شوہر کی ناشکری ان دونوں کا تعلق حقوق العباد سے ہے، اس سے نفلی عبادات کے مقابلے میں حقوق العباد کی اہمیت معلوم ہوئی ۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں اس کا صحیح فہم عطا فرمائے ۔ اور اپنی رحمت سے ان تمام حقوق کو بجالانے کی توفیق عطا فرمائے ۔ آمین ۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین. آمین.
برحمتک یا ارحم الراحمین۔

گناہ گار کو طعنہ مت دیجئے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أما بعد!

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((مَنْ عَيَّرَ أَخَاهُ بِذَنْبٍ قَدْ تَابَ مِنْهُ لَمْ يَمُتْ حَتّٰى يَعْمَلَهُ))(۱)

کسی کو گناہ پر عار دلانے کا وبال

حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کو ایسے گناہ پر عار دلائے اور اس گناہ کا طعنہ دے جس گناہ سے وہ توبہ کر چکا ہے تو یہ طعنہ دینے والا شخص اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک وہ خود اس گناہ کے اندر مبتلا نہیں ہو جائے گا۔ مثلاً ایک شخص کے بارے میں آپ کو پتہ چل گیا کہ یہ فلاں گناہ کے اندر مبتلا تھا یا مبتلا ہوا ہے، اور آپ کو یہ بھی پتہ ہے کہ اس نے توبہ بھی کر لی ہے تو جس گناہ سے وہ توبہ کر چکا ہے اس گناہ کی وجہ سے اس کو حقیر سمجھنا یا اس کو عار دلانا یا اس کو طعنہ دینا کہ تم تو فلاں شخص ہو اور فلاں حرکت کیا کرتے تھے، ایسا طعنہ دینا خود گناہ کی بات ہے، اس لئے کہ جب اس شخص نے توبہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے اپنا معاملہ صاف کر لیا، اور توبہ کرنے سے گناہ صرف معاف نہیں ہوتا بلکہ نامۂ اعمال سے وہ عمل مٹا دیا جاتا ہے تو اب اللہ تعالیٰ نے تو اس کا گناہ نامۂ اعمال سے مٹا دیا لیکن تم اس کو اس گناہ کی وجہ سے حقیر اور ذلیل سمجھ رہے ہو یا اس کو طعنہ دے رہے ہو اور اس کو برا بھلا کہہ رہے ہو، یہ عمل اللہ تعالیٰ کو بہت سخت ناگوار ہے۔

گناہ گار ایک بیمار کی طرح ہے

یہ تو اس شخص کے بارے میں ہے جس کے بارے میں آپ کو معلوم ہے کہ اس نے گناہ سے توبہ کر لی ہے، اور اگر پتہ نہیں ہے کہ اس نے توبہ کی ہے یا نہیں، لیکن ایک مؤمن کے بارے میں احتمال تو ہے کہ اس نے توبہ کر لی ہوگی یا آئندہ کر لے گا، اس لئے اگر کسی نے گناہ کر لیا اور آپ کو توبہ کرنے کا

☆ اصلاحی خطبات (۷/۷۲ تا ۸۲)، ۶ ستمبر ۱۹۹۶ء، بروز جمعہ، بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) سنن ترمذی، کتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله، باب منه، رقم ۲٤۲۹

علم بھی نہیں ہے، تب بھی اس کو حقیر سمجھنے کا کوئی حق نہیں ہے، کیا پتہ کہ اس نے توبہ کر لی ہو۔ یاد رکھئے، نفرت گناہ سے ہونی چاہئے، گناہ گار سے نہیں، نفرت معصیت اور نافرمانی سے ہے، لیکن جس شخص نے معصیت اور نافرمانی کی ہے اس سے نفرت کرنا حضورِ اقدس ﷺ نے نہیں سکھایا۔ بلکہ وہ گناہ گار ترس کھانے اور رحم کے قابل ہے کہ وہ بیچارہ ایک بیماری کے اندر مبتلا ہے، جیسے کوئی شخص کسی جسمانی بیماری کے اندر مبتلا ہو تو اب اس شخص کی بیماری سے تو نفرت ہوگی، لیکن کیا اس بیمار سے نفرت کرو گے کہ چونکہ یہ شخص بیمار ہے اس لئے نفرت کے قابل ہے۔ ظاہر ہے کہ بیمار کی ذات قابلِ نفرت نہیں ہے، بلکہ اس کی بیماری سے نفرت کرو، اس کو دور کرنے کی فکر کرو، اس کے لئے دعا کرو، لیکن بیمار نفرت کے لائق نہیں، وہ تو ترس کھانے کے لائق ہے کہ یہ بیچارہ اللہ کا بندہ کس مصیبت کے اندر مبتلا ہو گیا۔

کفر قابلِ نفرت ہے، نہ کہ کافر

حتیٰ کہ اگر کوئی شخص کافر ہے تو اس کے کفر سے نفرت کرو، اس کی ذات سے نفرت مت کرو، بلکہ اس کے حق میں دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت عطا فرمائے، آمین۔ دیکھئے، حضورِ اقدس نبی کریم ﷺ کو کفار کتنی تکالیف پہنچایا کرتے تھے، آپ پر تیر اندازی ہو رہی ہے، پتھر برسائے جا رہے ہیں، آپ کے جسم کے کئی حصے خون سے لہولہان ہو رہے ہیں، اس کے باوجود اس وقت زبان پر جو کلمات آئے، وہ یہ تھے:

((اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِيْ فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ))(۱)

''اے اللہ، میری قوم کو ہدایت عطا فرما کہ ان کو حقیقت کا پتہ ہی نہیں ہے''

یہ دیکھئے کہ ان کی معصیت، کفر، شرک، ظلم اور زیادتی کے باوجود ان سے نفرت کا اظہار نہیں فرمایا۔ بلکہ شفقت کا اظہار فرماتے ہوئے یہ فرمایا کہ یا اللہ، یہ ناواقف لوگ ہیں، ان کو حقیقت حال کا پتہ نہیں ہے، اس لئے میرے ساتھ یہ لوگ ایسا برتاؤ کر رہے ہیں، اے اللہ ان کو ہدایت عطا فرما۔ لہٰذا جب کسی کو گناہ میں مبتلا دیکھو تو اس پر ترس کھاؤ اور اس کے لئے دعا کرو اور کوشش کرو کہ وہ اس گناہ سے بچ جائے۔ اس کو تبلیغ و دعوت کرو، لیکن اس کو حقیر نہ جانو۔ کیا پتہ کہ اللہ تعالیٰ اس کو توبہ کی توفیق دیدیں اور پھر وہ تم سے بھی آگے نکل جائے۔

---

(۱) صحیح البخاري، كتاب استتابة المرتدين والمعاندين وقتالهم، باب إذا عرض الذمي وغيره بسب النبي ولم يصرح...، رقم: ٦٤٢٧، صحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب غزوة أحد، رقم: ٣٣٤٧، سنن ابن ماجه، كتاب الفتن، باب الصبر على البلاء، رقم: ٤٠١٥، مسند أحمد، رقم: ٣٤٢٩

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا دوسروں کو افضل سمجھنا

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ کا یہ ارشاد میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی سنا اور حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب قدس اللہ سرہ سے بھی سنا ہے، وہ یہ کہ میں ہر مسلمان کو اپنے سے حالاً اور ہر کافر کو اپنے آپ سے احتمالاً افضل سمجھتا ہوں۔ ''احتمالاً'' کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ وہ اس وقت کفر کے اندر مبتلا ہے، لیکن کیا پتہ کہ اللہ تعالیٰ اس کو توبہ کی توفیق عطا فرمادے اور وہ کفر کی مصیبت سے نکل جائے، اور پھر اللہ تعالیٰ اس کے درجات اتنے بلند کردے کہ وہ مجھ سے بھی آگے بڑھ جائے۔ اور جو شخص مسلمان ہے، صاحبِ ایمان ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو ایمان کی دولت عطا فرمائی ہے، کیا پتہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے کیا معاملات ہیں، کیونکہ ہر انسان کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختلف معاملات ہوتے ہیں، کسی کے بارے میں ہم کیا رائے ظاہر کریں کہ وہ ایسا ہے، اس لئے میں ہر مسلمان کو اپنے سے افضل سمجھتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس میں جھوٹ اور غلط بیانی کا احتمال تو نہیں ہے کہ ویسے ہی مروتاً یہ کہہ دیا کہ ''میں ہر مسلمان کو اپنے سے افضل سمجھتا ہوں''۔ یقیناً ایسا سمجھتے ہوں گے تبھی تو فرمایا۔ بہرحال، کسی کو بھی حقیر سمجھنا، چاہے وہ گناہ اور معصیت کی وجہ سے ہو، جائز نہیں۔

یہ مرض کن لوگوں میں پایا جاتا ہے

یہ حقیر سمجھنے کی بات ان لوگوں میں خاص طور پر پیدا ہوجاتی ہے جو لوگ دین کی طرف پلٹتے ہیں، مثلاً شروع میں ان کے حالات دین کے اعتبار سے ٹھیک نہیں تھے، بعد میں دین کی طرف آئے اور نماز روزے کے پابند ہوگئے، اور وضع قطع اور لباس پوشاک شریعت کے مطابق بنالیا، مسجد میں آنے لگے، نماز باجماعت کے پابند ہوگئے، ایسے لوگوں کے دلوں میں شیطان یہ بات ڈالتا ہے کہ تم تو اب سیدھے راستے پر آگئے، اور یہ سب مخلوق جو گناہوں میں منہمک ہیں یہ سب تباہ حال ہیں، اور پھر اس کے نتیجے میں یہ لوگ ان کو حقیر اور کمتر سمجھنے لگتے ہیں، اور حقارت سے ان کو دیکھتے ہیں، اور ان پر دلخراش انداز میں اعتراض کرنے لگتے ہیں۔ پھر اس کے نتیجے میں شیطان ان کو عجب میں، بڑائی میں، تکبر میں اور خود پسندی میں مبتلا کردیتا ہے، اور جب انسان کے اندر اپنی بڑائی اور خود پسندی آجائے تو یہ چیز انسان کے سارے اعمال کو ضائع کرنے والی ہے، اس لئے کہ جب انسان کی نظر اس طرف جانے لگے کہ میں بڑا نیک ہوں اور دوسرے برے ہیں تو بس انسان عجب میں مبتلا ہوگیا، اور عجب کے نتیجے میں اس کے سارے اعمال اکارت ہوگئے۔ اس لئے کہ وہ عمل مقبول ہے جو اخلاص کے ساتھ اللہ کے لئے

کیا جائے اور جس عمل کے بعد انسان اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کہ اس نے مجھے اس کی توفیق عطا فرمائی۔ اس لئے کسی کے ساتھ حقارت کا معاملہ نہیں کرنا چاہئے اور کسی کافر اور فاسق و فاجر کو بھی حقیر نہیں سمجھنا چاہئے۔

کسی کو بیمار دیکھے تو یہ دعا پڑھے

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب انسان دوسرے کو کسی بیماری کے اندر مبتلا دیکھے تو یہ دعا پڑھے:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ عَافَانِیْ مِمَّا ابْتَلَاهُ بِهٖ، وَفَضَّلَنِیْ عَلٰی کَثِیْرٍ مِمَّنْ خَلَقَ تَفْضِیْلًا))(۱)

''اے اللہ! آپ کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے اس بیماری سے عافیت عطا فرمائی جس بیماری میں یہ مبتلا ہے، اور بہت سے لوگوں پر آپ نے مجھے فضیلت عطا فرمائی''

یعنی بہت سے لوگ بیماریوں میں مبتلا ہیں، لیکن آپ نے مجھے صحت عطا فرمائی ہے۔ کسی بیمار کو دیکھ کر یہ دعا پڑھنا سنت ہے۔ آپ ﷺ نے اس کی تلقین فرمائی ہے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب بھی کسی ہسپتال کے پاس سے گزرتا ہوں تو الحمدللہ یہ دعا پڑھ لیتا ہوں، اور ساتھ میں یہ دعا بھی کرتا ہوں کہ یا اللہ! ان بیماروں کو صحت عطا فرما دیجئے۔

کسی کو گناہ میں مبتلا دیکھے تو یہی دعا پڑھے

ہمارے ایک استاد فرمایا کرتے تھے کہ یہ دعا جو حضورِ اقدس ﷺ نے بیمار کو دیکھ کر پڑھنے کی تلقین فرمائی ہے، میں تو جب کسی شخص کو کسی گناہ یا معصیت میں مبتلا دیکھتا ہوں تو اس وقت بھی یہی دعا پڑھ لیتا ہوں۔ مثلاً راستے میں گزرتے ہوئے بعض اوقات دیکھتا ہوں کہ لوگ سینما دیکھنے کے لئے یا اس کا ٹکٹ خریدنے کے لئے لائن میں کھڑے ہیں، ان کو دیکھ کر یہی دعا پڑھ لیتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے اس گناہ سے محفوظ رکھا۔

اس دعا کے پڑھنے کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح بیمار ترس کھانے کے قابل ہے، اسی طرح جو شخص گناہ میں مبتلا ہے وہ بھی ترس کھانے کے قابل ہے کہ وہ اس مصیبت میں مبتلا ہے، اور اس کے لئے بھی دعا کرنی چاہئے کہ یا اللہ! اس کو اس مصیبت سے نکال دیں۔ کیا معلوم کہ آج جو لوگ گناہ کی لائن میں لگے ہوئے ہیں اور آپ ان کو حقیر اور ذلیل سمجھ رہے ہیں، کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ ان کو توبہ کی

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللہ، باب ما یقول اذا رأی مبتلی، رقم: ۳۳۵۳، سنن ابن ماجه، کتاب الدعاء، باب ما یدعو به الرجل اذا نظر الی أهل البلاء، رقم: ۳۸۸۲۔

توفیق دیدیں اور پھر وہ تم سے آگے نکل جائیں۔ اس لئے کس بات پر تم اتراتے ہو؟ لہٰذا جب اللہ تعالیٰ نے تم کو گناہوں سے بچنے کی توفیق دیدی ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اگر ان کو گناہوں سے بچنے کی توفیق نہیں ہوئی تو تم ان کے حق میں دعا کرو، کہ یا اللہ! ان کو ہدایت عطا فرمادے اور ان کو اس بیماری سے نجات عطا فرمادے، آمین۔ بہر حال، کفر سے نفرت ہو، گناہ سے، معصیت اور نافرمانی سے نفرت ہو، لیکن آدمی سے نفرت مت کرو، بلکہ اس کے ساتھ محبت اور شفقت کا معاملہ کرو، اور جب اس سے کوئی بات کہنی ہو تو نرمی اور شفقت سے کہو، ہمدردی اور محبت سے کہو، تاکہ اس پر اثر انداز بھی ہو۔ ہمارے سارے بزرگوں کا یہی معمول رہا ہے۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا چور کے پاؤں چومنا

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ واقعہ سنا کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کہیں سے گزر رہے تھے، ایک جگہ پر دیکھا کہ ایک آدمی کو سولی پر لٹکایا ہوا ہے اور اس کا ایک ہاتھ کٹا ہوا ہے، اور ایک پاؤں کٹا ہوا ہے۔ آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ کیا قصہ ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ شخص عادی قسم کا چور ہے۔ جب پہلی مرتبہ پکڑا گیا تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا، اور جب دوسری مرتبہ پکڑا گیا تو پاؤں کاٹ دیا گیا اور اب جب تیسری مرتبہ پکڑا گیا تو اب اس کو سولی پر لٹکا دیا گیا۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ آگے بڑھے اور اس کے پاؤں چوم لیے۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت! یہ اتنا بڑا چور ہے اور عادی چور ہے، آپ اس کا پاؤں چوم رہے ہیں؟ آپ نے جواب میں فرمایا کہ اگرچہ اس نے بہت بڑا جرم اور گناہ کا کام کیا، جس کی وجہ سے اس کو سزا دی گئی۔ لیکن اس شخص کے اندر ایک بہترین وصف ہے، وہ ہے "استقامت"۔ اگرچہ اس وصف کو اس نے غلط جگہ پر استعمال کیا، اس لئے کہ جس کام کو اس نے اپنا مشغلہ بنایا اس پر ڈٹا رہا۔ اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا پھر بھی اس کام کو نہیں چھوڑا۔ پاؤں کاٹ دیا گیا پھر بھی اس کام کو نہیں چھوڑا حتیٰ کہ موت کی سزا ہوگئی لیکن اپنے کام پر لگا رہا، اس سے پتہ چلا کہ اس کے اندر استقامت کا وصف تھا اور اسی وصف کی وجہ سے میں نے اس کے پاؤں چوم لیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی عبادت اور طاعات کے اندر یہ وصف عطا فرمادے۔

بہر حال! جو اللہ کے نیک بندے ہوتے ہیں وہ آدمی سے نفرت نہیں کرتے، اس کی برائیوں سے نفرت کرتے ہیں، اور وہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی برے آدمی کے اندر اچھائیاں ہیں تو وہ حاصل کرنے کے لائق ہیں، اور اس کے اندر جو برائیاں ہیں اس کو دور کرنے کی فکر کرو۔ اور اس کو محبت اور پیار سے سمجھاؤ، اور اسی سے جا کر بتاؤ، دوسروں سے اس کی برائیاں بیان کرتے مت پھرو۔

ایک مؤمن دوسرے مؤمن کے لئے آئینہ ہے

حدیث شریف میں آتا ہے:

((اَلْمُؤْمِنُ مِرْآةُ الْمُؤْمِنِ))(۱) "ایک مؤمن دوسرے مؤمن کا آئینہ ہے"

اگر آدمی کے چہرے پر کوئی داغ دھبہ لگ جائے اور وہ آدمی جا کر آئینہ کے سامنے کھڑا ہو جائے تو وہ آئینہ بتا دیتا ہے کہ تمہارے چہرے پر یہ داغ لگا ہوا ہے، گویا آئینہ انسان کے عیب بیان کر دیتا ہے، اسی طرح ایک مؤمن بھی دوسرے مؤمن کا آئینہ ہے، یعنی جب ایک مؤمن دوسرے مؤمن کے اندر کوئی عیب دیکھے تو اس کو پیار سے محبت سے بتادے کہ یہ عیب تمہارے اندر موجود ہے، اس کو دور کر لو۔ جیسے اگر کسی انسان کے جسم پر کوئی کیڑا یا چیونٹا چل رہا ہو، اور آپ اس کیڑے کو اس کے جسم پر یا کپڑوں پر چلتا ہوا دیکھ رہے ہیں تو محبت کا تقاضا یہ ہے کہ تم اس کو بتادو کہ دیکھو بھائی! تمہارے جسم پر یہ کیڑا چل رہا ہے، اس کو دور کر لو۔ اسی طرح اگر کسی مسلمان بھائی کے اندر کوئی دینی خرابی ہے تو پیار و محبت سے اس کو بتا دینا چاہئے کہ تمہارے اندر یہ خرابی ہے، اس لئے کہ ایک مؤمن دوسرے مؤمن کا آئینہ ہے۔

کسی کے عیب دوسروں کو مت بتاؤ

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جب تم کسی دوسرے کے اندر کوئی عیب دیکھو تو صرف اسی کو بتاؤ کہ تمہارے اندر یہ عیب ہے، دوسروں سے کہتے مت پھرو کہ فلاں کے اندر یہ عیب ہے۔ اس لئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مؤمن کو آئینہ سے تشبیہ دی ہے، اور آئینہ صرف اس شخص کو چہرے کے داغ دھبے بتاتا ہے جو شخص اس کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ وہ آئینہ دوسروں کو نہیں بتاتا کہ فلاں شخص کے چہرے پر داغ دھبے لگے ہوئے ہیں۔ لہٰذا ایک مؤمن کا کام یہ ہے کہ جس کے اندر کوئی برائی یا عیب دیکھے تو صرف اسی سے کہے، دوسروں سے اس کا تذکرہ نہ کرے کہ فلاں کے اندر یہ عیب اور یہ برائی ہے، کیونکہ اگر دوسروں کو اس کے عیوب کے بارے میں بتاؤ گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کام میں تمہاری نفسانیت شامل ہے، پھر وہ دین کا کام نہیں ہوگا۔ اور اگر صرف اسی سے تنہائی میں محبت اور شفقت سے اس کو اس کے عیب پر تنبیہ کرو گے تو یہ اخوت اور ایمان کا تقاضا ہے، لیکن اس کو حقیر اور ذلیل سمجھنا کسی حال میں بھی جائز نہیں اللہ تعالیٰ ہم سب کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

---

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب في النصيحة، رقم: ٤٢٧٢

گناہ گار کی تحقیر نہ کیجئے ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ، وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْدُ!

برے کام کرنے والے کو کم نہ سمجھو

فرمایا کہ یہ جائز ہے کہ برا کام کرنے والے پر غصہ کرو، اس سے بغض کرو، مگر اپنے سے کم نہ سمجھو، اور کبھی تم کو کسی کی سزا و تادیب کے واسطے مقرر کیا جائے تو خبردار! اپنے کو اس سے اچھا ہرگز نہ سمجھنا، ممکن ہے کہ وہ خطاوار شہزادے کے مثل ہو اور تم نوکر جلاد کے درجہ میں ہو، ظاہر ہے کہ خطاوار شہزادے کو بادشاہ جلاد کے ہاتھوں سزا دلوائے تو جلاد اس سے افضل نہیں ہو سکتا۔ (۱)

یعنی ایک آدمی برا کام کر رہا ہے، اور وہ کسی ناجائز اور گناہ کے کام میں مبتلا ہے، تو اس پر غصہ کر سکتے ہو، اور اس سے بغض رکھ سکتے ہو یعنی اس کے اس عمل سے نفرت کر سکتے ہو، کیونکہ اس کا یہ عمل قابلِ نفرت ہے، لیکن اس کو اپنے سے کم نہ سمجھو۔ یعنی ایک طرف اس کی برائی کو برائی سمجھو، اور دوسری طرف اس کو اپنے سے کمتر بھی نہ سمجھو، یہ دونوں باتیں کیسے جمع ہوں؟

نفرت گناہ سے، نہ کہ گناہ گار سے

اس بات کو دو لفظوں میں یوں سمجھو! کہ ''فسق'' سے نفرت کرو، فاسق سے نفرت نہ کرو۔ یعنی فاسق کی ذات سے نفرت نہ کرو، بلکہ اس کے فعل سے نفرت کرو۔ کفر سے نفرت کرو، کافر کی ذات سے نفرت نہ کرو۔ اور فاسق اور فاجر کو یہ سمجھو کہ یہ بیمار ہے۔ جب کوئی بیمار ہو جاتا ہے تو کیا اس بیمار سے نفرت کی جاتی ہے؟ نہیں، بلکہ بیماری سے نفرت کی جاتی ہے کہ اس کو بڑی خراب بیماری لگ گئی ہے، لیکن بیمار پر انسان ترس کھاتا ہے کہ یہ بیچارہ اس بیماری کے اندر مبتلا ہو گیا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی گناہ کے اندر مبتلا ہے، یا کسی برے کام کے اندر مبتلا ہے تو اس کے برے کام سے نفرت کرو، لیکن اس کی ذات پر ترس کھاؤ۔

☆ اصلاحی مجالس (۱/ ۳۱۷۔۳۳۹) (۱) انفاسِ عیسیٰ، ص: ۱۵۵

گناہ گار ترس کھانے کے لائق

میرے خسر صاحب (جناب بھائی شرافت اللہ صاحب) اللہ تعالیٰ ان کو عافیت اور سلامتی کے ساتھ رکھے۔ جب وہ کسی ایسے آدمی کا ذکر کرتے ہیں جو کسی گناہ یا برے کام میں مبتلا ہوتا ہے تو یوں کہتے ہیں، فلاں بیچارے بدعات میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اس کے لئے "بیچارے" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ شخص ترس کھانے کے لائق ہے، کیونکہ وہ بیماری کے اندر مبتلا ہے۔ لہٰذا اس کا عمل قابلِ نفرت ہے، لیکن اس کی ذات ترس کھانے کے لائق ہے۔ اور جب اس کی ذات ترس کھانے کے لائق ہے تو پھر اس کو اپنے سے کمتر سمجھنے کا کوئی جواز نہیں۔ اور بالخصوص اس نقطۂ نظر سے کہ شاید اللہ تعالیٰ اس کو اس گناہ سے بچنے کی توفیق عطا فرما دے، اور توبہ کی توفیق عطا فرما دے، اور اس کے نتیجے میں یہ کہیں سے کہیں پہنچ جائے، اور میں یہیں پڑا رہ جاؤں۔ اس لئے کسی کو اپنے سے کمتر نہ سمجھو۔

شیطان کس طرح راہ مارتا ہے

جن کو اللہ تعالیٰ دین سے وابستگی عطا فرما دیتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہماری طلب اور استحقاق کے بغیر، الحمدللہ ایسے حلقے سے وابستہ کر دیا جو دین سے تعلق رکھتا ہے، لیکن دین سے وابستگی رکھنے والے حضرات جب ان لوگوں کو دیکھتے ہیں جو دین سے وابستہ نہیں ہیں، بلکہ گناہوں کے اندر مبتلا ہیں، تو بسا اوقات ان کو دیکھ کر ان کی ذات سے نفرت پیدا ہونے لگتی ہے اور اپنی برتری کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے کہ ہم ان سے برتر ہیں۔ بس یہیں سے شیطان راہ مارتا ہے۔ اس لئے اس بات کو یاد رکھیں کہ کسی کی ذات سے نفرت نہ ہو، اگر نفرت ہو تو اس کے عمل سے ہو، اور اس عمل کی وجہ سے اس پر ترس کھاؤ، اور ترس کھانے کے باوجود یہ سوچو کہ کیا معلوم اللہ تعالیٰ اس کو توبہ کی توفیق دے دیں اور یہ ہم سے آگے نکل جائے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا اندازِ تربیت

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ایسی پیری نہیں تھی کہ اصلاح کے لئے آنے والوں کو بس وظیفے بتا دیے۔ اور اب وہ خانقاہ میں بیٹھے ہوئے وظیفے گھونٹ رہے ہیں، اور وظیفے پڑھنے کے نتیجے میں نفس اندر سے پھول رہا ہے، بلکہ جب کوئی شخص ان کے یہاں تربیت کرانے کے لئے آتا تو اس کی واقعی تربیت کی جاتی تھی، اور تربیت ہی کے لئے کبھی ڈانٹنے کی اور کبھی غصہ کرنے کی اور کبھی سزا دینے کی ضرورت بھی پیش آتی تھی۔ اسی وجہ سے حضرت والا سخت مشہور تھے، اور حضرت والا کے پاس جہاں

اہلِ علم وفہم اپنی اصلاح کے لئے آتے تھے، وہیں ایک سے ایک اکھڑ اور غیر تہذیب یافتہ آدمی بھی آتا تھا، اور حضرت ہر ایک کی اخلاقی تربیت کرتے تھے اور معاشرت و معاملات میں کسی قاعدے یا اصول کی خلاف ورزی پر روک ٹوک بھی فرماتے تھے، اس میں بھی ہر ایک کے ساتھ اسی کے انداز سے پیش آتے تھے۔

تم بیل ہو تو میں قصائی ہوں

چنانچہ ایک مرتبہ ایک دیہاتی آیا، اس نے کوئی خلافِ اصول بات کی، تو اس کو سمجھایا اور ڈانٹا، تو وہ دیہاتی کہنے لگا: اجی حضرت! ہم تو بیل ہیں۔ جواب میں حضرت نے فرمایا کہ میں بھی تو قصائی ہوں۔ اس طرح ہر ایک کے ساتھ علیحدہ معاملہ ہوتا تھا۔

ایک لطیفہ

ایک مرتبہ آپ حوض پر وضو فرما رہے تھے، اتنے میں ایک دیہاتی ایک بڑا سا تربوز لے کر آ گیا اور کہا: لے مولوی تیرے واسطے لایا ہوں، اس کو کہاں دھر دوں؟ حضرت والا نے وضو کرتے ہوئے فرمایا کہ "میرے سر پر دھر دے"۔ اس دیہاتی نے وہ تربوز اُٹھا کر آپ کے سر پر رکھ دیا۔ لوگ جلدی سے دوڑے کہ یہ کیا حرکت کر رہا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ غلطی میری ہے، میں نے ہی اس سے کہا تھا کہ سر پر دھر دے۔ ایسے ایسے لوگ آیا کرتے تھے۔ اس لئے ان کی تربیت کے لئے کبھی آپ غصہ بھی فرمایا کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ میرا فرض ہے کہ میں غصہ کروں، اس لئے کہ دیانت کا تقاضا یہی ہے، اگر یہ نہ کروں تو بددیانتی ہوگی اور امانت میں خیانت ہوگی۔

میری مثال

لیکن فرمایا کہ میں جب بھی کسی پر غصہ کر رہا ہوتا ہوں تو الحمدللہ ذہن سے کبھی یہ بات غائب نہیں ہوتی کہ میری مثال ایسی ہے جیسے کوئی بادشاہ جلاد کو حکم دے کہ شہزادے کو کوڑے مارو، اب وہ جلاد اس حکم پر شہزادے کو کوڑے لگائے گا، لیکن عین اس وقت بھی جس وقت وہ جلاد کوڑے لگا رہا ہوگا، اپنے آپ کو شہزادے سے افضل نہیں سمجھ سکتا۔ وہ جانتا ہے کہ یہ شہزادہ ہے اور میں جلاد ہوں، لیکن مارے گا اس لئے کہ بادشاہ کے حکم کی تعمیل کرنی ہے۔ الحمدللہ، میں جس وقت کسی کو ڈانٹ رہا ہوتا ہوں اور کسی کام پر کسی کا مؤاخذہ کر رہا ہوتا ہوں تو الحمدللہ اس بات کا استحضار رہتا ہے کہ یہ شہزادہ ہے اور میں جلاد ہوں، میں اس سے افضل نہیں ہوں۔

عین ڈانٹ ڈپٹ کے وقت دعا کرنا

دوسرے یہ کہ جس وقت ڈانٹ رہا ہوتا ہوں یا مؤاخذہ کر رہا ہوتا ہوں، اسی وقت دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتا رہتا ہوں کہ یا اللہ! مجھ سے ایسا مؤاخذہ نہ فرمائیے گا، آخرت میں میری اس طرح پکڑ نہ فرمائیے گا۔

اب دیکھئے! جو آدمی اس نیت سے ڈانٹ رہا ہو کہ منکر سے روکنا اور اس کی اصلاح کرنا ضروری ہے، اس کا ہمیں حکم ہے، اور ہر ڈانٹ پر اور ہر غصے پر ان دو باتوں کا استحضار رکھتا ہو، اس کا غصہ بھی عبادت نہیں تو اور کیا ہے۔ بہر حال، اس طرح یہ دونوں چیزیں جمع ہو جاتی ہیں کہ غصہ بھی ہو رہا ہے، برے عمل سے نفرت اور بغض بھی ہے، لیکن اپنے سے اس کو کمتر بھی نہیں سمجھ رہا ہے، اپنے کو اس سے افضل بھی نہیں سمجھ رہا ہے، لیکن یہ چیز مشق سے اور کسی کے آگے پامال ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل سے حاصل ہوتی ہے۔

سالکین کے کبر اور تواضع مفرط کا علاج

فرمایا کہ: کام کرنے والوں کو دین کا کام کرنے سے دو مرض پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک کبر اور دوسرا تواضع مفرط، کبر تو یہ ہے کہ وظیفہ پڑھ کر اپنے اوپر نگاہ کرنے لگے، نماز پڑھ کر بے نمازیوں کو حقیر سمجھنے لگے۔ اس کا علاج یہ سمجھنا ہے کہ تکبر کی وجہ سے بڑے بڑے عابدوں کے قدم توڑ دیے گئے ہیں کہ منزلِ مقصود تک نہ پہنچ سکے، شیطان اور بلعم باعور کی حکایت اس کی نظیر ہے۔ ”تواضع مفرط“ یہ ہے کہ اس حد تک تواضع کرے کہ اپنے عمالِ صالحہ کی بے قدری کرنے لگے، مثلاً اس طرح کہ اگرچہ ہم نماز پڑھتے ہیں مگر اس میں خشوع تو ہے نہیں، ذکر کرتے ہیں مگر انوار بالکل نہیں، گویا کہ در پردہ خدا کی شکایت کر رہے ہیں۔ اس کا علاج یہ کہنا ہے کہ اے اللہ! آپ کا شکر ہے، کہ آپ نے ہم کو ذکر د نماز کی توفیق دی، ورنہ ہماری کیا مجال تھی جو آپ کی بندگی کر لیتے۔

دین کے راستے سے بہکانا

اس ملفوظ میں حضرت والا نے دو متضاد قسم کی بیماریوں کا ذکر فرمایا ہے۔ جو لوگ دین کے کام میں لگتے ہیں، شیطان ان کو دین کے ذریعہ بہکاتا ہے، شیطان کی اول کوشش تو یہ ہوتی ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ دین کے کام میں لگے ہی نہیں۔ بلکہ اس بندے کو نفسانی لذتوں اور معصیتوں میں اس طرح پھنسایا جائے کہ دین کے کسی کام کی طرف اس کی توجہ ہی نہ ہو، نہ نماز کی طرف اس کی توجہ ہو، نہ روزے کی

طرف، نہ زکوۃ اور حج کی طرف اس کی توجہ ہو، بلکہ نفسانیت کے اندر پھنسا رہے۔ اور اگر کوئی شخص دین کے کام میں لگ ہی گیا ہے تو اب اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ دین کا کام کر رہا ہے، اس کو برباد کر دوں، چنانچہ شیطان اس کو برباد کرنے کے لئے مختلف طریقے اختیار کرتا ہے، ان طریقوں میں سے دو طریقوں کا حضرت والا نے اس ملفوظ میں ذکر فرمایا ہے۔

تکبر کے ذریعہ بہکانا

پہلا طریقہ یہ ہے کہ شیطان دین کا کام کرنے والے کے دل میں کبر، عجب اور خود پسندی کے خیالات ڈالتا ہے۔ مثلاً اس سے یہ کہتا ہے کہ دیکھ! تو بہت پہنچا ہوا آدمی بن گیا ہے، تو بڑے خشوع اور خضوع سے نماز پڑھنے لگا ہے، تو نماز اور جماعت کا پابند ہو گیا ہے، بہت سے لوگ نماز نہیں پڑھتے اور فسق و فجور کے اندر مبتلا ہیں۔ اس کے نتیجے میں اپنی بڑائی اور بے نمازیوں کی حقارت دل میں آجاتی ہے۔ جو انسان بے ظرف ہوتا ہے، جب وہ ذرا نماز کی پابندی کرنے لگتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف ذرا رجوع کرتا ہے تو پھر اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھنے لگتا ہے۔

جولاہے کی مثال

عربی کی ایک مثل ہے:

"صَلَّی الحَائِکُ رَکْعَتَیْنِ وَانتَظَرَ الوَحْیَ"

ایک مرتبہ ایک جولاہے نے دو رکعت نماز پڑھیں اور نماز کے بعد وحی کا انتظار شروع کر دیا کہ اب میرے اوپر وحی آئے گی۔ یہ ہم لوگوں کا حال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ذرا سی عبادت کی توفیق ہو گئی تو بس دماغ عرش معلّٰی پر پہنچ گیا کہ ہم بڑے عابد، زاہد، متقی اور پارسا ہو گئے ہیں۔ یہ کبر ہے۔ اس کے علاج کے لئے حضرت والا فرماتے ہیں:

""اس کا علاج یہ سوچنا ہے کہ "تکبر" کی وجہ سے بڑے بڑے عابدوں کے قدم توڑ دیے گئے ہیں کہ منزلِ مقصود تک نہ پہنچ سکے۔ شیطان اور "بلعم باعور" کی حکایت اس کی نظیر ہے۔""

یعنی آدمی یہ سوچے کہ اگر میں نے تکبر کیا تو اس کے نتیجے میں یہ سب عمل جو میں کر رہا ہوں، یہ سب اکارت ہو جائے گا۔ اس کی نظیر "شیطان" ہے، اس لئے کہ شیطان پہلے بڑی عبادت کرتا تھا، یہاں تک کہ اس کا لقب "طاؤس الملائکہ" (فرشتوں کا مور) پڑ گیا تھا، لیکن اس عبادت کے نتیجے میں دماغ میں خلل اور تکبر آ گیا، چنانچہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تو اس نے انکار کر دیا، اور یہ عقلی دلیل پیش کی کہ اس کو آپ نے مٹی سے پیدا کیا اور مجھے آگ سے پیدا کیا، لہٰذا

میں اس سے افضل ہوں تو میں اس کو سجدہ کیوں کروں؟ بہر حال، اس تکبر کے نتیجے میں وہ راندۂ درگاہ ہوگیا۔ العیاذ باللہ۔

بلعم باعور کا قصہ

دوسری نظیر ''بلعم باعور'' کی بیان فرمائی، ''بلعم باعور'' حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ایک شخص گزرا ہے، یہ بڑا عابد وزاہد شخص تھا، بلکہ ''مستجاب الدعوۃ'' تھا، یعنی جو دعا کرتا وہ فوراً قبول ہو جاتی تھی۔ چنانچہ لوگ اس کے پاس آکر اس سے دعائیں کرایا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ مقام عطا فرمایا تھا۔ یہ ''عمالقہ'' کے علاقے میں رہتا تھا، چونکہ اس علاقے کے لوگ کافر تھے، اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا، جب علاقے کے کافروں کو پتہ چلا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حملہ کرنے والے ہیں تو وہ لوگ ''بلعم باعور'' کے پاس گئے، اور جاکر اس سے کہا کہ تم بڑے عابد وزاہد ہو، اللہ تعالیٰ تمہاری دعائیں قبول فرماتے ہیں، آپ یہ دعا کریں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لشکر کو شکست ہو جائے اور ہم پر فتح نہ پاسکے۔

بلعم باعور نے کہا کہ میں یہ دعا تو نہیں کرسکتا، اس لئے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر ہیں، اور جو لوگ لشکر میں ان کے ساتھ ہیں وہ سب صاحبِ ایمان ہیں، میں ان کے حق میں شکست کی دعا تو نہیں کرسکتا۔ انہوں نے اصرار کیا کہ آپ ضرور دعا کریں۔ تو اس نے کہا کہ اچھا! میں اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرتا ہوں۔ چنانچہ استخارہ کیا، اور استخارہ میں یہی جواب آیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں، تم ان کے حق میں کیسے بددعا کروگے؟ چنانچہ اس نے لوگوں کو جواب دے دیا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے استخارہ کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے بددعا کرنے سے منع فرمادیا۔

وہ لوگ دوسرے دن پھر اس کے پاس پہنچے، اور اس کے لئے رشوت کے طور پر کچھ ہدیے تحفے بھی لے گئے، اور اس سے کہا کہ یہ ہدیہ تحفہ لے لو اور دعا کردو۔ اب اس عابد کو چاہئے تو یہ تھا کہ جب استخارہ کے ذریعہ یہ بات معلوم ہوگئی تھی کہ اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہیں ہے، تو بس ان سے انکار کردیتا اور قصہ ختم ہو جاتا، لیکن جب ہدیہ تحفہ پہنچا تو ایک مرتبہ پھر استخارہ کرنے کی بات دماغ میں آگئی۔ چنانچہ ان سے کہا کہ اچھا میں ایک مرتبہ اور استخارہ کرلوں، جب دوبارہ استخارہ کیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا، تو اس نے لوگوں سے منع کردیا کہ میں دعا نہیں کرتا۔ ان لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے جو استخارہ کیا تھا، اس کا کیا جواب آیا؟ اس نے کہا کہ جواب میں کچھ نہیں آیا۔ ان لوگوں نے کہا کہ بس پھر تو کام ہوگیا، اگر اللہ تعالیٰ کو آپ کو روکنے کی مرضی ہوتی تو اللہ تعالیٰ آپ کو منع کردیتے، جب منع نہیں کیا اور جواب نہیں آیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو اجازت مل گئی۔ یہ تاویل قوم نے بھی کرلی

اور اس کے ساتھ اس عابد نے بھی کر لی، اور بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کی ہلاکت کی بددعا کردی۔العیاذ باللہ۔

چونکہ یہ بددعا ایک نبی کے بارے میں تھی، اس لئے قبول تو نہیں ہوئی، البتہ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بعد میں کئی سال تک میدانِ تیہ میں پھرتے رہے، یہ "بلعم باعور" کی دعا کا نتیجہ تھا۔ پھر اس عابد نے قوم سے کہا کہ میں نے تمہارے کہنے سے دعا تو کردی تھی مگر اللہ تعالیٰ قبول نہیں کریں گے، کیونکہ میں نے پہلے ہی استخارہ کرلیا تھا۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ آپ نے جو گناہ کرنا تھا وہ تو کرلیا، اور اب دعا بھی قبول نہیں ہورہی ہے، اب کوئی ایسی تدبیر بتاؤ کہ موسیٰ علیہ السلام اور ان کے لشکر کو بربادی کا سامنا کرنا ہی پڑے۔

اب اس عابد نے غور کرنے کے بعد کہا کہ اب میں ایسی تدبیر بتاتا ہوں جس کے نتیجے میں یہ لوگ خود اپنے آپ کو ہلاک کردیں گے۔ وہ یہ کہ تم اپنی قوم کی نوجوان لڑکیوں کو تیار کرو اور ان کو بنا سنوار کر ان کے لشکر کے اندر داخل کردو، اس لئے کہ یہ لوگ کافی عرصے سے اپنے گھروں سے نکلے ہوئے ہیں۔ جب لڑکیاں ان کے پاس پہنچیں گی تو ان میں سے کوئی نہ کوئی گناہ میں مبتلا ہوجائے گا۔ جب یہ گناہ میں مبتلا ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر عذاب آجائے گا، اس طرح تم ان کو ہلاک کرسکتے ہو۔ چنانچہ ان لوگوں نے ایسا ہی کیا، اور نوجوان لڑکیاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لشکر میں داخل کردیں، جس کے نتیجے میں بعض لوگ گناہ میں مبتلا ہوئے۔ بلکہ واقعات میں لکھا ہے کہ عمالقہ کی شہزادی بنی اسرائیل کے ایک بڑے سردار کے پاس پہنچ گئی۔ وہ سردار اس شہزادی کو لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور ان سے پوچھا کہ کیا یہ شہزادی میرے اوپر حرام ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ہاں! یہ تم پر حرام ہے۔ اس نے کہا کہ حرام ہونے کے باوجود میں اس کو آج اپنے ساتھ لے جاؤں گا ــــ چنانچہ وہ اس کو لے گیا اور پھر اس کے ساتھ بدعملی میں مبتلا ہوا۔ اس کے بعد حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں سے کسی نے جا کر ان دونوں کو نیزے سے قتل کردیا۔ اس واقعے کے بعد اس بدعملی کے عذاب کے طور پر بنی اسرائیل کے اندر "طاعون" کی بیماری پھوٹی۔ چنانچہ حدیث شریف میں بھی آیا ہے کہ:

((إِنَّهُ بَقِيَّةُ رِجْزٍ أُرْسِلَ إِلَى بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ))

"یہ طاعون اس عذاب کا بقیہ حصہ ہے جو بنی اسرائیل کی طرف بھیجا گیا تھا"(۱)

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب أحاديث الأنبياء، باب حديث الغار، رقم: ٣٢١٤، صحيح مسلم، كتاب السلام، رقم: ٤١٠٨، سنن الترمذي، كتاب الجنائز عَنْ رسول الله، رقم: ٩٨٥، مسند أحمد، رقم: ٢٠٧٥٦۔

یہ سب کچھ ''بلعم باعور'' کی تجویز کی بنا پر ہوا۔ اس نے عمالقہ کو یہ حیلہ سکھایا تھا۔ اب دیکھئے کہ وہ بلعم باعور جو اتنا بڑا عابد، عالم اور مستجاب الدعوۃ تھا، لیکن جب اس کا دل پھرا تو اس انجام کو پہنچا جس کا ذکر ان آیاتِ قرآنی میں ہے:

﴿وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَأَتْبَعَهُ الشَّيْطَانُ فَكَانَ مِنَ الْغَاوِينَ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَـٰكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ إِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ﴾(۱)

''ان لوگوں کو اس شخص کا حال پڑھ کر سنایئے، جس کو ہم نے اپنی آیتیں دیں، پھر وہ ان سے بالکل نکل گیا، پھر شیطان اس کے پیچھے لگ گیا سو وہ گمراہ لوگوں میں داخل ہو گیا، اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیتوں کی بدولت بلند مرتبہ کر دیتے، لیکن وہ تو دنیا کی طرف مائل ہو گیا، اور اپنی نفسانی خواہش کی پیروی کرنے لگا، سو اس کی حالت کتے جیسی ہو گئی کہ اگر تو اس پر حملہ کرے تب بھی ہانپے، یا اس کو چھوڑے تب بھی ہانپے''

دل کب پلٹتے جاتے ہیں؟

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ ''بلعم باعور'' کی حکایت اس کی نظیر ہے۔ حالانکہ وہ اتنا بڑا عالم اور عابد اور مستجاب الدعوۃ تھا، اور لوگ اس کے پاس جا کر اپنے لئے دعائیں کراتے تھے، لیکن اس کا یہ انجام ہوا۔ دل پلٹتے دیر نہیں لگتی، لیکن اللہ تعالیٰ ظلمت کی طرف کسی کا دل ویسے ہی نہیں پلٹ دیتے کہ اچانک بیٹھے بیٹھے ایک مسلمان کافر بن جائے، بلکہ اس شخص کی حرکتیں ایسی ہوتی ہیں جس کی بنیاد پر دل پلٹے جاتے ہیں۔ وہ حرکت یہ ہوتی ہے کہ اپنی عبادت پر گھمنڈ ہو گیا اور تکبر ہو گیا۔ اور تکبر کے نتیجے میں بڑوں بڑوں کے قدم توڑ دیئے گئے۔

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک حکایت

حضرت شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ایک حکایت لکھی ہے۔ یہ بڑے درجہ کے اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ ایک مرتبہ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تہجد پڑھ رہے تھے، اس دوران انہوں نے دیکھا کہ ایک نور چمکا، اور پوری فضا منور ہو گئی، اور اس نور میں سے آواز آئی:

---

(۱) الاعراف: ۱۷۵-۱۷۶

''اے عبدالقادر! تو نے ہماری عبادت کا حق ادا کردیا، جو عبادت اب تک تم نے ادا کرلی وہ کافی ہے، آج کے بعد تم پر نماز فرض نہیں، روزہ فرض نہیں، تمام عبادات کی تکلیف تم سے اُٹھالی گئی''

یہ آواز نور میں سے آئی، گویا کہ اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ تیری عبادتیں اس درجہ میں قبول ہوگئیں کہ آئندہ کے لئے تجھے عبادتوں سے فارغ کردیا گیا۔ حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے جب یہ نور دیکھا اور یہ آواز سنی تو فوراً جواب میں فرمایا:

''کمبخت! دور ہو، مجھے دھوکہ دیتا ہے، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے تو عبادتیں معاف نہیں ہوئیں اور ان پر سے عبادتوں کی تکلیف ختم نہیں ہوئی، مجھ سے ختم ہوجائے گی؟ تو مجھے دھوکہ دینا چاہتا ہے؟''

دیکھئے: شیطان نے کتنا بڑا وار کیا، اگر ان کے دل میں عبادت کا ناز آجاتا تو وہیں پھسل جاتے۔ جو لوگ کشف و کرامات کے پیچھے بہت پڑے رہتے ہیں، ان کو ختم کرنے کے لئے تو شیطان کا یہ بہترین وار تھا، لیکن شیخ تو شیخ تھے، فوراً سمجھ گئے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوسکتی، اس لئے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر سے تو عبادت کی تکلیف ختم نہیں ہوئی، میرے اوپر سے کیسے ختم ہوجائے گی؟

شیطان کا دوسرا حملہ

تھوڑی دیر کے بعد پھر ایک اور نور چمکا اور فضا منور ہوئی اور اس نور میں سے آواز آئی:

''اے عبدالقادر! آج تیرے علم نے تجھے بچالیا، ورنہ میں نے نہ جانے کتنے عابدوں کو اس وار کے ذریعہ تباہ کردیا''

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے دوبارہ فرمایا:

''کمبخت! دوبارہ مجھے دھوکہ دیتا ہے، میرے علم نے مجھے نہیں بچایا، مجھے اللہ کے فضل نے بچایا ہے''

یہ دوسرا حملہ پہلے حملے سے زیادہ خطرناک اور اس سے زیادہ سنگین تھا، کیونکہ اس کے ذریعہ ان کے اندر علم کی بڑائی اور اس کا ناز پیدا کرنا چاہتا تھا۔

دوسرے حملے کی سنگینی

حضرت شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ پہلا حملہ اتنا

سنگین نہیں تھا، کیونکہ جس شخص کے پاس ذرا بھی شریعت کا علم ہو، وہ اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ زندگی میں ہوش حواس کی حالت میں کسی انسان سے عبادات معاف نہیں ہوسکتیں، لیکن یہ دوسرا حملہ بڑا سنگین تھا، نہ جانے کتنے لوگ اس حملے میں بہک گئے، اس لئے کہ اس میں اپنے علم پر ناز پیدا کرنا مقصود تھا اور یہ باریک بات ہے۔

دل سے گھمنڈ نکال دو

اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس تکبر کا علاج یہ ہے کہ آدمی یہ سوچتا رہے کہ کیسے کیسے بڑے صاحبانِ علم، صاحبانِ معرفت، عبادت گزار، متقی اور پارسا بھی جب گھمنڈ میں مبتلا ہوئے تو ان کا انجام کیا ہوا۔ العیاذ باللہ۔ لہٰذا دل سے گھمنڈ کو نکالو، اگر تم دین کے راستے میں لگے ہوئے ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ خلقِ خدا کی تحقیر میں لگ جاؤ اور ساری دنیا کی مخلوق کو جہنمی سمجھنے لگو۔ ایک حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ قَالَ هَلَكَ النَّاسُ فَهُوَ اَهْلَكُهُمْ))(۱)

جو شخص یہ کہے کہ ساری دنیا تباہ ہوگئی تو سب سے زیادہ تباہ وہ کہنے والا شخص ہے۔ جس شخص کو اپنے عیوب نہیں نظر آرہے ہیں، اور ساری دنیا کے عیوب تلاش کرتا پھر رہا ہے، ان کی تحقیر کر رہا ہے، تو وہ شخص سب سے زیادہ تباہ اور سب سے زیادہ برباد ہے۔

تکبر کا علاج، رجوع الی اللہ

لہٰذا جب کبھی دل میں اپنی عبادت کا، اپنے علم کا، اپنے زہد کا، اپنے صدقہ خیرات کا خیال آنے لگے تو فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو، اور کہو کہ یا اللہ! آپ کی دی ہوئی توفیق کے نتیجے میں میں نے یہ کام انجام دیا، میں اس پر آپ کا شکر ادا کرتا ہوں، یہ کام کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ اور شیطان کے شر سے پناہ صرف رجوع الی اللہ میں ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے عیوب کا استحضار کرو، جب دونوں چیزیں یعنی رجوع الی اللہ اور اپنے عیوب کا استحضار جمع ہو جائیں گی تو پھر تکبر پیدا نہیں ہونے دیں گی۔

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب النهی عَنْ قول هلك الناس، رقم: ٤٧٥٥، سنن أبی داود، کتاب الأدب، باب لا يقَالَ خبثت نفسی، رقم: ٤٣٣١، مسند أحمد، رقم: ٧٣٦٠، الموطا الإمام مالك، الكتاب الجامع، باب ما يكره من الكلام، رقم: ١٥٥٩

''تواضع مفرط'' کا پیدا ہونا

بہر حال، اس ملفوظ میں حضرت والا نے فرمایا کہ دین کا کام کرنے والوں میں ایک تکبر پیدا ہو جاتا ہے۔ اور بعض اوقات اس کے بالکل اُلٹ چیز یعنی ''تواضع مفرط'' (حد سے بڑھی ہوئی تواضع) پیدا ہو جاتی ہے۔ تواضع اچھی چیز ہے، لیکن یہ بھی اپنی حد کے اندر ہونی چاہئے، اگر حد سے آگے بڑھ جائے تو یہ بھی مضر ہے۔

''تواضع مفرط'' کا ایک قصہ

اس بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے وعظ میں اپنے سامنے کا ایک قصہ بیان فرمایا ہے کہ ایک مرتبہ میں ریل میں سفر کر رہا تھا، کچھ اور لوگ بھی میرے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ جب کھانے کا وقت آیا تو انہوں نے اپنا کھانا نکالا اور دستر خوان بچھایا، اور ساتھیوں کو جمع کر کے کھانا شروع کیا، تو جس طرح تواضعاً ہم کہتے ہیں کہ آیئے! دال روٹی آپ بھی کھا لیجئے، اسی طرح انہوں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے شخص سے تواضعاً کہا کہ کچھ گوہ موت آپ بھی کھا لیجئے''، انہوں نے تواضعاً اپنے کھانے کو گوہ موت کہہ دیا۔ العیاذ باللہ۔ تو اللہ تعالیٰ کے رزق کو گوہ موت کہنا یہ 'تواضع مفرط' ہے، اس لئے کہ تواضع کے نتیجے میں ایسا عمل کرنا جس سے اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری اور توہین اور تحقیر ہو جائے، یہ بری بات ہے، اور یہ تواضع کا حد سے بڑھ جانا ناشکری ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر اعتراض ہے۔ اس لئے یہ بڑی خطرناک بات ہے۔

اپنی نماز کو ''ٹکریں مارنا'' مت کہو

یہی تواضع مفرط انسان کو یاس تک پہنچا دیتی ہے اور انسان کے اندر مایوسی پیدا کر دیتی ہے۔ جیسے آپ نے لوگوں سے یہ جملہ سنا ہوگا کہ ارے ہماری نماز کیا ہے، ہم تو ٹکریں مارتے ہیں۔ اب نماز کو ''ٹکریں مارنے'' سے تعبیر کرنا ''تواضع مفرط'' ہے۔ ایسا نہیں کرنا چاہئے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی توفیق پر شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے اپنی بارگاہ میں حاضری کی توفیق دی۔ نہ جانے کتنے لوگ ایسے ہیں جن کو بارگاہ میں حاضری کی بھی توفیق نہیں ملی، اس لئے کیوں اس نماز کی ناقدری اور ناشکری کرتے ہو؟ یہ ٹھیک ہے کہ تمہاری نماز میں بہت ساری کوتاہیاں بھی ہیں، لیکن وہ کوتاہیاں تمہاری ہیں، اور توفیق ان کی ہے، لہٰذا پہلے توفیق پر شکر ادا کرو، اور پھر کوتاہیوں پر استغفار کر لو۔ اللہ تعالیٰ سے کہو کہ یا اللہ! آپ نے مجھے نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمائی تھی، لیکن میں نے اس نماز کا حق ادا نہیں کیا۔ استغفر اللہ۔ لہٰذا

پہلے اس عبادت کی توفیق پر شکر ادا کرو اور پھر اپنی کوتاہی پر استغفار کرو، یہ نہ کہو کہ ہماری نماز تو ٹکریں مارنا ہے، یہ بات کہنا کسی طرح بھی درست نہیں۔

کوتاہیوں پر استغفار کرو

اور جب تم اپنی کوتاہی پر استغفار کرو گے تو جس نے اس عبادت کے کرنے کی توفیق دی ہے وہ تمہارے استغفار کو قبول کر کے اس عبادت میں کمال بھی عطا فرما دے گا انشاء اللہ۔ ارے کوئی آدمی بھی ایسا ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حق ادا کر سکے؟ ہم اور تم تو کس شمار میں ہیں، نبی کریم ﷺ جن کے پاؤں رات کو تہجد کی نماز میں کھڑے کھڑے سوج رہے ہیں، وہ یہ فرما رہے ہیں:

((مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ مَاعَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ)) (۱)

ہم آپ کی عبادت کا حق ادا نہیں کر سکے، جب وہ یہ فرما رہے ہیں تو ہم کیسے اس کی عبادت کا حق ادا کر سکتے ہیں۔ ارے! ہماری تو ہر عبادت ان کی نسبت سے ناقص ہی رہے گی۔ لیکن جب انہوں نے اپنے در پر آنے کی توفیق دی، اپنے آستانے پر سجدہ کرنے کی توفیق دی، تو پھر اس سے یہ کیسی بدگمانی کرتے ہو کہ وہ یہ سجدہ قبول نہیں فرمائیں گے، اور کیسے تم اس سجدہ کی ناقدری کرتے ہوئے کہتے ہو کہ یہ گندہ سجدہ ہے۔ جب تم اس کی دی ہوئی توفیق پر شکر ادا کرنے کے بعد استغفار کرو گے اور یہ کہو گے کہ یا اللہ! اس عبادت میں جو کوتاہی ہوئی ہے، اپنی رحمت سے اس کو معاف فرما دیجئے، تو یقیناً اللہ تعالیٰ ان کوتاہیوں کو ضرور معاف فرمائیں گے۔

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے جب کوئی آکر یہ کہتا کہ میں نماز کیا پڑھتا ہوں، بس ٹکریں مارتا ہوں، تو آپ کو ان باتوں سے بہت توحش ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک صاحب نے آکر حضرت والا سے عرض کیا کہ حضرت! میری نماز کیا، میرا سجدہ کیا، جب میں سجدہ کرتا ہوں تو اس میں گندے گندے شہوانی اور نفسانی خیالات آتے ہیں، میری یہ نماز تو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرنے کے لائق بھی نہیں ہے۔ حضرت والا نے جواب میں فرمایا کہ اچھا یہ تمہارا سجدہ جو نفسانی اور شہوانی خیالات والا ہے، یہ تو بڑا گندہ سجدہ ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ ہاں! بالکل گندہ سجدہ ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اچھا یہ گندہ سجدہ تم مجھے کرو، کیونکہ یہ شہوانی اور نفسانی خیالات والا سجدہ اللہ تعالیٰ کے سامنے

(۱) مستدرك الحاكم، كتاب معرفة الصحابة، ومن مناقب عمر بن الخطاب، رقم: ۱۵۰۲، شعب الإيمان، رقم: ۱٦٦

کرنے کے لائق تو نہیں ہے، لہٰذا یہ سجدہ اللہ میاں کے بجائے تم مجھے کرو۔ انہوں نے کہا کہ حضرت! یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔ میں آپ کو سجدہ کروں؟ حضرت نے فرمایا کہ جب یہ گندہ سجدہ ہے، اور اللہ میاں کو کرنے کے لائق نہیں ہے تو مجھے کر کے دیکھ لو۔ انہوں نے کہا کہ حضرت! یہ نہیں ہوسکتا، میں یہ سجدہ کسی اور کو نہیں کرسکتا۔ حضرت نے فرمایا کہ جب یہ سجدہ کہیں اور نہیں ہوسکتا تو اس سے معلوم ہوا کہ یہ سجدہ انہی کے لئے ہے، یہ پیشانی کہیں اور ٹک نہیں سکتی، یہ سجدہ کہیں اور ہو نہیں سکتا، یہ سر کسی اور آستانے پر جھک نہیں سکتا، یہ سجدہ تو انہی کے لئے ہے اور ان کی توفیق سے ہے۔ البتہ ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے اس سجدے میں خرابیاں داخل ہوگئی ہیں، اس کی طرف سے استغفار کرلو، لیکن یہ پیشانی وہیں ٹکے گی۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ۔

قبول ہو کہ نہ ہو پھر بھی ایک نعمت ہے
وہ سجدہ جس کو تیرے آستاں سے نسبت ہے

یہ سجدہ معمولی چیز نہیں۔ لہٰذا اس سجدے کے بارے میں جو اُلٹی سیدھی باتیں کرتے ہو، ان کو چھوڑ دو اور اللہ جل شانہ کی توفیق پر شکر ادا کرو۔

عبادات چھڑانے کا طریقہ

ہوتا یہ ہے کہ شیطان ''تواضع مفرط'' پیدا کر کے اس کی راہ مارتا ہے اور اس کے دل میں یہ خیال ڈالتا ہے کہ میں تکبر کی بیماری میں تو مبتلا نہیں ہوں، اس لئے کہ میں تو اپنی نماز کو کچھ سمجھتا ہی نہیں ہوں، اور ساتھ میں تواضع بھی اختیار کر رہا ہوں۔ لیکن یہ خیالات جب زیادہ ہو جاتے ہیں تو رفتہ رفتہ اس کے دل میں مایوسی پیدا کر دیتا ہے کہ یہ عبادت کرنا تیرے بس کی بات نہیں، تیری نماز کبھی قبول نہیں ہوسکتی، جب قبول ہی نہیں ہوگی تو پھر پڑھنے سے کیا فائدہ؟ لہٰذا چلو چھوڑ دو اور گھر بیٹھو۔ اس طرح یہ شیطان نماز چھڑا دیتا ہے۔

عبادات پر شکر ادا کرو

خوب یاد رکھو! جب بھی اللہ تعالیٰ کسی عمل کو کرنے کی توفیق دے، اس پر شکر ادا کرو، اور شکر ادا کرنے کے ساتھ ساتھ یہ کہو کہ یا اللہ! آپ ہی کی توفیق سے میں نے یہ عبادت انجام دی، البتہ اس میں میری طرف سے جو کوتاہیاں شامل ہوگئی ہیں، اپنی رحمت سے ان کو معاف فرما دیجئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرمایا کرتے تھے:

لَوْ لَا اللّٰهُ مَا اهْتَدَيْنَا
وَ لَا تَصَدَّقْنَا وَ لَا صَلَّيْنَا (۱)

اے اللہ! اگر آپ کی توفیق نہ ہوتی تو ہمیں ہدایت نہ ملتی، اور اگر آپ کی توفیق نہ ہوتی تو ہم نہ صدقہ دے سکتے تھے اور نہ نماز پڑھ سکتے تھے۔ جو کچھ ہے وہ آپ کی توفیق سے ہے۔ اس لئے ہم اس توفیق پر شکر ادا کرتے ہیں، اور اپنی کوتاہیوں سے استغفار کرتے ہیں۔ بس! اگر یہ دو باتیں پلے باندھ لو گے تو نہ کبر پیدا ہوگا اور نہ تواضع مفرط پیدا ہوگی، جو شیطان کے دو ہتھیار ہیں۔

شیطان کی کمر توڑنے والے الفاظ

میں نے اپنے شیخ سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا یہ مقولہ سنا کہ ''جو شخص کوئی بھی نیک عمل کرنے کے بعد یہ الفاظ کہہ دے:

''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، اَسْتَغْفِرُ اللّٰه''(۲)

تو شیطان یہ الفاظ سن کر کہتا ہے کہ اس نے میری کمر توڑ دی۔ کیونکہ ''الحمدللہ'' کہنے سے توفیق پر شکر ادا ہو گیا تو اس سے کبر کی جڑ کٹ گئی، اور ''استغفر اللہ'' کہنے سے یہ ہوا کہ تواضع مفرط کے نتیجے میں جن کوتاہیوں پر نظر ہو رہی تھی، ان کی جڑ کٹ گئی، دونوں کا علاج ہو گیا۔ اس لئے ہر نماز کے بعد اور ہر نیک عمل کے بعد کہو ''الحمدللہ، استغفر اللہ''، اور یہ الفاظ کہتے وقت یہ کہو کہ یا اللہ! آپ نے مجھے نیک عمل کرنے کی توفیق دی، اس پر میں ''الحمدللہ'' کہہ رہا ہوں، اور اس عمل میں میری طرف سے جو کوتاہیاں ہوئیں اس میں میں ''استغفر اللہ'' کہہ رہا ہوں کہ اے اللہ! مجھے معاف فرما دیجئے۔ ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ ہائے ہائے کرنے کی ضرورت نہیں، بس جو بھی عبادت کرو، اس کے بعد یہ پڑھ لو، انشاء اللہ شیطان کے عمل سے محفوظ رہو گے۔

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

(۱) صحيح البخارى، كتاب الجهاد والسير، باب حفر الخندق، رقم: ۲٦۲٥، صحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير، رقم: ۳۳٦٥، مسند أحمد، رقم: ۱۷۷٥٥

(۲) سنن الترمذى، كتاب الصلاة، باب ما جاء فى الصلاة عَنْ د التوبة، رقم: ۳۷۱، سنن أبى داؤد، كتاب الصلاة، باب فى الاستغفار، رقم: ۱۳۰۰، سنن ابن ماجه، كتاب امامة الصلاة والسنة فيها، باب ما جاء فى الصلاة كفارة، رقم: ۱۳۸٥

بڑوں کی اطاعت

اور

ادب کے تقاضے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

عَنْ اَبِی الْعَبَّاسِ سَهْلِ بْنِ سَعْدِ نِ السَّاعِدِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلَغَهُ، اَنَّ بَنِیْ عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ كَانَ بَيْنَهُمْ شَرٌّ فَخَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصْلِحُ بَيْنَهُمْ فِیْ اُنَاسٍ مَّعَهُ فَجَلَسَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَحَانَتِ الصَّلٰوةُ......(۱)

"باب الاصلاح بين الناس" لوگوں کے درمیان صلح کرانے کے بیان میں چل رہا ہے اور اس باب کی تین حدیثیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ اور یہ اس باب کی آخری حدیث ہے۔ جو ذرا طویل ہے، اس لئے اس کا ترجمہ اور تشریح عرض کیے دیتا ہوں۔

لوگوں کے درمیان صلح کرانا

حضرت سہل بن سعد الساعدی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع ملی کہ قبیلہ بنی عمرو بن عوف کے درمیان آپس میں جھگڑا کھڑا ہوگیا ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان مصالحت کرانے کے لئے تشریف لے گئے۔ اور بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی آپ نے ساتھ لے لیا، تاکہ اس مصالحت میں وہ مدد دیں۔ مصالحت کرانے کے دوران بات لمبی ہوگئی۔ اور اتنی دیر ہوگئی کہ نماز کا وقت آگیا، یعنی وہ وقت آگیا جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں نماز پڑھایا کرتے تھے، لیکن چونکہ آپ ابھی تک فارغ نہیں ہوئے تھے اس لئے آپ مسجد نبوی میں تشریف نہ لا سکے۔

☆ اصلاحی خطبات (۳/۲۲۲ تا ۲۳۴)، ۷ فروری ۱۹۹۲ء، بروز جمعہ بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) صحيح البخاری، كتاب الجمعة، باب الاشارة فی الصلاة، رقم: ۱۱۵۸، سنن النسائی، كتاب الامامة، باب اذا تقدم الرجل من الرعية ثم جاء الوالی هل يتأخر، رقم: ۷۷۶

یہاں اس حدیث کو لانے کا منشا یہی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے لوگوں کے درمیان جھگڑے کو ختم کرانے اور مصالحت کرانے کو اتنی اہمیت دی اور اس میں اتنے مصروف ہوئے کہ نماز کا مقرر وقت آ گیا، اور آپ مسجد نبوی میں تشریف نہ لا سکے۔

راوی فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس ﷺ کے مؤذن حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے جب یہ دیکھا کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے، اور حضورِ اقدس ﷺ تشریف نہیں لائے تو وہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے، اور ان سے جا کر عرض کیا کہ جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ! آنحضرت ﷺ کو دیر ہو گئی ہے، اور نماز کا وقت آ گیا ہے، ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو مزید کچھ دیر ہو جائے، اور لوگ نماز کے انتظار میں ہیں، کیا یہ ہو سکتا ہے کہ آپ امامت کرا دیں؟ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو ایسا کر سکتے ہیں، ہم نماز پڑھ لیتے ہیں۔ حضور ﷺ کو دیر ہو گئی ہو گی۔ اس کے بعد حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے تکبیر کہی، اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ امامت کے لئے آگے بڑھ گئے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے نماز شروع کرنے کے لئے ''اللہ اکبر'' کہا اور لوگوں نے تکبیر کہی۔ جب نماز شروع کر دی تو نماز کے دوران حضور نبی کریم ﷺ تشریف لے آئے، اور صف میں ایک جگہ پر مقتدی کی حیثیت سے کھڑے ہو گئے۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ حضورِ اقدس ﷺ تشریف لے آئے ہیں اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو آپ کے آنے کے بارے میں پتہ نہیں ہے، اس لئے کہ وہ آگے امامت کر رہے ہیں تو لوگوں کو خیال ہوا کہ اب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو علم ہو جانا چاہئے کہ حضورِ اقدس ﷺ تشریف لا چکے ہیں، تاکہ وہ پیچھے ہٹ جائیں، اور آنحضرت ﷺ آگے ہو کر نماز پڑھائیں اور چونکہ اس وقت لوگوں کو مسئلہ معلوم نہیں تھا، اس لئے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اطلاع دینے کے لئے نماز کے اندر تالیاں بجانا شروع کر دیں، اور ان کو متنبہ کرنا شروع کیا، لیکن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا حال یہ تھا کہ جب نماز شروع کر دیتے تو ان کو دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں رہتی تھی، اور وہ کسی اور طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے کہ دائیں بائیں کیا ہو رہا ہے۔ اس لئے شروع میں جب ایک دو آدمیوں نے تالی بجائی تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو پتہ بھی نہیں چلا۔ وہ اپنی نماز میں مصروف رہے، لیکن جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ دیکھا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کچھ التفات نہیں فرما رہے ہیں تو اس وقت لوگوں نے زیادہ زور سے تالی بجانی شروع کر دی، اور جب کئی صحابہ نے تالی بجائی اور آواز بلند ہونے لگی تو اس وقت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو کچھ تنبہ ہوا، اور کن انکھیوں سے دائیں بائیں دیکھنا شروع کیا تو اچانک دیکھا کہ حضورِ اقدس ﷺ صف میں تشریف فرما ہیں۔ حضورِ اقدس ﷺ کو صف میں دیکھ کر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے پیچھے ہٹنا چاہا، تو آنحضرت ﷺ نے ان کو ہاتھ کے اشارے سے منع فرمایا کہ تم اپنی جگہ پر رہو، پیچھے ہٹنے کی ضرورت نہیں، نماز پوری کر لو۔

لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لیا تو پھر ان کے بس میں نہ رہا کہ وہ اپنے مصلے پر کھڑے رہتے، اس لئے اُلٹے پاؤں پیچھے کی طرف ہٹنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ صف میں آ کر کھڑے ہو گئے، اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم آگے مصلے پر تشریف لے گئے۔ اور پھر باقی نماز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھائی۔

امام کو متنبہ کرنے کا طریقہ

جب نماز ختم ہو گئی تو اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور خطاب فرمایا کہ یہ کیا طریقہ ہے کہ اگر نماز کے اندر کوئی واقعہ پیش آ جائے تو تم تالیاں بجانا شروع کر دیتے ہو، یہ طریقہ نماز کے شایانِ شان اور مناسب نہیں، اور تالیاں بجانا تو عورتوں کے لئے مشروع ہے، یعنی بالفرض اگر خواتین کی جماعت ہو رہی ہو، ویسے خواتین کی جماعت اچھی اور پسندیدہ نہیں ہے، یا خواتین نماز میں شامل ہوں، اور وہ امام کو کسی بات کی طرف متوجہ کرنا چاہیں۔ تو ان کے لئے یہ حکم ہے کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر تالیں بجائیں۔ ان کے لئے نماز کے اندر زبان سے ''سبحان اللہ'' یا ''الحمد للہ'' کہنا اچھا نہیں ہے۔ کیونکہ اس طرح خاتون کی آواز مردوں کے کان میں جائے گی اور خاتون کی آواز کا بھی شریعت میں پردہ ہے، لہٰذا ان کے لئے حکم یہ ہے کہ اگر نماز کے اندر کوئی واقعہ پیش آئے تو ہاتھ پر ہاتھ مار کر امام کو متوجہ کریں، لیکن اگر مردوں کی جماعت میں کوئی واقعہ پیش آ جائے جس کی وجہ سے امام کو کسی بات کی طرف متوجہ کرنا منظور ہو، تو اس میں مردوں کے لئے طریقہ یہ ہے کہ وہ سبحان اللہ کہیں، مثلاً امام کو بیٹھنا چاہئے تھا، اور مقتدیوں نے دیکھا کہ کھڑا ہو رہا ہے تو مقتدی کو چاہئے کہ وہ ''سبحان اللہ'' کہیں یا الحمد للہ کہیں یا امام کو کھڑا ہونا چاہئے تھا، لیکن وہ بیٹھ گیا تو اس وقت بھی سبحان اللہ کہہ دیں، یا بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جہری نماز ہے، اور امام نے سراً قرات شروع کر دی، تو اس وقت بھی اس کو الحمد للہ وغیرہ سے متنبہ کر دے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر نماز میں کوئی بھی ایسا عمل پیش آ جائے، جس کی وجہ سے اس کو متنبہ کرنا مقصود ہو تو مقتدی ''سبحان اللہ'' کہہ دیں۔ تالیاں نہیں بجانی چاہئیں۔

ابو قحافہ کے بیٹے کی یہ مجال نہیں تھی

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور ان سے فرمایا کہ اے ابوبکر! میں نے تو آپ کو اشارہ کر دیا تھا کہ آپ اپنی نماز جاری رکھیں، اور پیچھے نہ ہٹیں، اس کے بعد پھر کیا وجہ ہوئی کہ آپ پیچھے ہٹ گئے، اور امامت کرنے سے آپ نے تردّد کیا، اس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کیا عجیب جواب دیا، فرمایا:

"مَا كَانَ لِابْنِ اَبِىْ قُحَافَةَ اَنْ يُّصَلِّيَ بِالنَّاسِ بَيْنَ يَدَىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "

یا رسول اللہ! ابو قحافہ کے بیٹے کی یہ مجال نہیں تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں لوگوں کی امامت کرے۔ ابو قحافہ ان کے والد کا نام ہے۔ یعنی میری یہ مجال نہیں تھی کہ آپ کی موجودگی میں مصلی پر کھڑا ہو کر امامت کرتا رہوں۔ جب تک آپ تشریف نہیں لائے تھے تو بات دوسری تھی، جب آپ کو دیکھ لیا تو میرے اندر یہ تاب نہیں تھی کہ میں امامت جاری رکھوں، اس واسطے میں پیچھے ہٹ گیا۔ آنحضرت ﷺ نے اس پر کوئی اعتراض نہیں فرمایا، بلکہ خاموشی اختیار فرمائی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مقام

اس سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مقام معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں حضورِ اقدس ﷺ کی عظمت اس درجہ پیوست کر رکھی تھی کہ فرماتے ہیں کہ یہ بات میری برداشت سے باہر تھی کہ حضور ﷺ پیچھے کھڑے ہوں اور میں آگے کھڑا رہوں۔ اگرچہ یہ واقعہ حضور ﷺ کی غیر موجودگی میں پیش آیا اور حضور ﷺ کی موجودگی میں کھڑے نہیں ہوئے تھے لیکن جب پتہ لگ گیا کہ حضور پیچھے ہیں تو پھر آگے کھڑا رہنا برداشت سے باہر تھا اس لئے پیچھے ہٹ گئے۔

ادب کی اہمیت زیادہ یا امر کی؟

یہاں ایک مسئلہ اور ادب عرض کر دوں، جو مسنون ادب ہے، آپ نے وہ مشہور مقولہ سنا ہوگا:

"الأمر فوق الأدب"

یعنی تعظیم کا تقاضا یہ ہے کہ جب کوئی بڑا کسی بات کا حکم دے، چاہے اس بات پر عمل کرنا ادب کے خلاف معلوم ہو رہا ہو، اور ادب کا تقاضا یہ ہو کہ وہ عمل نہ کیا جائے، لیکن جب بڑے نے حکم دے دیا تو چھوٹے کا کام یہ ہے کہ اس حکم کی تعمیل کرے، یہ بڑی نازک بات ہے اور بعض اوقات اس پر عمل بھی مشکل ہوتا ہے لیکن دین پر عمل کرنے والے تمام بزرگوں کا ہمیشہ یہی معمول رہا ہے کہ جب کسی بڑے نے کسی کام کا حکم دیا تو ادب کے بجائے حکم کی تعمیل کو مقدم رکھا۔

بڑے کے حکم پر عمل کرے

مثلاً فرض کرو کہ ایک بڑا بزرگ شخص ہے اور وہ کسی امتیازی جگہ جیسے تخت وغیرہ پر بیٹھا ہے۔ اب ایک شخص اس کے پاس آیا جو اس سے چھوٹا ہے۔ ان بزرگ نے کہا کہ: بھائی! تم یہاں میرے

پاس آجاؤ۔ تو اس وقت اس کی بات مان لینی چاہئے اگرچہ ادب کا تقاضا یہ ہے کہ پاس نہ بیٹھے، دور ہو کر بیٹھے، اس کے پاس تخت پر جاکر بیٹھ جانا ادب کے خلاف ہے۔ لیکن جب بڑے نے حکم دے کر کہہ دیا کہ یہاں آجاؤ تو اس وقت تعظیم کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے حکم پر عمل کرے، چاہے دل میں یہ بات بری لگ رہی ہو کہ میں بڑے کے بالکل قریب جاکر بیٹھ جاؤں۔ اس لئے کہ ادب کے مقابلہ میں حکم کی تعمیل زیادہ مقدم ہے۔

دین کا خلاصہ "اتباع" ہے

میں بار بار عرض کرچکا ہوں کہ سارے دین کا خلاصہ ہے اتباع، بڑے کے حکم کو ماننا، اس کے آگے سرِ تسلیم خم کردینا، اللہ کے حکم کی اتباع، اللہ کے رسول کے حکم کی اتباع، اور اللہ کے رسول کے وارثین کی اتباع، بس وہ جو کہہ رہے ہیں اس پر عمل کرو، چاہے ظاہر میں وہ بات تمہیں ادب کے خلاف معلوم ہو۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں میری حاضری

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس اتوار کے دن ہوا کرتی تھی۔ اس لئے کہ اس زمانے میں اتوار کی سرکاری چھٹی ہوا کرتی تھی، یہ آخری مجلس کا واقعہ ہے، اس کے بعد حضرت والد رحمۃ اللہ علیہ کی کوئی مجلس نہیں ہوئی، بلکہ اگلی مجلس کا دن آنے سے پہلے ہی حضرت والد رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوگیا۔ چونکہ والد صاحب بیمار اور صاحبِ فراش تھے، اس لئے آپ کے کمرے میں ہی لوگ جمع ہوجایا کرتے تھے۔ والد صاحب چارپائی پر ہوتے، لوگ سامنے نیچے اور صوفوں پر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ اس روز لوگ بہت زیادہ آئے اور کمرہ پورا بھر گیا، حتیٰ کہ کچھ لوگ کھڑے بھی ہوگئے۔ اور مجھے حاضری میں تاخیر ہوئی۔ میں ذرا دیر سے پہنچا۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جب مجھے دیکھا تو فرمایا: تم یہاں میرے پاس آجاؤ۔ میں ذرا جھجکنے لگا کہ لوگوں کو پھلانگتا ہوا اور چیرتا ہوا جاؤں گا اور حضرت والد صاحب کے پاس جاکر بیٹھوں گا۔ اگرچہ یہ بات ذہن میں مستحضر تھی کہ جب بڑا کوئی بات کہے تو مان لینی چاہئے لیکن میں ذرا ہچکچا رہا تھا۔ حضرت والد صاحب نے جب میری ہچکچاہٹ دیکھی تو دوبارہ فرمایا: تم یہاں آجاؤ تو تمہیں ایک قصہ سناؤں۔ خیر میں کسی طرح وہاں پہنچ گیا اور حضرت والد صاحب کے پاس بیٹھ گیا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حاضری

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمانے لگے کہ ایک مرتبہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس ہورہی تھی۔ اور وہاں

اسی طرح کا قصہ پیش آیا کہ جگہ تنگ ہوگئی اور بھر گئی اور میں ذرا تاخیر سے پہنچا تو حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تم یہاں میرے پاس آجاؤ۔ میں کچھ جھجکنے لگا کہ حضرت کے بالکل پاس جاکر بیٹھ جاؤں تو حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے دوبارہ فرمایا کہ تم یہاں آجاؤ، پھر میں تمہیں ایک قصہ سناؤں گا۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پھر میں کسی طرح پہنچ گیا، اور حضرت والا کے پاس جاکر بیٹھ گیا، تو حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قصہ سنایا۔

عالمگیر اور داراشکوہ کے درمیان تخت نشینی کا فیصلہ

قصہ یہ سنایا کہ مغل بادشاہ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے والد کے انتقال کے بعد باپ کی جانشینی کا مسئلہ کھڑا ہوگیا اور یہ دو بھائی تھے۔ ایک عالمگیر اور دوسرے داراشکوہ۔ آپس میں رقابت تھی۔ عالمگیر بھی اپنے باپ کے جانشین اور بادشاہ بننا چاہتے تھے اور ان کے بھائی داراشکوہ بھی تخت کے طالب تھے۔ ان کے زمانے میں ایک بزرگ تھے، دونوں نے ارادہ کیا کہ ان بزرگ سے جاکر اپنے حق میں دعا کرائی جائے۔ پہلے داراشکوہ ان بزرگ کے پاس زیارت اور دعا کے لئے پہنچے۔ اس وقت وہ بزرگ تخت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان بزرگ نے داراشکوہ سے کہا کہ یہاں میرے پاس آجاؤ، اور تخت پر بیٹھ جاؤ۔ داراشکوہ نے کہا کہ نہیں حضرت، میری مجال نہیں ہے کہ میں آپ کے پاس تخت پر بیٹھ جاؤں، میں تو یہاں نیچے ہی ٹھیک ہوں۔ ان بزرگ نے پھر کہا کہ میں تمہیں بلا رہا ہوں، یہاں آجاؤ۔ لیکن وہ نہیں مانے، اور ان کے پاس نہ گئے اور وہیں بیٹھے رہے۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ اچھا تمہاری مرضی، پھر ان بزرگ نے ان کو جو نصیحت فرمانی تھی وہ فرمادی اور وہ واپس چلے گئے۔

ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ آگئے۔ وہ جب سامنے نیچے بیٹھنے لگے تو ان بزرگ نے فرمایا کہ تم یہاں میرے پاس آجاؤ۔ وہ فوراً جلدی سے اُٹھے اور ان بزرگ کے پاس جاکر تخت پر بیٹھ گئے۔ پھر انہوں نے ان کو جو نصیحت فرمانی تھی وہ فرمادی۔ جب عالمگیر واپس چلے گئے تو ان بزرگ نے اپنی مجلس کے لوگوں سے فرمایا کہ ان دونوں بھائیوں نے تو خود ہی اپنا فیصلہ کرلیا۔ داراشکوہ کو ہم نے تخت پیش کیا، اس نے انکار کردیا، اور عالمگیر کو پیش کیا تو انہوں نے لے لیا، اس واسطے دونوں کا فیصلہ ہوگیا۔ اب تختِ شاہی عالمگیر کو ملے گا، چنانچہ ان کو ہی مل گیا۔

یہ واقعہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت والد قدس اللہ سرہ کو سنایا۔

حیل و حجت نہ کرنا چاہئے

یہ تو ایک تاریخی واقعہ ہے۔ بہرحال! ادب یہ ہے کہ جب بڑا کہہ رہا ہے کہ یہ کام کرلو، تو اس

میں زیادہ حیل و حجت کرنا ٹھیک بات نہیں، اس وقت تعظیم کا تقاضا یہ ہے کہ جا کر بیٹھ جائے، اس لئے کہ بڑے کے حکم کی تعمیل ادب پر مقدم ہے۔

بزرگوں کے جوتے اُٹھانا

بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ لوگ کسی بزرگ کے جوتے اُٹھانا چاہتے ہیں۔ اب اگر وہ بزرگ زیادہ اصرار کے ساتھ یہ کہیں کہ یہ مجھے پسند نہیں تو اس صورت میں بھی تعظیم کا تقاضا یہ ہے کہ چھوڑ دے اور جوتے نہ اٹھائے۔ بعض اوقات لوگ اس میں چھینا جھپٹی شروع کر دیتے ہیں اور برسر پیکار ہو جاتے ہیں، یہ تعظیم کے خلاف ہے۔ اس لئے یہ مقولہ مشہور ہے:

"الأمر فوق الأدب"

حکم کی تعمیل ادب کے تقاضے پر مقدم ہے، بڑا جو کہے اس کو مان لو، ہاں! ایک دو مرتبہ بزرگ سے یہ کہہ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ حضرت! مجھے اس خدمت کا موقع دیجئے، لیکن جب بڑے نے حکم ہی دے دیا تو اس صورت میں حکم کی تعمیل ہی واجب ہے۔ وہی کرنا چاہئے۔ عام حالات کا دستور یہی ہے، جس کام کا حکم دیا جائے اس کے مطابق عمل کیا جائے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معمول بھی یہی ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دو واقعات

البتہ اس واقعہ میں جو آپ نے دیکھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم اپنی جگہ پر کھڑے رہو۔ لیکن صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پیچھے ہٹ گئے اور ادب کے تقاضے پر عمل کیا اور حکم نہیں مانا تو اس قسم کے واقعات پورے عہدِ صحابہ میں صرف دو ملتے ہیں کہ جن میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا، لیکن صحابہ رضی اللہ عنہم نے ادب کے تقاضے کو حکم کی تعمیل پر مقدم رکھا

خدا کی قسم! نہیں مٹاؤں گا

ایک تو یہ واقعہ ہے اور ایک واقعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور کفارِ مکہ کے درمیان صلح نامہ لکھا جا رہا تھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلایا اور فرمایا "تم لکھو" انہوں نے عرض کیا کہ ٹھیک ہے۔ جب معاہدے کی شرائط لکھنی شروع کیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صلح نامہ پر لکھا "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" تو جو شخص کفار کی طرف سے صلح کی شرائط طے کرنے آیا تھا، اس نے کہا کہ نہیں ہم تو "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" نہیں لکھنے دیں گے اور چونکہ یہ صلح نامہ دونوں کی طرف سے ہوگا، اس لئے اس میں ایسی بات ہونی چاہئے جس پر دونوں متفق ہوں۔ ہم "بسم اللہ

الرحمٰن الرحیم" سے اپنے کام کا آغاز نہیں کرتے، ہم تو "باسمك اللّٰهم" لکھتے ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں بھی لوگ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے بجائے "باسمك اللّٰهم" یعنی "اے اللہ! آپ کے نام سے ہم شروع کرتے ہیں" لکھتے تھے۔ اس لئے اس نے کہا کہ اس کو مٹادیں اور باسمك اللّٰهم لکھیں۔ تو حضورِ اقدس ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ہمارے لئے اس میں کیا فرق پڑتا ہے، "باسمك اللّٰهم" بھی اللہ تعالیٰ کا نام ہے، چلو وہ مٹادو اور یہ لکھ دو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے "باسمك اللّٰهم" لکھ دیا۔ اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ لکھنا شروع کیا کہ "یہ معاہدہ ہے جو محمد رَّسُولُ اللّٰہِ ﷺ اور سردارانِ مکہ کے درمیان طے پایا۔" کفار کی طرف سے جو نمائندہ تھا، اس نے پھر اعتراض کیا کہ آپ نے یہ لفظ "محمد" کے ساتھ "رسول اللہ" کیسے لکھ دیا؟ اگر ہم آپ کو "رسول اللہ" مان لیں تو پھر جھگڑا ہی کیسا، سارا جھگڑا تو اس بات پر ہے کہ ہم آپ کو رسول تسلیم نہیں کرتے، لہٰذا یہ معاہدہ جس پر آپ نے "محمد" کے ساتھ "رسول اللہ" بھی لکھا ہے، ہم اس پر دستخط نہیں کریں گے۔ آپ صرف یہ لکھیں کہ "یہ معاہدہ جو محمد بن عبداللہ اور سردارانِ قریش کے درمیان طے پایا"۔ تو پھر حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: "چلو، کوئی بات نہیں، تم تو مجھے اللہ کا رسول مانتے ہو اس لئے "محمد" کے ساتھ "رسول اللہ" کا لفظ مٹادو اور "محمد بن عبداللہ" لکھ دو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پہلی بات تو مان لی تھی اور "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے بجائے "باسمك اللّٰهم" لکھ دیا تھا۔ لیکن جب حضور ﷺ نے یہ فرمایا کہ "محمد رسول اللہ" کاٹ کر "محمد بن عبداللہ" لکھ دو، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فوراً بے ساختہ فرمایا کہ "واللّٰه لا امحوه"، خدا کی قسم میں لفظ "رسول اللہ" کو نہیں مٹاؤں گا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مٹانے سے انکار کر دیا۔ آنحضرت ﷺ نے بھی ان کے جذبات کو محسوس فرمایا اور فرمایا: اچھا تم نہ مٹاؤ، مجھے دو میں اپنے ہاتھ سے مٹاؤں گا۔ چنانچہ وہ عہد نامہ آپ نے ان سے لے کر اپنے دست مبارک سے "رسول اللہ" کا لفظ مٹادیا۔(۱)

اگر حکم کی تعمیل اختیار سے باہر ہو جائے

یہاں بھی یہی واقعہ ہوا کہ حضورِ اقدس ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جو حکم دیا تھا انہوں نے اس کی تعمیل سے انکار فرمایا اور بظاہر یوں لگتا ہے کہ ادب کو حکم پر مقدم کرلیا۔ حالانکہ حکم ادب پر مقدم ہے۔ اس کی حقیقت سمجھ لیجئے کہ اصل قاعدہ تو وہی ہے کہ بڑا جو کہہ رہا ہے اس کو مانے، اور اس کی تعمیل کرے،

(۱) صحيح البخاری، كتاب الشروط، باب الشروط فی الجهاد والمصالحة مع أهل الحرب، رقم: ۲۵۲۹، صحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب صلح الحديبية فی الحديبية، رقم: ۳۳۳۷، مسند أحمد، رقم: ٦٢١۔

لیکن بعض اوقات انسان کسی حالت سے اتنا مغلوب ہو جاتا ہے کہ اس کے لئے حکم کی تعمیل کرنا اختیار سے باہر ہو جاتا ہے۔ گویا کہ اس کے اندر اس کام کی استطاعت اور طاقت ہی نہیں ہوتی۔ اس وقت اگر وہ اس کام سے پیچھے ہٹ جائے تو اس پر یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس نے نافرمانی کی بلکہ اس پر یہ حکم صادق آئے گا:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾(۱)

یعنی اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ کا مکلّف نہیں کرتے۔ تو پہلے واقعہ میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے تو خود ہی فرمادیا کہ یہ بات میرے بس سے باہر تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں موجود ہوں اور ابو قحافہ کا بیٹا امامت کرتا رہے اور دوسرے واقعہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اتنے مغلوب الحال تھے کہ یہ بات ان کے بس سے باہر تھی کہ وہ "محمد" کے نام سے "رسول اللہ" کا لفظ مٹائیں، اس واسطے انہوں نے مٹانے سے انکار کر دیا۔

یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے

لیکن اصل حکم وہی ہے کہ محبوب جو بات کہے اس کو مانو، اپنی نہ چلاؤ، وہ جس طرح کہہ دے اسی کے مطابق عمل کرو۔

نہ تو ہے ہجر ہی اچھا نہ وصال اچھا ہے
یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے
عشق تسلیم و رضا کے ماسوا کچھ بھی نہیں
وہ وفا سے خوش نہ ہوں تو پھر وفا کچھ بھی نہیں

اگر ان کی خوشی اس میں ہے کہ میں ایسا کام کروں جو بظاہر ادب کے خلاف لگ رہا ہے تو پھر وہی کام بہتر ہے جس کے اندر ان کی خوشی ہے اور ان کی رضا ہے۔

خلاصہ: بہر حال! امام نووی رحمۃ اللہ علیہ جو یہاں یہ حدیث لائے ہیں، وہ اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے لائے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کے جھگڑے نمٹانے کی اور ان کے درمیان آپس میں صلح کرانے کی اتنی اہمیت تھی کہ نماز کا جو وقت مقرر تھا، اس سے آپ کو کچھ دیر بھی ہوگئی، لیکن آپ اس کے اندر مشغول رہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو آپس کے جھگڑوں سے محفوظ رکھے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

---

(۱) البقرة: ۲۸۶

بڑوں کا اکرام کیجئے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

اما بعد!

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((اِذَا اَتَاكُمْ كَرِيْمُ قَوْمٍ فَاَكْرِمُوْهُ))(۱)

''جب تمہارے پاس کسی قوم کا معزز مہمان آئے تو تم اس کا اکرام کرو''

یعنی اگر کوئی شخص کسی قوم کا سردار ہے یا صاحبِ منصب ہے، اور اس قوم کے اندر اس کو معزز سمجھا جاتا ہے، جب وہ تمہارے پاس آئے تو تم اس کا اکرام کرو۔

اکرام کا ایک انداز

ویسے تو شریعت میں ہر مسلمان کا اکرام کرنے کا حکم دیا گیا ہے، کوئی مسلمان بھائی تمہارے پاس آئے تو اس کا حق ہے کہ اس کا اکرام کیا جائے اور اس کی عزت کی جائے۔ حدیث شریف میں یہاں تک آیا ہے کہ اگر آپ کسی جگہ پر بیٹھے ہیں اور کوئی مسلمان تمہارے پاس ملنے آگیا تو کم از کم اتنا ضرور ہونا چاہئے کہ اس کے آنے پر تم تھوڑی سی حرکت کرلو۔ یہ نہ ہو کہ ایک مسلمان بھائی تم سے ملنے کے لئے آیا لیکن تم اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے، بلکہ بت بنے بیٹھے رہے۔ یہ طریقہ اس کے اکرام کے خلاف ہے۔ لہٰذا کم از کم تھوڑی سی اپنی جگہ سے حرکت کرنی چاہئے تاکہ آنے والے کو یہ محسوس ہو کہ اس نے میرے آنے پر میری عزت کی ہے اور میرا اکرام کیا ہے۔

اکرام کے لئے کھڑا ہو جانا

ایک طریقہ ہے دوسرے کے اکرام کے لئے کھڑا ہو جانا، مثلاً کوئی شخص آپ کے پاس آئے تو آپ اس کی عزت اور اکرام کے لئے اپنی جگہ سے کھڑے ہو جائیں۔ اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ جو شخص

☆ اصلاح خطبات (۱۰/۲۲۱ تا ۲۳۴)، بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد بیت المکرّم، کراچی۔

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب الأدب، باب اذا أتاكم كريم قوم فأكرموه، رقم: ۳۷۰۲

آنے والا ہے، اگر وہ اس بات کی خواہش رکھتا ہے کہ لوگ میرے اکرام اور میری عزت کے لئے کھڑے ہوں، تو اس صورت میں کھڑا ہونا درست نہیں۔ اس لئے کہ یہ خواہش اس بات کی نشان دہی کر رہی ہے کہ اس کے اندر تکبر اور بڑائی ہے، اور وہ دوسرے لوگوں کو حقیر سمجھتا ہے، اس لئے وہ یہ چاہتا ہے کہ دوسرے لوگ میرے لئے کھڑے ہوں۔ ایسے شخص کے بارے میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ اس کے لئے نہ کھڑے ہوں۔ لیکن اگر آنے والے شخص کے دل میں یہ خواہش نہیں ہے کہ لوگ میرے لئے کھڑے ہوں، اب آپ اس شخص کے علم یا اس کے تقویٰ یا اس کے منصب کی وجہ سے اس کا اکرام کرتے ہوئے اس کے لئے کھڑے ہو جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں، کوئی گناہ بھی نہیں، اور کھڑا ہونا واجب بھی نہیں۔

حدیث سے کھڑے ہونے کا ثبوت

خود حضورِ اقدس ﷺ نے بعض مواقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کھڑے ہونے کا حکم دیا، چنانچہ جب بنوقریظہ کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لئے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو آپ نے بلایا اور وہ تشریف لائے تو آپ نے اس وقت بنوقریظہ کے حضرات سے فرمایا:

((قُوْمُوْا لِسَيِّدِكُمْ))

''تمہارے سردار آرہے ہیں، ان کے لئے تم کھڑے ہو جاؤ''(۱)

لہٰذا ایسے موقع پر کھڑے ہونا جائز ہے۔ اگر کھڑے نہ ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن حدیث میں اس بات کی تاکید ضرور آئی ہے کہ کسی کے آنے پر یہ نہ ہو کہ آپ بت بنے بیٹھے رہیں اور اپنی جگہ پر حرکت بھی نہ کریں، اور نہ اس کے آنے پر خوشی کا اظہار کریں۔ بلکہ آپ نے فرمایا کہ کم از کم اتنا تو کرلو کہ اپنی جگہ پر ذرا سی حرکت کرلو، تاکہ آنے والے کو یہ احساس ہو کہ میرا اکرام کیا ہے۔

مسلمان کا اکرام ''ایمان'' کا اکرام ہے

ایک مسلمان کا اکرام اور اس کی عزت درحقیقت اس ''ایمان'' کا اکرام ہے جو اس مسلمان کے دل میں ہے۔ جب ایک مسلمان کلمہ طیبہ ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' پر ایمان رکھتا ہے، اور وہ ایمان

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الجهاد والسير، باب اذا نزل العدو على حكم رجل، رقم: ٢٨١٦، صحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب جواز قتال من نقض العهد وجواز إنزال أهل الحصن، رقم: ٣٣١٤، سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب ما جاء في القيام، رقم: ٤٥٣٩، مسند أحمد، رقم: ١٠٧٤٢۔

اس کے دل میں ہے، تو اس کا تقاضا اور اس کا حق یہ ہے کہ اس مسلمان کا اکرام کیا جائے، اگرچہ ظاہری حالت کے اعتبار سے وہ مسلمان تمہیں کمزور نظر آرہا ہو، اور اس کے اعمال اور اس کی ظاہری شکل و صورت پوری طرح دین کے مطابق نہ ہو، لیکن تمہیں کیا معلوم کہ اس کے دل میں جو ایمان اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے، اس ایمان کا کیا مقام ہے؟ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا ایمان کتنا مقبول ہے؟ محض ظاہری شکل وصورت سے اس کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ اس لئے ہر آنے والے مسلمان کا بحیثیت مسلمان ہونے کے اس کا اکرام کرنا چاہئے۔

ایک نوجوان کا سبق آموز واقعہ

ایک مرتبہ میں دارالعلوم میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا، اس وقت ایک نوجوان میرے پاس آیا۔ اس نوجوان میں سر سے لے کر پاؤں تک ظاہری اعتبار سے اسلامی وضع قطع کی کوئی بات نظر نہیں آرہی تھی۔ مغربی لباس میں ملبوس تھا۔ اس کی ظاہری شکل دیکھ کر بالکل اس کا پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اس کے اندر بھی دینداری کی کوئی بات موجود ہوگی۔ میرے پاس آکر کہنے لگا کہ میں آپ سے ایک مسئلہ پوچھنے آیا ہوں۔ میں نے کہا کہ کیا مسئلہ ہے؟ وہ کہنے لگا کہ مسئلہ یہ ہے کہ میں ''ا کچوری'' ''ماہر شماریات'' (Actuary) ہوں، (انشورنس کمپنیوں میں جو حسابات وغیرہ لگائے جاتے ہیں کہ کتنا ''پریمیم'' ہونا چاہئے اور انشورنس کی کتنی رقم ہونی چاہئے، اس قسم کے حسابات کے لئے ''ا کچوری'' رکھا جاتا ہے۔ اس زمانے میں پاکستان بھر میں کہیں بھی یہ علم نہیں پڑھایا جاتا تھا۔ پھر اس نوجوان نے کہا کہ میں نے یہ علم حاصل کرنے کے لئے انگلینڈ کا سفر کیا اور وہاں سے یہ حاصل کر کے آیا ہوں۔ (اس وقت پورے پاکستان میں اس فن کو جاننے والے دو تین سے زیادہ نہیں تھے، اور جو شخص ''ماہر شماریات'' بن جاتا ہے وہ انشورنس کمپنی کے علاوہ کسی اور جگہ پر کام کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ بہر حال، اس نوجوان نے کہا کہ) اور میں نے یہاں آکر ایک انشورنس کمپنی میں ملازمت کر لی۔ اور چونکہ پاکستان بھر میں اس کے ماہر بہت کم تھے، اس لئے ان کی مانگ بھی بہت تھی، اور ان کی تنخواہ اور سہولتیں بھی بہت زیادہ تھیں، اس لئے میری تنخواہ اور سہولتیں بھی بہت زیادہ ہیں، لہٰذا میں نے یہ ملازمت اختیار کر لی۔ جب یہ سب کچھ ہوگیا، تعلیم حاصل کر لی، ملازمت اختیار کر لی، تو اب مجھے کسی نے بتایا کہ یہ انشورنس کا کام حرام ہے، جائز نہیں۔ اب میں آپ سے اس کی تصدیق کرنے آیا ہوں کہ واقعۃً یہ حرام ہے یا حلال ہے؟

انشورنس کا ملازم کیا کرے؟

میں نے اس سے کہا کہ اس وقت انشورنس کی جتنی صورتیں رائج ہیں، ان میں کسی میں سود ہے، کسی میں جوا ہے، اس لئے وہ سب حرام ہیں۔ اور اس وجہ سے انشورنس کمپنی میں ملازمت بھی جائز نہیں۔ البتہ ہمارے بزرگ یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی بینک میں یا انشورنس کمپنی میں ملازم ہو، تو اس کو چاہئے کہ وہ اپنے لئے دوسرا حلال اور جائز ذریعۂ معاش تلاش کرے، اور اہتمام اور کوشش کے ساتھ اس طرح تلاش کرے جیسے ایک بے روزگار تلاش کرتا ہے، اور جب اس کو دوسرا حلال ذریعۂ آمدنی مل جائے، تو اس وقت اس حرام ذریعہ کو چھوڑ دے۔ یہ بات ہمارے بزرگ اس لئے فرماتے ہیں کہ کچھ پتہ نہیں کہ کس کے حالات کیسے ہوں۔ اب اگر کوئی شخص فوراً اس حرام ذریعہ کو چھوڑ دے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی پریشانی میں مبتلا ہو جائے، پھر شیطان آکر اس کو یہ بہکا دے کہ دیکھو تم دین پر عمل کرنے چلے تھے تو اس کے نتیجے میں تم پر یہ مصیبت آگئی۔ اس لئے ہمارے بزرگ فرماتے ہیں کہ اس حرام ملازمت کو فوراً مت چھوڑو، بلکہ دوسری جگہ ملازمت تلاش کرو، جب حلال روزگار مل جائے تو اس وقت اس کو چھوڑ دینا۔

میں مشورہ لینے نہیں آیا

میرا یہ جواب سن کر وہ نوجوان مجھ سے کہنے لگا کہ مولانا صاحب! میں آپ سے یہ مشورہ لینے نہیں آیا کہ ملازمت چھوڑ دوں یا نہ چھوڑوں، میں آپ سے صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ یہ کام حلال ہے یا حرام ہے؟ میں نے اس سے کہا کہ حلال اور حرام ہونے کے بارے میں بھی میں نے تمہیں بتا دیا، اور ساتھ میں بزرگوں سے جو بات سنی تھی، وہ بھی آپ کو بتا دی۔ اس نوجوان نے کہا کہ آپ مجھے اس کا مشورہ نہ دیں کہ میں ملازمت چھوڑوں یا نہ چھوڑوں۔ بس! آپ مجھے صاف اور دوٹوک لفظوں میں یہ بتا دیں کہ یہ ملازمت حلال ہے یا نہیں؟ میں نے کہا: حرام ہے۔ اس نوجوان نے کہا کہ یہ بتائیں کہ اس کو اللہ نے حرام کیا ہے یا آپ نے حرام کیا ہے؟ میں نے کہا کہ اللہ نے حرام کیا ہے۔ اس نوجوان نے کہا کہ جس اللہ نے اس کو حرام کیا ہے وہ مجھے رزق سے محروم نہیں کرے گا۔ لہٰذا اب میں یہاں سے اس دفتر میں واپس نہیں جاؤں گا۔ جب اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے تو وہ ایسا نہیں کرے گا کہ مجھ پر رزق کے دروازے بند کر دے۔ لہٰذا میں آج ہی سے اس کو چھوڑتا ہوں۔

ظاہری شکل پر مت جاؤ

اب دیکھئے! ظاہری شکل وصورت سے دور دور تک پتہ نہیں لگتا تھا کہ اس اللہ کے بندے کے دل میں ایسا پختہ ایمان ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایسا پختہ بھروسہ ہوگا اور توکل ہوگا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسا پختہ توکل عطا فرمایا تھا۔ اور واقعۃً اس نوجوان نے وہ ملازمت اسی دن چھوڑ دی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو خوب نوازا اور دوسرے حلال روزگار اس کو عطا فرمائے۔ وہ اب امریکہ میں ہے۔ آج تک اس نوجوان کی یہ بات میرے دل پر نقش ہے۔ بہرحال، کسی کی ظاہری حالت دیکھ کر ہم اس پر کیا حکم لگائیں، معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں ایمان کی کیسی شمع روشن کی ہوئی ہے، اور اس کو اپنی ذات پر کیسا بھروسہ اور کیسا توکل عطا فرمایا ہوا ہے۔ لہٰذا کسی بھی انسان کی تحقیر مت کرو، جو صاحبِ ایمان ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ نے "اشهد أن لا إله إلا الله، أشهد أن محمدًا رسول الله" کی دولت عطا فرمائی ہے، وہ قابلِ اکرام ہے۔ اسی وجہ سے ہر صاحبِ ایمان کے اکرام کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

ہر بیشہ گمان مبر کہ خالی است
شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

یعنی گمان مت کرو کہ ہر جنگل خالی ہوگا، پتہ نہیں کیسے کیسے شیر اور چیتے اس میں سوئے ہوئے ہوں گے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی کو ایمان کی دولت عطا فرمادیں تو اب ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اس صاحبِ ایمان کی قدر کریں، اس کی عزت کریں اور اس ایمان کا اکرام کریں جو اس کے دل میں ہے۔

معزز کافر کا اکرام

ویسے تو ہر مسلمان کے اکرام کا حکم دیا گیا ہے، لیکن حدیث میں یہاں تک فرمایا کہ آنے والا کافر ہی کیوں نہ ہو، مگر وہ اپنی قوم میں معزز سمجھا جاتا ہے، اس کی عزت کی جاتی ہے، لوگ اس کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس کو اپنا بڑا مانتے ہیں، چاہے وہ کافر اور غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو، اس کے آنے پر تم بھی اس کا اکرام کرو اور اس کی عزت کرو۔ یہ اسلامی اخلاق کا ایک تقاضا ہے کہ اس کی عزت کی جائے۔ یہ عزت اس کے کفر کی نہیں ہے، کیونکہ اس کے کفر سے تو نفرت اور کراہیت کا معاملہ کریں گے، لیکن چونکہ اس کو اپنی قوم میں باعزت سمجھا جاتا ہے، اس لئے جب وہ تمہارے پاس آئے تو تم اس کی مدارات کے لئے اس کا اکرام کرو۔ ایسا نہ ہو کہ اس سے نفرت کرنے کے نتیجے میں تم اس کے ساتھ ایسا برتاؤ اختیار کرلو کہ وہ تم سے اور تمہارے دین ہی سے متنفر ہوجائے، اس لئے اس کا اکرام کرو۔

کافروں کے ساتھ آپ ﷺ کا طرزِ عمل

حضورِ اقدس نبی کریم ﷺ نے ایسا کر کے دکھایا۔ آپ ﷺ کے پاس کافروں کے بڑے بڑے سردار آیا کرتے تھے، جب وہ سردار حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں آتے تو ان کو کبھی یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ ہمارے ساتھ بے عزتی ہوئی ہے، بلکہ آپ نے ان کی عزت کی، ان کا اکرام کیا، ان کو عزت سے بٹھایا، اور عزت کے ساتھ ان سے بات کی۔ یہ ہے نبی کریم ﷺ کی سنت کہ اگر کافر بھی ہمارے پاس آجائے تو اس کو بھی بے عزتی کا احساس نہ ہو۔

ایک کافر شخص کا واقعہ

حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ اپنے گھر میں تشریف فرما تھے۔ سامنے سے ایک صاحب آتے ہوئے دکھائی دیے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا آپ کے قریب تشریف فرما تھیں، آپ نے فرمایا: اے عائشہ! یہ شخص جو سامنے سے آرہا ہے، یہ اپنے قبیلے کا بُرا آدمی ہے۔ پھر جب وہ شخص حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں آیا تو آپ نے کھڑے ہو کر اس کا اکرام کیا، اور بڑی عزت کے ساتھ اس سے بات چیت کی۔ جب وہ شخص بات چیت کرنے کے بعد واپس چلا گیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ یا رَسُولَ اللّٰہِ ﷺ! آپ نے خود ہی تو فرمایا تھا کہ یہ شخص اپنے قبیلے کا بُرا آدمی ہے، لیکن جب یہ شخص آگیا تو آپ نے اس کی بڑی عزت کی اور اس سے بڑی نرمی کے ساتھ پیش آئے، اس کی کیا وجہ ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ وہ آدمی بہت بُرا ہے جس کے شر سے بچنے کے لئے اس کا اکرام کیا جائے۔ (۱)

یہ غیبت جائز ہے

اس حدیث میں دو سوال پیدا ہوتے ہیں: پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ شخص دور سے چلتا ہوا آرہا تھا تو اس کے آنے سے پہلے ہی اس کے پیٹھ پیچھے حضورِ اقدس ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس کی بُرائی بیان کی کہ یہ شخص اپنے قبیلے کا بُرا آدمی ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو غیبت ہے، اس لئے کہ پیٹھ پیچھے ایک آدمی کی بُرائی بیان کی جارہی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حقیقت میں یہ

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب لم یکن النبی فاحشا ولا متفشا، رقم: ۵۵۷۲، صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، رقم: ۴۶۹۳، سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عَنْ رسول الله، رقم: ۱۹۱۹، سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، رقم: ۴۱۵۹۔

غیبت نہیں، اس لئے کہ اگر کسی شخص کو کسی دوسرے شخص کے شر سے بچانے کی نیت سے اس کی بُرائی بیان کی جائے تو یہ غیبت نہیں۔ مثلاً کوئی شخص کسی دوسرے کو متنبہ کرنے کے لئے اس سے کہے کہ تم فلاں شخص سے ذرا احتاط رہنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں دھوکہ دے جائے، یا کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں تکلیف پہنچائے، تو یہ غیبت میں داخل نہیں، حرام اور ناجائز نہیں۔ بلکہ بعض صورتوں میں یہ بتانا واجب ہو جاتا ہے۔ مثلاً آپ کو یقینی طور پر معلوم ہے کہ فلاں شخص فلاں آدمی کو دھوکہ دے گا، اور اس دھوکے کے نتیجے میں اس دوسرے شخص کو مالی یا جانی سخت تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہے، تو آپ پر واجب ہے کہ آپ اس دوسرے شخص کو بتادیں کہ دیکھو فلاں آدمی تمہیں دھوکہ دینا چاہتا ہے، تاکہ وہ اس سے محفوظ رہے۔ یہ غیبت میں داخل نہیں۔

لہٰذا جب حضورِ اقدس ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ بتایا کہ یہ شخص قبیلے کا بُرا آدمی ہے، تو اس بتانے کا منشا یہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شخص حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو کسی وقت دھوکہ دے جائے، یا کہیں اس شخص پر اعتماد اور بھروسہ کرتے ہوئے خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یا کوئی دوسرا مسلمان کوئی ایسا کام کرگزرے جس کی وجہ سے بعد میں انہیں پچھتاوا ہو۔ اس لئے آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس کے بارے میں پہلے سے بتادیا۔

بُرے آدمی کا آپ نے اکرام کیوں کیا؟

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف تو آپ نے اس کی بُرائی بیان فرمائی، اور دوسری طرف جب وہ شخص آگیا تو آپ نے اس کی بڑی عزت فرمائی، اور بڑی خاطر تواضع فرمائی۔ اس میں ظاہر اور باطن میں فرق ہوگیا کہ سامنے کا معاملہ کچھ ہے، اور پیچھے کچھ اور ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہ اللہ کے رسول ﷺ ہیں، جنہوں نے ایک ایک چیز کی حد بیان فرمائی ہے، لہٰذا متنبہ کرنے کے لئے تو آپ نے اتنا بتادیا کہ یہ شخص بُرا آدمی ہے، لیکن جب وہ شخص ہمارے پاس مہمان بن کر آیا ہے تو مہمان ہونے کی حیثیت سے بھی اس کا کچھ حق ہے، وہ یہ کہ ہم اس کے ساتھ عزت سے پیش آئیں، اور اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کریں جو ایک مہمان کے ساتھ کرنا چاہئے۔ چنانچہ حضورِ اقدس ﷺ نے یہی برتاؤ فرمایا۔

وہ آدمی بہت بُرا ہے

اس حدیث میں ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا کہ اس میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اگر بُرے آدمی کا اکرام نہ کیا جائے تو ہوسکتا ہے کہ وہ تمہیں کوئی تکلیف پہنچادے، یا کسی مصیبت کے اندر مبتلا کردے، یا

تمہارے ساتھ وہ کوئی ایسا معاملہ کردے جس کے نتیجے میں تمہیں آئندہ پچھتانا پڑے، اس لئے اگر کسی بُرے آدمی سے ملاقات کی نوبت آجائے تو اس کا اکرام کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کے شر سے اپنی جان کو اور اپنے مال کو اور اپنی آبرو کو بچانا بھی انسان کے فرائض میں داخل ہے۔ اسی لئے حضورِ اقدس ﷺ نے اس حدیث میں صاف صاف ارشاد فرمادیا کہ وہ آدمی بہت بُرا ہے جس کے شر سے بچنے کے لئے لوگ اس کا اکرام کریں۔ لوگ اس کا اکرام اس لئے نہیں کررہے ہیں کہ وہ آدمی اچھا ہے، بلکہ اس لئے اس کا اکرام کررہے ہیں کہ اگر اس کا اکرام نہیں کریں گے تو یہ تکلیف پہنچائے گا۔ ایسی صورت میں بھی اکرام کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، بشرطیکہ وہ اکرام جائز حدود کے اندر ہو اور اس کی وجہ سے کسی گناہ کا ارتکاب نہ کیا جائے۔

حضورِ اقدس ﷺ کے اُسوۂ مبارکہ کے ایک ایک جز میں نہ جانے کتنے بے شمار سبق ہمارے اور آپ کے لئے موجود ہیں۔ آپ نے غیبت کی حد بتادی کہ اتنی بات غیبت ہے، اور اتنی بات غیبت میں داخل نہیں۔ اور اکرام کرنا کوئی منافقت نہیں، بلکہ حکم یہ ہے کہ وہ آنے والا خواہ کیسا ہی کافر اور فاسق و فاجر ہو، لیکن جب وہ تمہارے پاس مہمان بن کر آئے تو اس کی عزت کرو، اس کا اکرام کرو۔ کیونکہ یہ بات منافقت میں داخل نہیں۔

سرسیّد احمد خان کا ایک واقعہ

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سرسیّد کا یہ واقعہ سنا۔ اب تو وہ اللہ کے پاس چلے گئے، اب اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا معاملہ ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اسلامی عقائد کے اندر جو گڑبڑ کی ہے، وہ بڑی خطرناک قسم کی ہے۔ مگر چونکہ ابتداءً وہ بزرگوں کی صحبت اُٹھائے ہوئے تھے اور باقاعدہ عالم بھی تھے، اس لئے ان کے اخلاق اچھے تھے۔ بہر حال، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا یہ واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ وہ اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے، اور ان کے ساتھ کچھ بے تکلف دوست بھی تھے، سامنے دور سے ان کو ایک آدمی آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ آنے والا عام ہندوستانی لباس پہنے ہوئے چلا آرہا تھا، لیکن جب وہ کچھ قریب آگیا تو باہر ہی ایک حوض کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا، اس تھیلے میں سے اس نے ایک عربی جبہ نکالا، اور عرب لوگ سر پر رومال کے اوپر جو ڈوری باندھتے ہیں، وہ نکالی، اور ان دونوں کو پہنا، اور پھر قریب آنے لگا۔ سرسیّد صاحب دور سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ آپ نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ یہ جو شخص آرہا ہے، یہ فراڈی آدمی معلوم ہورہا ہے، اس لئے کہ یہ شخص اب تک تو سیدھے سادھے ہندوستانی لباس میں آرہا تھا، یہاں قریب آکر اس نے اپنا چولہ بدل لیا ہے اور عربی لباس پہن لیا ہے، اب یہاں آکر یہ اپنے

آپ کو عرب ظاہر کرے گا اور پھر پیسے وغیرہ مانگے گا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ شخص ان کے پاس پہنچ گیا اور آکر دروازے پر دستک دی۔ سرسیّد صاحب نے جاکر دروازہ کھولا اور عزت کے ساتھ اس کو اندر بلالیا۔ سرسیّد نے پوچھا کہ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ میں حضرت شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوں۔ یہ حضرت شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ بڑے اونچے درجے کے صوفیاء کرام میں سے تھے۔ اور پھر اس شخص نے کچھ اپنی ضرورت بیان کی کہ میں اس ضرورت سے آیا ہوں، آپ میری کچھ مدد کردیں۔ چنانچہ سرسیّد صاحب نے پہلے اس کی خوب خاطر تواضع کی، اور پھر جتنے پیسوں کی اس کو ضرورت تھی، اس سے زیادہ لاکر اس کو دیدیئے۔ اور پھر بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ اس کو رخصت کردیا۔

آپ نے اس کی خاطر مدارات کیوں کی؟

جب وہ شخص واپس چلا گیا تو ان کے ساتھی نے سرسیّد صاحب سے کہا کہ آپ بھی عجیب انسان ہیں۔ آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس نے اپنا چولہ بدلا اور اپنا عام لباس اُتار کر عرب لباس پہنا، پھر آپ نے خود کہا کہ یہ فراڈی ہے، آکر دھوکہ دے گا اور پیسے مانگے گا، اس کے باوجود آپ نے اس کی اتنی خاطر مدارات کی اور اس کو اتنے پیسے بھی دیئے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

سرسیّد صاحب نے جواب دیا کہ بات دراصل یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ مہمان بن کر آیا تھا، اس لئے میں نے اس کی خاطر تواضع کی۔ جہاں تک پیسے دینے کا تعلق ہے، اس کے دھوکہ کی وجہ سے میں اس کو پیسے نہ دیتا، لیکن چونکہ اس نے ایک ایسے بڑے بزرگ کا نام لے لیا جس کے بعد میری جرأت نہیں ہوئی کہ میں انکار کروں، کیونکہ حضرت شاہ غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان اولیاء کرام میں سے ہیں کہ اگر اس شخص کو ان سے دور دراز کی بھی نسبت تھی، تو اس نسبت کا احترام کرنا میرا فرض تھا، شاید اللہ تعالیٰ میرے اس نسبت کے احترام پر میری مغفرت فرمادیں۔ اس لئے میں نے اس کو پیسے بھی دیدیئے۔

دین کی نسبت کا احترام

یہ واقعہ میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے سنا۔ اور انہوں نے یہ واقعہ اپنے شیخ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے سنا۔ اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ ایک طرف سرسیّد صاحب نے مہمان کا اکرام کیا، اور دوسری طرف بزرگانِ دین کی نسبت کا احترام کیا، کیونکہ جو شخص اللہ کا ولی ہے، اور اس کی طرف کسی شخص کو ذرا سی بھی نسبت ہوگئی ہے، اگر اس نسبت

کا احترام کرلیا تو کیا پتہ کہ اللہ تعالیٰ اس نسبت کے اکرام ہی کی بدولت نوازش فرمادے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمادے۔ آمین۔ بہرحال، حضورِ اقدس ﷺ نے اس حدیث میں فرمایا کہ کسی بھی قوم کا معزز آدمی آئے تو اس کا اکرام کرو۔

عام جلسہ میں معزز کا اکرام

یہاں ایک بات اور عرض کردوں، وہ یہ کہ جو عام اجتماع گاہ یا مجلس یا مسجد ہوتی ہے، اس کا عام قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص مسجد میں یا کسی مجلس میں یا کسی اجتماع میں جس جگہ جا کر پہلے بیٹھ جائے، وہ اس جگہ کا زیادہ حقدار ہے۔ مثلاً مسجد کی اگلی صف میں جا کر اگر کوئی شخص پہلے بیٹھ جائے، وہ اس کا زیادہ حقدار ہے۔ اب دوسرے شخص کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اس سے کہے کہ بھائی! تم اس جگہ سے ہٹ جاؤ، یہاں میں بیٹھوں گا۔ بلکہ جس شخص کو جہاں جگہ مل جائے، وہ وہاں بیٹھ جائے۔ لیکن اگر اسی مجلس میں یا عام اجتماع میں یا مسجد میں کوئی ایسا شخص آجائے جو اپنی قوم کا معزز فرد ہے، تو اس کو آگے بٹھانا اور دوسروں سے آگے جگہ دیدینا بھی اس حدیث کے مفہوم میں داخل ہے۔ ہمارے بزرگوں کا معمول یہ ہے کہ جب کسی مجلس میں سب لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہوں اور اس وقت کوئی معزز مہمان آجائے تو اس معزز مہمان کو اپنے قریب بٹھاتے ہیں، اور اگر اس کو قریب بٹھانے کے لئے دوسروں سے یہ بھی کہنا پڑے کہ تھوڑا سا پیچھے ہو جائیں، تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔

یہ حدیث پر عمل ہو رہا ہے

یہ بات اس لئے عرض کردی کہ اس طرزِ عمل پر ہمارے بزرگوں کا معمول رہا ہے، جس کی وجہ سے لوگوں کے دل میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ شریعت کا تو حکم یہ ہے کہ جو شخص پہلے آجائے، اس کو جہاں جگہ مل جائے، وہ وہاں بیٹھ جائے، اب اگر کوئی شخص دیر سے آیا ہے، اور اس کو پیچھے جگہ مل رہی ہے، تو اس کو چاہئے کہ وہ وہیں پیچھے بیٹھے، لیکن یہ بزرگ صاحب دوسروں کا حق پامال کر کے دیر سے آنے والے کو آگے کیوں بلا رہے ہیں؟ بات دراصل یہ ہے کہ وہ آگے بلانے والے بزرگ درحقیقت اس حدیث پر عمل فرماتے ہیں کہ "إذا اتاكم كريم قوم فاكرموه" یعنی جب تمہارے پاس کسی قوم کا معزز آدمی آجائے تو تم اس کا اکرام کرو۔

بلکہ ہمارے بزرگ حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ (اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین) وہ اس بات کا بڑا خیال فرماتے تھے، یہاں تک کہ اگر کوئی بڑا آدمی مسجد میں آجاتا، اور اگلی صف کے لوگ اس کو جگہ نہ دیتے، تو حضرت والا اس طرزِ عمل پر لوگوں کو خاص طور پر متنبہ فرماتے کہ

بھائی یہ کیا انداز ہے؟ تمہیں چاہئے کہ اپنی جگہ سے ہٹ کر ایسے معزز آدمی کو جگہ دیں، اور اس کو یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ ناانصافی ہے، بلکہ یہ بھی اس حدیث کے ارشاد پر عمل کا ایک حصہ ہے۔

معزز کا اکرام باعثِ اجر ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر ایک جملہ یہ تحریر فرمایا ہے، وہ بھی یاد رکھنے کا ہے، وہ یہ کہ "کوئی شخص کافر ہو یا فاسق ہو، اگر اس کے آنے پر اس کا اکرام اس حدیث پر عمل کرنے کی نیت سے ہو تو انشاء اللہ باعثِ اجر ہے، کیونکہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل ہے۔ لیکن اگر اس کا اکرام اس نیت سے کرے کہ میں اگر اس کا اکرام کروں گا تو یہ فلاں موقع پر میرے کام آئے گا، یا فلاں موقع پر اس سے سفارش کراؤں گا، یا اس سے فلاں دنیاوی مقصد حاصل کروں گا، گویا کہ ایک فاسق یا کافر کے اکرام کا مقصد دنیاوی لالچ ہے اور اس سے پیسے بٹورنا مقصود ہے یا اپنے لئے کوئی منصب حاصل کرنا ہے، تو اس صورت میں یہ اکرام درست نہیں۔

لہٰذا اکرام کرتے وقت نیت درست ہونی چاہئے، یعنی یہ نیت ہونی چاہئے کہ چونکہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم دیا ہے اس لئے اس حکم کی تعمیل میں یہ اکرام کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

بڑوں سے آگے مت بڑھو ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ،
﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ○ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ﴾(۱)

سورۃ الحجرات دو حصوں پر مشتمل ہے

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! میں نے آپ کے سامنے سورۃ الحجرات کی ابتدائی دو آیات تلاوت کیں۔ یہ سورۃ دو حصوں پر منقسم ہے، پہلا حصہ نبی اکرم ﷺ کی تعظیم وتکریم اور آپ کے ساتھ معاملات کرنے کے آداب پر مشتمل ہے، یعنی مسلمانوں کو حضورِ اقدس ﷺ کے ساتھ کس طرح معاملہ کرنا چاہئے، دوسرا حصہ مسلمانوں کے باہمی معاشرت اور تعلقات کے احکام اور آداب پر مشتمل ہے۔

قبیلہ بنوتمیم کے وفد کی آمد

اس سورۃ کا پہلا حصہ جس واقعہ کے پس منظر میں نازل ہوا، وہ واقعہ یہ تھا کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں قبیلہ بنوتمیم کا ایک وفد مسلمان ہو کر آیا۔ اس زمانے میں مختلف قبائل کے وفود اسی غرض سے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آرہے تھے، اور حضور ﷺ سے اسلامی تعلیمات حاصل کر رہے تھے۔ جب کوئی وفد واپس جانے کا ارادہ کرتا تو اس وقت حضور ﷺ انہی میں سے ایک کو ان کا امیر مقرر فرما دیتے، تاکہ آئندہ وہ امیر حضورِ اقدس ﷺ سے رابطہ رکھے، اور آپ کے احکام اپنے قبیلے کے لوگوں تک پہنچانے میں معاون ثابت ہو۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۶/ ۲۰۸۔۲۲۰)، بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) الحجرات: ۱، ۲

حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کا اپنے طور پر امیر مقرر کرنا

جب قبیلہ بنو تمیم کا وفد آیا اور اسلامی تعلیمات حاصل کر کے جانے کا ارادہ کیا تو اس وقت ان کے اندر بھی ایک کو امیر مقرر کرنا تھا، لیکن ابھی تک آپ نے کسی کو متعین فرما کر اعلان نہیں کیا تھا، صحابہ کرام حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے، آپ بھی تشریف فرما تھے، قبل اس کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود قبیلہ بنو تمیم کے لئے کسی امیر کا تعین فرمائیں، حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما نے آپس میں یہ مشورہ شروع کر دیا کہ بنو تمیم میں سے کس کو امیر بنانا چاہئے؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قعقاع ابن معبد رضی اللہ عنہ کو امیر بنانے کی تجویز پیش کی، اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ کو امیر بنانے کی تجویز پیش کی، اور ہر ایک نے اپنی تجویز کے حق میں دلائل دینے شروع کر دیئے۔ اس گفتگو کے دوران ان دونوں حضرات کی آوازیں بلند ہو گئیں، جبکہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس مجلس میں موجود تھے، اس موقع پر سورۃ الحجرات کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔(۱)

دو غلطیاں سرزد ہوئیں

ان آیات نے حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کو متنبہ فرمایا کہ اس خاص واقعہ میں دو باتیں غلط ہوئیں، ایک یہ کہ جب ابھی تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ موضوع چھیڑا نہیں تھا کہ کس کو امیر بنایا جائے، نہ آپ نے خود کوئی اعلان کیا تھا، نہ آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ طلب کیا تھا کہ بتاؤ کس کو امیر بنایا جائے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان سے پہلے اور مشورہ طلب کرنے سے پہلے یہ گفتگو جو شروع کی گئی یہ مناسب نہیں تھی، بلکہ غلط اور قابلِ اعتراض تھی۔ دوسری غلطی یہ ہوئی کہ گفتگو کے دوران نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ان دونوں حضرات کی آوازیں بلند ہو گئیں، حالانکہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی مجلس میں تشریف فرما ہوں تو کسی شخص کا بلند آواز سے بولنا آپ کی تعظیم اور تکریم کے مناسب نہیں تھا، اس لئے آئندہ اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔

پہلی غلطی پر تنبیہ

بہر حال! سورۃ الحجرات میں سب سے پہلے ان دو غلطیوں پر متنبہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ﴾

''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو''

---

(۱) تفسیر ابن کثیر (٤/ ٢٦١)

یہ اس آیت کا لفظی ترجمہ ہے، اس آیت کا پس منظر وہی ہے کہ ابھی نبی کریم ﷺ نے بنو تمیم میں سے کسی کو امیر بنانے کا مسئلہ چھیڑا نہیں تھا، نہ خود آپ نے اعلان کیا تھا اور نہ ہی صحابہ کرام سے مشورہ طلب کیا تھا، اس سے پہلے اپنی طرف سے اس کی گفتگو چھیڑ دینا یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے آگے بڑھنے کے مرادف تھا، اس پر تنبیہ فرمائی۔

یہ قرآن قیامت تک رہنمائی کرتا رہے گا

لیکن قرآن کریم کا یہ عجیب وغریب معجزانہ اسلوب ہے کہ بسا اوقات ایک آیت کسی خاص واقعہ پر نازل ہوتی ہے کہ کوئی واقعہ پیش آیا، اور اس میں مسلمانوں کو تعلیم دینی مقصود تھی، کوئی ہدایت دینی مقصود تھی، اس پر آیت نازل فرمادی، لیکن یہ قرآن کریم قیامت تک کے انسانوں کی رہنمائی کے لئے آیا ہے، اس لئے الفاظ ایسے لاتے ہیں کہ جس سے وہ رہنمائی اس واقعہ کی حد تک محدود نہ رہے، بلکہ قیامِ قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لئے ایک ابدی رہنمائی ثابت ہو۔ چنانچہ اس میں یہ نہیں فرمایا کہ بنو تمیم کے وفد میں سے کسی ایک کو امیر بنانے کے سلسلے میں تم لوگوں نے حضور ﷺ کے فرمانے سے پہلے کیوں بات شروع کردی، یہ نہیں فرمایا، بلکہ ایک عام حکم دے دیا کہ ''اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو''۔ اس ایک جملے سے بہت سارے احکام نکل رہے ہیں، کیا کیا احکام ہیں؟ آج کی محفل میں اسی کو بیان کرنا مقصود ہے۔

حضور ﷺ کی اجازت کے بغیر گفتگو جائز نہیں

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو''۔ اس حکم سے ایک براہِ راست مفہوم تو یہ نکل رہا ہے کہ جو موضوع حضور ﷺ نے ابھی چھیڑا نہیں، اس پر حضور ﷺ کے ارشاد اور اجازت کے بغیر گفتگو کرنا جائز نہیں۔ یہ تو ایک واقعہ تھا، لیکن ہوسکتا ہے کہ آئندہ بھی اس طرح کی صورت پیش آجائے، اس لئے یہ حکم دے دیا کہ جو معاملہ حضور ﷺ نے ابھی چھیڑا نہیں، اس پر اپنی طرف سے رائے زنی شروع نہ کرو۔

عالم سے پہلے گفتگو کرنا جائز نہیں

اسی آیت کے تحت علماء کرام نے فرمایا کہ چونکہ یہ قرآن کریم قیامت تک کے لئے ابدی ہدایت ہے، لہٰذا اگرچہ حضور ﷺ تو ہمارے درمیان تشریف فرما نہیں رہے، لیکن ان کے وارثین انشاء اللہ قیامت تک رہیں گے، حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا:

((اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ)) (۱)

یعنی علماء انبیاء کے وارث ہیں، اس لئے مفسرین نے فرمایا کہ یہی حکم ان مقتدا علماء کا بھی ہے، جن کی بات لوگ سنتے ہوں، اور مانتے ہوں، جن کو اللہ تعالیٰ نے دین اور شریعت کا علم عطا فرمایا ہو، ان کے بارے میں یہ حکم ہے کہ اگر ان کی مجلس میں کوئی سوال کیا گیا ہو تو ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر کسی شخص کا ان عالم کی اجازت کے بغیر اپنی طرف سے بول پڑنا اس عالم کی تعظیم و تکریم کے بھی خلاف ہے، اور آدابِ مجلس کے بھی خلاف ہے، اور بے ادبی ہے، یا ابھی تک کسی موضوع پر گفتگو کرنے کی اجازت نہیں دی، اس سے پہلے لوگوں نے خود سے آپس میں اس موضوع پر گفتگو شروع کر دی، یہ بھی آدابِ مجلس کے خلاف ہے، اور بے ادبی ہے، البتہ اگر خود صاحبِ مجلس مشورہ طلب کرے کہ فلاں مسئلہ ہے، آپ حضرات اپنی رائے دیں، تو اس صورت میں آزادی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کریں۔ یا اگر کسی موضوع پر کوئی بات چھیڑنی ہے تو پہلے صاحبِ مجلس سے اجازت لے کہ کیا اس مسئلے پر گفتگو کر لی جائے؟ اگر وہ اجازت دیدے تو پھر بیشک اس پر گفتگو کریں، لیکن بغیر اجازت کے گفتگو شروع نہ کریں، کیونکہ اس کے نتیجے میں صاحبِ مجلس سے آگے بڑھنا لازم آئے گا، جس کی اس آیت میں ممانعت کی گئی ہے، اس آیت کا ایک براہِ راست مفہوم تو یہ تھا۔

راستے میں نبی یا علماء سے آگے بڑھنا

اس آیت سے دوسرا حکم یہ نکل رہا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ کہیں تشریف لے جارہے ہوں تو راستے میں چلنے کے دوران ان سے آگے بڑھنا بے ادبی ہے، آپ کی عظمت کا اور آپ کی تعظیم و تکریم کا تقاضا یہ ہے کہ جب آپ ﷺ کے ساتھ چلیں تو ذرا سا پیچھے ہو کر چلیں، آگے آگے نہ چلیں، یہ بھی اس آیت کے مفہوم میں داخل ہے، اس حکم کے بارے میں بھی مفسرین نے فرمایا کہ چونکہ یہ حکم بھی قیامِ قیامت تک کے لئے ہے، لہٰذا انبیاء کرام علیہم السلام کے وارثین کے بارے میں بھی یہ حکم ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص اپنے کسی بڑے کے ساتھ، مثلاً کسی عالم کے ساتھ، شیخ کے ساتھ، استاد کے ساتھ چل رہا ہے تو اس کو ان سے آگے نہیں بڑھنا چاہئے، یا تو ساتھ ساتھ چلے، یا ذرا سا پیچھے رہے، آگے بڑھنا بے ادبی ہے، جس کی اس آیت میں ممانعت کی گئی ہے، یہ دوسرا حکم تھا۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب العلم عَنْ رسول الله، باب ما جاء فی فضل الفقه علی العبادة، رقم: ۲۶۰۶، سنن أبی داود، کتاب العلم، باب الحث علی طلب العلم، رقم: ۳۱۵۷، سنن ابن ماجه، المقدمة، ۲۱۹، مسند أحمد، رقم: ۲۰۷۲۳۔

سنت کی اتباع میں کامیابی ہے

تیسرا حکم جو اس آیت سے نکلتا ہے، وہ یہ ہے کہ تمہاری دنیا و آخرت کی صلاح اور فلاح اور کامیابی کا دارومدار نبی کریم ﷺ کی سنت کی اتباع میں ہے، لہٰذا جو آپ کی سنت ہو، اس پر عمل کرو، آپ سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو، یعنی آپ نے جس طرح زندگی گزاری ہے، جس میں آپ نے تمام اہل حقوق کو ان کا حق دیا، اپنے نفس کا حق ادا کیا، اپنے گھر والوں کا حق ادا کیا، اپنے ملنے جلنے والوں کا حق ادا کیا، اپنے دوست واحباب کا حق ادا کیا، اس طرح تم بھی حقوق ادا کرتے ہوئے زندگی گزارو، ایسا نہ ہو کہ حضور ﷺ سے آگے بڑھنے کا شائبہ پیدا ہو جائے، بس حضور ﷺ کی سنت پر عمل کرو۔

تین صحابہ رضی اللہ عنہم کے عبادت کے ارادے

ایک حدیث میں آتا ہے کہ چند صحابہ کرام تشریف فرما تھے، انہوں نے آپس میں یہ گفتگو شروع کی کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو اتنا اونچا مقام عطا فرمایا ہے کہ کوئی دوسرا شخص اس مقام تک پہنچ ہی نہیں سکتا، اور آپ گناہوں سے معصوم ہیں، آپ سے کوئی غلطی نہیں ہو سکتی، اور اگر کوئی بھول چوک ہو تو قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرما دیا ہے کہ:

﴿لَقَدْ غَفَرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ﴾(۱)

اللہ تعالیٰ نے آپ کی تمام اگلی پچھلی بھول چوک بھی معاف کر دی ہیں، لہٰذا آپ کو زیادہ عبادت کرنے کی ضرورت نہیں، اس لئے آپ تو سو بھی جاتے ہیں، اور دن میں افطار بھی کر لیتے ہیں، لیکن ہمیں تو جنت کی بشارت نہیں ملی ہے، جیسے حضورِ اقدس ﷺ کو ملی ہوئی ہے، اس وجہ سے ہمیں حضورِ اقدس ﷺ سے زیادہ عبادت کرنی چاہئے۔ اس گفتگو کے بعد ان میں سے ایک صحابی نے یہ کہا کہ میں آج سے رات کو نہیں سوؤں گا، بلکہ ساری رات تہجد پڑھا کروں گا۔ دوسرے صحابی نے کہا کہ اب میں ساری زندگی روزے رکھوں گا، کوئی دن بھی روزے کے بغیر نہیں گزاروں گا۔ تیسرے صحابی نے کہا کہ زندگی بھر شادی نہیں کروں گا، تاکہ میں بیوی بچوں میں مشغول ہونے کے بجائے عبادت میں مشغول رہوں، اور عبادت سے غافل نہ ہوں۔

کوئی شخص نبی سے آگے نہیں بڑھ سکتا

اب آپ دیکھئے کہ ان تین صحابہ نے جو ارادے کیے وہ نیکی کے ارادے تھے، اور اللہ تعالیٰ کی

---

(۱) الفتح: ۲

عبادت کا ارادہ کیا، جب حضور ﷺ کو پتہ چلا کہ ان صحابہ کرام نے یہ ارادے کیے ہیں، تو آپ نے ان تینوں کو بلوایا، اور ان سے فرمایا کہ:

((أَنَا أَعْلَمُكُمْ بِاللّٰهِ وَأَتْقَاكُمْ أَنَا))

یعنی اللہ تعالیٰ کی جتنی معرفت مجھے حاصل ہے، اتنی معرفت کائنات میں کسی کو حاصل نہیں، اور اللہ کا خوف اور تقویٰ جتنا اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمایا ہے، کائنات میں کسی کو اتنا تقویٰ حاصل نہیں، اس کے باوجود میں سوتا بھی ہوں اور رات کو اُٹھ کر نماز بھی پڑھتا ہوں، کسی دن روزہ رکھتا ہوں، کسی دن روزہ نہیں رکھتا، اور میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ یاد رکھو! اسی سنت میں تمہارے لئے نجات ہے۔

((فَمَنْ رَّغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ))

''اگر کوئی شخص میری سنت سے اعراض کرے گا، وہ مجھ سے نہیں ہوگا''

اس حدیث کے ذریعہ حضورِ اقدس ﷺ نے یہ بتا دیا کہ دنیا و آخرت کی ساری صلاح اور فلاح نبی کریم ﷺ کی سنتوں کی اتباع میں ہے، کوئی شخص یہ چاہے کہ میں نبی سے آگے بڑھ جاؤں، یاد رکھئے! کوئی شخص بھی نبی سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ (۱)

حقوق کی ادائیگی اتباعِ سنت ہے

ایک دوسری حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح عبادت فرض کی ہے، اور عبادت کی ترغیب دی ہے، اسی طرح تم پر کچھ حقوق بھی عائد کیے ہیں، تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے، تمہارے ملنے جلنے والوں کا بھی تم پر حق ہے۔ (۲)

جب تم ان حقوق کی ادائیگی ایک ساتھ کرو گے تو اتباعِ سنت ہوگا۔ لیکن اگر راہبوں کی طرح جنگل میں جا کر بیٹھ گئے اور یہ کہا کہ میں دنیا کو چھوڑ کر یہاں پر ''اللہ اللہ'' کروں گا، یہ حضورِ اقدس ﷺ کی سنت کی اتباع نہیں ہے۔ بہر حال! اس آیت کا تیسرا مفہوم یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو، بلکہ جس کام کو جس حد میں کرنے کا حکم دیا ہے، اس کام کو اسی حد میں رکھو، اس سے آگے نہ بڑھو۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب الترغیب فی النکاح، رقم: ٤٦٧٥، صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب استحباب النکاح، لمن تأقت نفسه الیه ووجد مؤنة، رقم: ٢٤٨٧، سنن النسائی، کتاب النکاح، باب النهی عَنْ التبتل، رقم: ٣١٦٥، مسند أحمد، رقم: ٦١٨٨

(۲) سنن الترمذی، کتاب الزهد عَنْ رسول اللّٰه، باب منه، رقم: ٢٣٣٧۔

دین ''اتباع'' کا نام ہے

یاد رکھئے! اپنی خواہش اور اپنا شوق پورا کرنے کا نام دین نہیں، بلکہ دین نام ہے اتباع کا، اللہ کے حکم کی اتباع، اللہ کے رسول ﷺ کی سنت کی اتباع کا نام ''دین'' ہے، لہٰذا جس وقت اللہ اور اللہ کے رسول کا جو حکم آجائے اور آپ کی اتباع کا جو تقاضا ہو، وہی خیر ہے اور وہی اطاعت ہے، اور اسی میں تمہاری دنیا و آخرت کی کامیابی ہے، اپنی طرف سے کوئی راستہ مقرر کر کے چل پڑنا کہ میں تو یہ کروں گا، یہ بات صحیح نہیں۔ لہٰذا اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو۔ اگر کوئی شخص یہ سوچے کہ جو کام حضورِ اقدس ﷺ نے کیا تھا، مجھے تو وہ کام کرتے ہوئے شرم آتی ہے، تو گویا وہ شخص یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ میرا حضورِ اقدس ﷺ سے زیادہ اونچا مقام ہے، میں بڑا آدمی ہوں، اس لئے یہ کام میں نہیں کرتا۔ العیاذ باللہ۔ یہ بھی درحقیقت حضورِ اقدس ﷺ سے آگے بڑھنے میں داخل ہے، اس کی متعدد مثالیں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات میں ملتی ہیں۔

بارش میں گھر میں نماز پڑھنے کی رخصت

ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ نے یہ حکم دیا کہ جب بارش ہو رہی ہو اور کیچڑ اتنا زیادہ ہو جائے کہ لوگوں کو اس میں چلنے میں بہت زیادہ دقت ہو، اور پھسلنے کا اندیشہ ہو، پاؤں لت پت ہو جائے، اور کپڑے خراب ہو جانے کا اندیشہ ہو تو شریعت نے ایسے موقع پر رخصت دی ہے کہ مسجد کے بجائے آدمی گھر میں نماز پڑھ لے۔ (۱)

اب آج کل ہم لوگ شہر میں رہتے ہیں، جہاں گلیاں اور سڑکیں پکی بنی ہوئی ہیں، اس لئے یہاں بارش ہونے سے یہ صورتِ حال پیدا نہیں ہوتی کہ اتنا کیچڑ ہو جائے کہ آدمی کے لئے چلنا دشوار ہو جائے۔ لیکن جہاں کچے مکانات اور کچی گلیاں ہوں، وہاں آج بھی یہ حکم موجود ہے کہ ایسی صورت میں جماعت معاف ہو جاتی ہے، اور آدمی کے لئے گھر میں نماز پڑھنا جائز ہو جاتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا واقعہ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جو حضورِ اقدس ﷺ کے چچا کے بیٹے ہیں، وہ ایک مرتبہ مسجد میں بیٹھے تھے، اذان کا وقت ہو گیا، اور ساتھ ہی تیز موسلا دھار بارش شروع ہو گئی، مؤذن نے اذان

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأذان، باب الکلام فی الأذان، رقم: ۵۸۱، سنن أبی داود، کتاب الصلاة، باب الجمعة فی الیوم المطیر، رقم: ۸۹۳، مسند أحمد، رقم: ۵۰۵۰

دی، اس کے بعد آپ نے مؤذن سے کہا کہ یہ اعلان کردو:

"الصلوۃ فی الرحال"

یعنی سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں نماز پڑھیں، اور حضورِ اقدس ﷺ سے بھی یہی الفاظ ثابت ہیں کہ ایسے موقع پر یہ اعلان کردینا چاہئے۔ اب لوگوں کے لئے یہ بات بڑی اجنبی تھی، اس لئے کہ ساری زندگی تو دیکھتے آرہے تھے کہ مسجد سے تو یہ اعلان ہوتا ہے:

"حی علی الصلوۃ، حی علی الفلاح"

نماز کے لئے آؤ، کامیابی کے لئے آؤ، لیکن یہاں اُلٹا اعلان ہو رہا ہے کہ اپنے گھروں میں نماز پڑھو، چنانچہ لوگوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما پر اعتراض کیا کہ حضرت! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ آپ لوگوں کو مسجد میں آنے سے منع کر رہے ہیں؟ جواب میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

"نعم افعل ذلك من هو خير مني ومنك"

''ہاں میں ایسا ہی اعلان کراؤں گا، کیونکہ یہ اعلان اس ذات نے بھی کرایا ہے جو مجھ سے بھی بہتر ہے، اور تم سے بھی بہتر ہے، یعنی حضورِ اقدس ﷺ''(۱)

لہٰذا اگر کوئی شخص یہ کہے کہ مجھے تو اعلان کرنا بُرا لگتا ہے، اور مجھے ایسا اعلان کرتے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم حضورِ اقدس ﷺ سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہو۔ حضورِ اقدس ﷺ نے یہ اعلان فرمایا، اور یہ رخصت دی، اور تم کہتے ہو کہ میں یہ رخصت نہیں دیتا، مجھے یہ اعلان کرنا برا لگتا ہے۔

بہرحال! دین کے کسی بھی معاملے میں رسول اللہ ﷺ کی سنت اور آپ کی تعلیم سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنے سے ممانعت بھی اس آیت کے مفہوم میں داخل ہے۔

اللہ سے ڈرو

آگے فرمایا:

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾

اللہ سے ڈرو، اللہ تعالیٰ سب کچھ سن رہے ہیں، اور سب کچھ جانتے ہیں۔ بہرحال! اللہ اور اللہ کے رسول سے آگے بڑھنے کی تین مثالیں تو میں نے آپ کے سامنے عرض کردیں، کچھ اور مثالیں ابھی بیان کرنا باقی ہیں، وقت ختم ہو رہا ہے، اللہ نے زندگی عطا فرمائی تو آئندہ جمعہ میں عرض کروں گا۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأذان، باب هل یصلی الإمام بمن حضر وهل یخطب یوم الجمعة، رقم: ٦٢٨

اخوت، ایک اسلامی رشتہ ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوْا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾(۱)

آیت کا مفہوم

یہ آیت جو ابھی میں نے آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی ہے، اس آیت میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، لہٰذا تمہارے دو بھائیوں کے درمیان کوئی رنجش یا لڑائی ہوگئی ہو تو تمہیں چاہئے کہ ان کے درمیان صلح کراؤ اور صلح کرانے میں اللہ سے ڈرو تاکہ تم اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سزاوار اور مستحق ہو جاؤ۔

جھگڑے دین کو مونڈنے والے ہیں

قرآن و سنت میں غور کرنے سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اللہ کے رسول ﷺ کو مسلمانوں کے باہمی جھگڑے کسی قیمت پر پسند نہیں، مسلمانوں کے درمیان لڑائی ہو یا جھگڑا ہو یا ایک دوسرے سے کھچاؤ اور تناؤ کی صورت پیدا ہو یا رنجش ہو یہ اللہ تعالیٰ کو پسندیدہ نہیں بلکہ حکم یہ ہے کہ حتی الامکان اس آپس کی رنجشوں اور جھگڑوں کو، باہمی نفرتوں اور عداوتوں کو کسی طرح ختم کرو۔ ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ کیا میں تم کو وہ چیز نہ بتاؤں جو نماز، روزے اور صدقہ سے بھی افضل ہے؟ ارشاد فرمایا:

☆ اصلاحی خطبات (۶/۱۴۰۔۱۶۱)، ۳۱ جنوری، ۱۹۹۲ء، بروز جمعۃ المبارک، جامع مسجد بیت المکرّم، کراچی۔

(۱) الحجرات: ۱۰

((اِصْلَاحُ ذَاتِ الْبَیْنِ فَسَادُ ذَاتِ الْبَیْنِ الْحَالِقَةُ))(۱)

''لوگوں کے درمیان صلح کرانا۔ اور اس لئے کہ آپس کے جھگڑے مونڈنے والے ہیں''

یعنی مسلمانوں کے درمیان آپس میں جھگڑے کھڑے ہو جائیں، فساد برپا ہو جائے، ایک دوسرے کا نام لینے کے روادار نہ رہیں، ایک دوسرے سے بات نہ کریں بلکہ ایک دوسرے سے زبان اور ہاتھ سے لڑائی کریں یہ چیزیں انسان کے دین کو مونڈ دینے والی ہیں یعنی انسان کے اندر جو دین کا جذبہ ہے اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کا جو جذبہ ہے وہ اس کے ذریعہ ختم ہو جاتا ہے، بالآخر انسان کا دین تباہ ہو جاتا ہے، اس لئے فرمایا کہ آپس کے جھگڑے اور فساد سے بچو۔

باطن کو تباہ کرنے والی چیز

بزرگوں نے فرمایا کہ آپس میں لڑائی جھگڑا کرنا، اور ایک دوسرے سے بغض اور عداوت رکھنا یہ انسان کے باطن کو اتنا زیادہ تباہ کرتا ہے کہ اس سے زیادہ تباہ کرنے والی چیز کوئی اور نہیں ہے۔ اب اگر انسان نماز بھی پڑھ رہا ہے، روزے بھی رکھ رہا ہے، تسبیحات بھی پڑھ رہا ہے، وظیفے اور نوافل کا بھی پابند ہے، ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ اگر وہ انسان لڑائی جھگڑے میں لگ جاتا ہے تو یہ لڑائی جھگڑا اس کے باطن کو تباہ و برباد کر دے گا اور اس کو اندر سے کھوکھلا کر دے گا۔ اس لئے کہ اس لڑائی کے نتیجے میں آدمی کے دل میں دوسرے کی طرف سے بغض ہوگا اور اس بغض کی خاصیت یہ ہے کہ یہ انسان کو کبھی انصاف پر قائم نہیں رہنے دیتا لہٰذا وہ انسان دوسرے کے ساتھ کبھی ہاتھ سے زیادتی کرے گا، کبھی زبان سے زیادتی کرے گا، کبھی دوسرے کا مالی حق چھیننے کی کوشش کرے گا۔

اللہ کی بارگاہ میں اعمال کی پیشی

صحیح مسلم کی ایک حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''ہر پیر کے دن اور جمعرات کے دن تمام انسانوں کے اعمال اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کیے جاتے ہیں اور جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں''

یوں تو ہر وقت ساری مخلوق کے اعمال اللہ تعالیٰ کے سامنے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر شخص کے عمل سے واقف ہیں، یہاں تک دلوں کے بھید کو جانتے ہیں کہ کس کے دل میں کس وقت کیا خیال آرہا ہے، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس حدیث کا کیا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اعمال پیش کیے جاتے ہیں۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب صفة القیامة والرقائق والورع عَنْ رسول اللّٰه، باب منه، رقم: ۲۴۳۳، سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب فی اصلاح ذات البین، رقم: ۴۲۷۳، مسند أحمد، رقم: ۲۶۲۳۶

بات دراصل یہ ہے کہ ویسے تو اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی بادشاہت کا نظام اس طرح بنایا ہے کہ ان دو دنوں میں مخلوق کے اعمال پیش کیے جائیں تا کہ ان کی بنیاد پر ان کے جنتی یا جہنمی ہونے کا فیصلہ کیا جائے۔

وہ شخص روک لیا جائے

بہر حال اعمال پیش ہونے کے بعد جب کسی انسان کے بارے میں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ شخص اس ہفتے کے اندر ایمان کی حالت میں رہا اور اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں آج کے دن اس کی مغفرت کا اعلان کرتا ہوں۔ یعنی یہ شخص ہمیشہ جہنم میں نہیں رہے گا بلکہ کسی نہ کسی وقت جنت میں ضرور داخل ہو جائے گا، لہٰذا اس کے لئے جنت کے دروازے کھول دیئے جائیں، لیکن ساتھ ہی اللہ تعالیٰ یہ اعلان بھی فرمادیتے ہیں:

((إِلَّا مَنْ بَيْنَهُ وَبَيْنَ اَخِيْهِ شَحْنَاءُ فَيُقَالُ اُنْظُرُوْا هٰذَيْنِ حَتّٰى يَصْطَلِحَا))(۱)

''لیکن جن دو شخصوں کے درمیان آپس میں کینہ اور بغض ہو ان کو روک لیا جائے۔ ان کے جنتی ہونے کا فیصلہ میں ابھی نہیں کرتا، یہاں تک کہ ان دونوں کے درمیان آپس میں صلح نہ ہو جائے''

بغض سے کفر کا اندیشہ

سوال یہ ہے کہ اس شخص کے جنتی ہونے کا اعلان کیوں روک دیا گیا؟ بات دراصل یہ ہے کہ یوں تو جو شخص بھی کوئی گناہ کرے گا، قاعدے کے اعتبار سے اس کو اس گناہ کا بدلہ ملے گا، اس کے بعد جنت میں جائے گا، لیکن اور جتنے گناہ ہیں ان کے بارے میں یہ اندیشہ نہیں ہے کہ وہ گناہ اس کو کفر اور شرک میں مبتلا کر دیں گے، اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ چونکہ صاحبِ ایمان ہے اس لئے اس کے جنتی ہونے کا اعلان ابھی کر دو۔ جہاں تک اس کے گناہوں کا تعلق ہے تو اگر یہ ان سے توبہ کر لے گا تو معاف ہو جائیں گے اور اگر توبہ نہیں کرے گا تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ ان گناہوں کی سزا بھگت کر جنت میں چلا جائے گا۔ لیکن بغض اور عداوت ایسے گناہ ہیں کہ ان کے بارے میں یہ اندیشہ ہے کہ کہیں یہ اس کو کفر اور شرک میں مبتلا نہ کر دیں اور اس کا ایمان سلب نہ ہو جائے اس لئے ان کے جنتی ہونے کا

(۱) صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب النهى عَنْ الشحناء والتهاجر، رقم: ٤٦٥٢، سنن أبى داود، كتاب الأدب، باب فيمن يهجر أخاه المسلم، رقم: ٤٢٧٠، مسند أحمد، رقم: ٨٦٩٢، مؤطا امام مالك، كتاب الجامع، رقم: ١٤١٤

فیصلہ اس وقت تک کے لئے روک دو جب تک یہ دونوں آپس میں صلح نہ کرلیں۔ اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کو مسلمانوں میں آپس کا باہمی بغض اور نفرت کتنا ناپسند ہے۔

شبِ برات میں بھی مغفرت نہیں ہوگی

شبِ برات کے بارے میں یہ حدیث آپ حضرات نے سنی ہوگی کہ حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس رات میں اللہ تعالیٰ کی رحمت انسانوں کی طرف متوجہ ہوتی ہے، اور اس رات میں اللہ تعالیٰ اتنے لوگوں کی مغفرت فرماتے ہیں جتنے قبیلہ کلب کی بکریوں کے جسم پر بال ہیں، لیکن دو آدمی ایسے ہیں کہ ان کی مغفرت اس رات میں بھی نہیں ہوتی، ایک وہ شخص جس کے دل میں دوسرے مسلمان کی طرف سے بغض ہو، کینہ ہو اور عداوت ہو۔ وہ رات جس میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے دروازے کھلے ہوئے ہیں، رحمت کی ہوائیں چل رہی ہیں، اس حالت میں بھی وہ شخص اللہ تعالیٰ کی مغفرت سے محروم رہتا ہے۔ دوسرا وہ شخص جس نے اپنا زیر جامہ ٹخنوں سے نیچے لٹکایا ہوا ہو، اس کی بھی مغفرت نہیں ہوگی۔ (۱)

بغض کی حقیقت

اور ''بغض'' کی حقیقت یہ ہے کہ دوسرے شخص کی بدخواہی کی فکر کرنا کہ اس کو کسی طرح نقصان پہنچ جائے یا اس کی بدنامی ہو، لوگ اس کو برا سمجھیں، اس پر کوئی بیماری آجائے، اس کی تجارت بند ہوجائے، یا اس کو تکلیف پہنچ جائے، تو اگر دل میں دوسرے شخص کی طرف سے بدخواہی پیدا ہو جائے اس کو ''بغض'' کہتے ہیں، لیکن اگر ایک شخص مظلوم ہے، کسی دوسرے شخص نے اس پر ظلم کیا ہے تو ظاہر ہے کہ مظلوم کے دل میں ظالم کے خلاف جذبات پیدا ہوجاتے ہیں اور اس کا مقصد اپنے آپ سے اس ظلم کو دفع کرنا ہوتا ہے تاکہ وہ ظلم نہ کرے تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اس ظالم سے ظلم کا بدلہ لینے کی اور اپنے سے ظلم کا دفاع کرنے کی بھی اجازت دی ہے چنانچہ اس وقت مظلوم اس ظالم کے اس ظلم کو تو اچھا نہ سمجھے بلکہ اس کو برا سمجھے لیکن اس وقت بھی اس ظالم کی ذات سے کوئی کینہ نہ رکھے، اس کی ذات سے بغض نہ کرے اور نہ بدخواہی کی فکر کرے تو مظلوم کا یہ عمل بغض میں داخل نہ ہوگا۔

---

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب اقامة الصلاة والسنة فيها، باب ما جاء في ليلة النصف بن شعبان، رقم: ۱۳۸۰، مسند أحمد، رقم: ٦٣٥٣

حسد اور کینہ کا بہترین علاج

یہ "بغض" حسد سے پیدا ہوتا ہے۔ دل میں پہلے دوسرے کی طرف سے حسد پیدا ہوتا ہے کہ وہ آگے بڑھ گیا، میں پیچھے رہ گیا، اور اب اس کے آگے بڑھ جانے کی وجہ سے دل میں جلن اور کڑھن ہو رہی ہے، گھٹن ہو رہی ہے، اور دل میں یہ خواہش ہو رہی ہے، کہ میں اس کو کسی طرح کا نقصان پہنچاؤں اور نقصان پہنچانا قدرت اور اختیار میں نہیں ہے، اس کے نتیجے میں جو گھٹن پیدا ہو رہی ہے اس سے انسان کے دل میں "بغض" پیدا ہو جاتا ہے، لہٰذا "بغض" سے بچنے کا پہلا راستہ یہ ہے کہ اپنے دل سے پہلے حسد کو ختم کرے اور بزرگوں نے حسد دور کرنے کا طریقہ یہ بیان فرمایا کہ اگر کسی شخص کے دل میں یہ حسد پیدا ہو جائے کہ وہ مجھ سے آگے کیوں بڑھ گیا تو اس حسد کا علاج یہ ہے کہ وہ اس شخص کے حق میں یہ دعا کرے کہ یا اللہ اس کو اور ترقی عطا فرما۔ جس وقت اس کے حق میں یہ دعا کرے گا اس وقت دل پر آرے چل جائیں گے، اس کے بارے میں دل تو یہ چاہ رہا ہے کہ اس کی ترقی نہ ہو بلکہ نقصان ہو جائے لیکن زبان سے وہ یہ دعا کر رہا ہے کہ یا اللہ اس کو اور ترقی عطا فرما۔ چاہے دل پر آرے چل جائیں لیکن بتکلف اور زبردستی اس کے حق میں دعا کرے۔ حسد دور کرنے کا یہ بہترین علاج ہے، اور جب حسد دور ہو جائے گا تو انشاء اللہ بغض بھی دور ہو جائے گا، لہٰذا ہر شخص اپنے دل کو ٹٹول کر دیکھ لے اور جس کے بارے میں بھی یہ خیال ہو کہ اس کی طرف سے دل میں بغض یا کینہ ہے تو اس شخص کو اپنی پنج وقت نمازوں کی دعاؤں میں شامل کرے، یہ حسد اور کینہ کا بہترین علاج ہے۔

دشمنوں پر رحم۔ نبی ﷺ کی سیرت

دیکھئے! مشرکینِ مکہ نے حضورِ اقدس ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر ظلم کرنے اور آپ کو تکلیف دینے، ایذاء پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، یہاں تک کہ آپ ﷺ کے خون کے پیاسے ہو گئے، اعلان کر دیا کہ جو شخص حضورِ اقدس ﷺ کو پکڑ کر لائے گا، اس کو سو اونٹ انعام میں ملیں گے۔ غزوۂ اُحد کے موقع پر آپ ﷺ پر تیروں کی بارش کی حتیٰ کہ آپ کا چہرۂ انور زخمی ہو گیا، دندانِ مبارک شہید ہوئے لیکن اس موقع پر آپ ﷺ کی زبان پر یہ دعا تھی:

((اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِىْ فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ))(۱)

---

(۱) صحيح البخاری، كتاب استتابة المرتدين والمعاندين وقتالهم، باب اذا عرض الذمی وغيره بسب النبی ولم يصرح...... الخ، رقم: ٦٤١٧، صحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب غزوة أحد، رقم: ٣٣٤٧، سنن ابن ماجه، كتاب الفتن، باب الصبر على البلاء، رقم: ٤٠١٥، مسند أحمد، رقم: ٣٤٠٩

اے اللہ! میری قوم کو ہدایت عطا فرمائیے ان کو علم نہیں ہے، یہ ناواقف اور جاہل ہیں، میری بات نہیں سمجھ رہے ہیں اس لئے میرے اوپر ظلم کر رہے ہیں۔

اندازہ لگائیے کہ وہ لوگ ظالم تھے اور ان کے ظلم میں کوئی شک نہیں تھا لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ کے دل میں ان کی طرف سے بغض اور کینہ کا خیال بھی پیدا نہیں ہوا تو یہ بھی نبی کریم ﷺ کی عظیم سنت اور آپ کا اُسوہ ہے کہ بدخواہی کا بدلہ بدخواہی سے نہ دیں بلکہ اس کے حق میں دعا کریں اور یہی حسد اور بغض کو دور کرنے کا بہترین علاج ہے۔

بہرحال، میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ آپس کے جھگڑے آخرکار دل میں بغض اور حسد پیدا کر دیتے ہیں، اس لئے کہ جب جھگڑا لمبا ہو تو دل میں بغض ضرور پیدا ہوگا۔ اور جب بغض پیدا ہوگا تو دل کی دنیا تباہ ہو جائے گی، اور باطن خراب ہوگا، اور اس کے نتیجے میں انسان اللہ کی رحمت سے محروم ہو جائے گا، اس لئے حکم یہ ہے کہ آپس کے جھگڑے سے بچو، اور ان سے دور رہو۔

جھگڑا علم کا نور زائل کر دیتا ہے

یہاں تک کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک جھگڑا تو جسمانی ہوتا ہے، جس میں ہاتھا پائی ہوتی ہے اور ایک جھگڑا پڑھے لکھوں کا اور علماء کا ہوتا ہے، وہ ہے مجادلہ، مناظرہ اور بحث و مباحثہ، ایک عالم نے ایک بات پیش کی، دوسرے نے اس کے خلاف بات کی، اس نے ایک دلیل دی، دوسرے نے اس کی دلیل کا رد لکھ دیا، سوال و جواب اور رد و قدح کا ایک لامتناہی سلسلہ چل پڑتا ہے، اس کو بھی بزرگوں نے کبھی پسند نہیں فرمایا، اس لئے کہ اس کی وجہ سے باطن کا نور زائل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہی حضرت امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"اَلْمِرَاءُ وَالْجِدَالُ فِی الْعِلْمِ یُذْھِبُ بِنُوْرِ الْعِلْمِ"(۱)

"علمی جھگڑے علم کے نور کو زائل کر دیتے ہیں"

دیکھئے، ایک تو ہوتا ہے "مذاکرہ" مثلاً ایک عالم نے ایک مسئلہ پیش کیا، دوسرے عالم نے کہا کہ اس مسئلے میں مجھے فلاں اشکال ہے، اب دونوں بیٹھ کر افہام و تفہیم کے ذریعہ اس مسئلہ کو حل کرنے میں لگے ہوئے ہیں، یہ ہے "مذاکرہ"، یہ بڑا اچھا عمل ہے، لیکن یہ جھگڑا کہ ایک عالم نے دوسرے کے خلاف ایک مسئلے کے سلسلے میں اشتہار شائع کر دیا، یا کوئی پمفلٹ یا کتاب شائع کر دی، اب دوسرے عالم نے اس کے خلاف کتاب شائع کر دی اور پھر یہ سلسلہ چلتا رہا، یا ایک عالم نے دوسرے کے خلاف تقریر کر دی، دوسرے عالم نے اس کے خلاف تقریر کر دی، اور یوں مخالفت برائے مخالفت کا سلسلہ قائم

---

(۱) ترتیب المدارك وتقریب المسالك

ہوگیا، یہ ہے ''مجادلہ اور جھگڑا'' جس کو ہمارے بزرگوں نے، ائمۂ دین نے بالکل پسند نہیں فرمایا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی قوتِ کلام

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے قوتِ کلام میں ایسا کمال عطا فرمایا تھا کہ اگر کوئی شخص کسی بھی مسئلہ پر بحث و مباحثہ کے لئے آجاتا تو آپ چند منٹ میں اس کو لاجواب کردیتے تھے، بلکہ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ نے واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ آپ بیمار تھے اور بستر پر لیٹے ہوئے تھے، اس وقت آپ نے ارشاد فرمایا کہ:

''الحمدللہ، اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بھروسے پر یہ بات کہتا ہوں کہ اگر ساری دنیا کے عقلمند لوگ جمع ہوکر آجائیں، اور اسلام کے کسی بھی معمولی سے مسئلے پر کوئی اعتراض کریں تو انشاء اللہ یہ ناکارہ دو منٹ میں ان کو لاجواب کرسکتا ہے ــــــ پھر فرمایا کہ ''میں تو ایک ادنیٰ طالب علم ہوں، علماء کی تو بڑی شان ہے۔''

چنانچہ واقعہ یہ تھا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس کوئی آدمی کسی مسئلہ پر بات چیت کرتا تو چند منٹ سے زیادہ نہیں چل سکتا تھا۔

مناظرہ سے عموماً فائدہ نہیں ہوتا

خود حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب میں دارالعلوم دیوبند سے درسِ نظامی کرکے فارغ ہوا تو اس وقت مجھے باطل فرقوں سے مناظرہ کرنے کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ کبھی شیعوں سے مناظرہ ہورہا ہے، کبھی غیر مقلدین سے تو کبھی بریلویوں سے، کبھی ہندوؤں سے، اور کبھی سکھوں سے مناظرہ ہورہا ہے۔ چونکہ نیا نیا فارغ ہوا تھا، اس لئے شوق اور جوش میں یہ مناظرے کرتا رہا۔ لیکن بعد میں میں نے مناظرے سے توبہ کرلی، اس لئے کہ تجربہ یہ ہوا اس سے فائدہ نہیں ہوتا بلکہ اپنی باطنی کیفیات پر اس کا اثر پڑتا ہے، اس لئے میں نے اس کو چھوڑ دیا۔

بہرحال، جب ہمارے بزرگوں نے حق و باطل کے درمیان بھی مناظرے کو پسند نہیں فرمایا تو پھر اپنی نفسانی خواہشات کی بنیاد پر، یا دنیاوی معاملات کی بنیاد پر مناظرہ کرنے اور لڑائی جھگڑا کرنے کو کیسے پسند فرماسکتے ہیں، یہ جھگڑا ہمارے باطن کو خراب کردیتا ہے۔

جنت میں گھر کی ضمانت

ایک حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((وَمَنْ تَرَكَ الْمِرَاءَ وَهُوَ مُحِقٌّ بُنِيَ لَهُ فِي وَسَطِ الْجَنَّةِ))(۱)

''میں اس شخص کو جنت کے بیچوں بیچ گھر دلوانے کا ذمہ دار ہوں جو حق پر ہونے کے باوجود جھگڑا چھوڑ دے''

یعنی جو شخص حق پر ہونے کے باوجود یہ خیال کرتا ہے کہ اگر میں حق کا زیادہ مطالبہ کروں گا تو جھگڑا کھڑا ہو جائے گا، چلو اس حق کو چھوڑ دو، تا کہ جھگڑا ختم ہو جائے، اس کے لئے حضور اقدس ﷺ فرما رہے ہیں کہ میں اس کو جنت کے بیچوں بیچ گھر دلوانے کا ذمہ دار ہوں۔

اس سے اندازہ لگایئے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ کو جھگڑا ختم کرانے کی کتنی فکر تھی، تا کہ آپس کے جھگڑے ختم ہو جائیں۔ ہاں، اگر کہیں معاملہ بہت آگے بڑھ جائے، اور قابلِ برداشت نہ ہو تو ایسی صورت میں اس کی اجازت ہے کہ مظلوم ظالم کا دفاع بھی کرے، اور اس سے بدلہ لینا بھی جائز ہے، لیکن حتی الامکان یہ کوشش ہو کہ جھگڑا ختم ہو جائے۔

جھگڑوں کے نتائج

آج ہمارا معاشرہ جھگڑوں سے بھر گیا ہے، اس کی بے برکتی اور ظلمت پورے معاشرے میں اس قدر چھائی ہوئی ہے کہ عبادتوں کے نور محسوس نہیں ہوتے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑے ہو رہے ہیں، کہیں خاندانوں میں جھگڑے ہیں، تو کہیں میاں بیوی میں جھگڑا ہے، کہیں دوستوں میں جھگڑا ہے، کہیں بھائیوں کے درمیان جھگڑا ہے، کہیں رشتہ داروں میں جھگڑا ہے، اور تو اور علماء کرام کے درمیان آپس میں جھگڑے ہو رہے ہیں، اہل دین میں جھگڑے ہو رہے ہیں، اور اس کے نتیجے میں دین کا نور ختم ہو چکا ہے۔

جھگڑے کس طرح ختم ہوں؟

اب سوال یہ ہے کہ یہ جھگڑے کس طرح ختم ہوں؟ حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ آپ حضرات کو سناتا ہوں، جو بڑا زرین اصول ہے، اگر انسان اس اصول پر عمل کر لے تو امید ہے کہ پچھتر فیصد جھگڑے تو وہیں ختم ہو جائیں، چنانچہ فرمایا:

''ایک کام یہ کر لو کہ دنیا والوں سے اُمید باندھنا چھوڑ دو، جب امید چھوڑ دو گے تو انشاء اللہ پھر دل میں کبھی بغض اور جھگڑے کا خیال نہیں آئے گا''

---

(۱) سنن الترمذي، كتاب البر والصلة عَنْ رسول الله، باب ما جاء في المراء، رقم: ۱۹۱۶، سنن ابن ماجه، المقدمة، باب اجتناب البدع والجدل، رقم: ۵۰۔

دوسرے لوگوں سے جو شکایتیں پیدا ہو جاتی ہیں، مثلاً یہ کہ فلاں شخص کو ایسا کرنا چاہئے تھا، اس نے نہیں کیا، جیسی میری عزت کرنی چاہئے تھی، اس نے ایسی عزت نہیں کی، جیسی میری خاطر مدارات کرنی چاہئے تھی، اس نے ویسی نہیں کی، یا فلاں شخص کے ساتھ میں نے فلاں احسان کیا تھا، اس نے اس کا بدلہ نہیں دیا، وغیرہ وغیرہ، یہ شکایتیں اس لئے پیدا ہوتی ہیں کہ دوسروں سے توقعات وابستہ کر رکھی ہیں، اور جب وہ توقع پوری نہیں ہوئی تو اس کے نتیجے میں دل میں گرہ پڑ گئی کہ اس نے میرے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا، اور دل میں شکایت پیدا ہوگئی، ایسے موقع پر اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگر تمہیں کسی سے کوئی شکایت پیدا ہو جائے تو اس سے جا کر کہہ دو کہ مجھے تم سے یہ شکایت ہے، تمہاری یہ بات مجھے اچھی نہیں لگی، مجھے بری لگی، پسند نہیں آئی، یہ کہہ کر اپنا دل صاف کرلو، لیکن آجکل بات کہہ کر دل صاف کرنے کا دستور ختم ہوگیا، بلکہ اب یہ ہوتا ہے کہ وہ اس بات کو اور اس شکایت کو دل میں لے کر بیٹھ جاتا ہے، اس کے بعد کسی اور موقع پر کوئی اور بات پیش آگئی، ایک گرہ اور پڑ گئی، چنانچہ آہستہ آہستہ دل میں گرہیں پڑتی چلی جاتی ہیں، وہ پھر بغض کی شکل اختیار کر لیتی ہیں، اور بغض کے نتیجے میں آپس میں دشمنی پیدا ہو جاتی ہے۔

توقعات مت رکھو، جھگڑے ختم ہو جائیں گے

اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جھگڑے کی جڑ اس طرح کاٹو کہ کسی سے کوئی توقع ہی مت رکھو۔ کیا مخلوق سے توقعات وابستہ کیے بیٹھے ہو کہ فلاں یہ دیدے گا، فلاں یہ کام کر دے گا۔ توقع تو صرف اس سے وابستہ کرو جو خالق اور مالک ہے۔ بلکہ دنیا والوں سے تو برائی کی توقع رکھو کہ ان سے تو ہمیشہ برائی ہی ملے گی، اور پھر برائی کی توقع رکھنے کے بعد اگر کبھی اچھائی مل جائے تو اس وقت اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ یا اللہ، آپ کا شکر اور احسان ہے ___ اور اگر برائی ملے تو پھر خیال کرلو کہ مجھے تو پہلے ہی برائی کی توقع تھی، تو اب اس کے نتیجے میں دل میں شکایت اور بغض پیدا نہیں ہوگا۔ اور پھر دشمنی بھی پیدا نہیں ہوگی، نہ جھگڑا ہوگا، لہٰذا کسی سے توقع ہی مت رکھو۔

بدلہ لینے کی نیت مت کرو

اسی طرح حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور اصول یہ بیان فرمایا کہ جب تم کسی دوسرے کے ساتھ کوئی نیکی کرو، یا اچھا سلوک کرو، تو صرف اللہ کو راضی کرنے کے لئے کرو، مثلاً کسی کی مدد کرو، یا کسی شخص کی سفارش کرو، یا کسی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو یا کسی کی عزت کرو، تو یہ سوچ کر کرو کہ میں اللہ کو راضی کرنے کے لئے یہ برتاؤ کر رہا ہوں، اپنی آخرت سنوارنے کے لئے یہ کام کر رہا ہوں، جب اس

نیت کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو گے تو اس صورت میں اس برتاؤ پر بدلہ کا انتظار نہیں کرو گے ___ اب اگر فرض کریں کہ آپ نے ایک شخص کے ساتھ اچھا سلوک کیا، مگر اس شخص نے تمہارے اچھے سلوک کا بدلہ اچھائی کے ساتھ نہیں دیا، اور اس نے تمہارے احسان کرنے کو کبھی تسلیم ہی نہیں کیا، تو اس صورت میں ظاہر ہے کہ آپ کے دل میں ضرور یہ خیال پیدا ہوگا کہ میں نے تو اس کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا، اور اس نے میرے ساتھ اُلٹا سلوک کیا، لیکن اگر آپ نے اس کے ساتھ اچھا سلوک صرف اللہ کو راضی کرنے کے لئے کیا تھا، تو اس صورت میں اس کی طرف سے برے سلوک پر کبھی شکایت پیدا نہیں ہوگی، اس لئے کہ آپ کا مقصد تو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا تھی۔ اگر ان دو اصولوں پر ہم سب عمل کرلیں تو پھر آپس کے تمام جھگڑے ختم ہو جائیں۔ اور اس حدیث پر بھی عمل ہو جائے جو ابھی میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی، جس میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص حق پر ہوتے ہوئے جھگڑا چھوڑ دے تو میں اس شخص کو جنت کے بیچوں بیچ گھر دلوانے کا ذمہ دار ہوں۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عظیم قربانی

ہم نے اپنے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ کی پوری زندگی میں اس حدیث پر عمل کرنے کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہے۔ جھگڑا ختم کرنے کی خاطر بڑے سے بڑا حق چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ ان کا ایک واقعہ سناتا ہوں جس پر آج لوگوں کو یقین کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے ___ یہ دارالعلوم جو اس وقت کورنگی میں قائم ہے، پہلے نانک واڑہ میں ایک چھوٹی سی عمارت میں قائم تھا۔ جب کام زیادہ ہوا تو اس کے لئے وہ جگہ تنگ پڑ گئی، وسیع اور کشادہ جگہ کی ضرورت تھی، چنانچہ اللہ تعالیٰ کی ایسی مدد ہوئی کہ بالکل شہر کے وسط میں حکومت کی طرف سے ایک بہت بڑی اور کشادہ جگہ مل گئی، جہاں آجکل اسلامیہ کالج قائم ہے، جہاں حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا مزار بھی ہے۔ یہ کشادہ جگہ دارالعلوم کراچی کے نام الاٹ ہوگئی، اس زمین کے کاغذات مل گئے، قبضہ مل گیا، اور ایک کمرہ بھی بنا دیا گیا، ٹیلیفون بھی لگ گیا، اس کے بعد دارالعلوم کا سنگِ بنیاد رکھتے وقت ایک جلسہ تاسیس منعقد ہوا، جس میں پورے پاکستان کے بڑے بڑے علماء حضرات تشریف لائے۔ اس جلسہ کے موقع پر کچھ حضرات نے جھگڑا کھڑا کر دیا کہ یہ جگہ دارالعلوم کو نہیں ملنی چاہئے تھی، بلکہ فلاں کو ملنی چاہئے تھی۔ اتفاق سے جھگڑے میں ان لوگوں نے ایسی بعض بزرگ ہستیوں کو بھی شامل کرلیا جو حضرت والد صاحب کے لئے باعثِ احترام تھیں۔ والد صاحب نے پہلے تو یہ کوشش کی کہ یہ جھگڑا کسی طرح ختم ہو جائے، لیکن وہ ختم نہیں ہوا۔ والد صاحب نے یہ سوچا کہ جس مدرسے کا آغاز ہی جھگڑے سے ہو رہا ہے، تو اس مدرسے میں کیا برکت ہوگی؟ چنانچہ والد صاحب نے اپنا یہ فیصلہ سنا دیا کہ میں اس زمین کو چھوڑتا ہوں۔

مجھے اس میں برکت نظر نہیں آتی

دارالعلوم کی مجلس منتظمہ نے یہ فیصلہ سنا تو انہوں نے حضرت والد صاحب سے کہا کہ حضرت! یہ آپ کیسا فیصلہ کر رہے ہیں؟ اتنی بڑی زمین، وہ بھی شہر کے وسط میں، ایسی زمین ملنا بھی مشکل ہے، اب جبکہ یہ زمین آپ کو مل چکی ہے، آپ کا اس پر قبضہ ہے، آپ ایسی زمین کو چھوڑ کر الگ ہو رہے ہیں؟ حضرت والد صاحب نے جواب میں فرمایا کہ میں مجلس منتظمہ کو اس زمین کے چھوڑنے پر مجبور نہیں کرتا، اس لئے کہ مجلس منتظمہ درحقیقت اس زمین کی مالک ہو چکی ہے، آپ حضرات اگر چاہیں تو مدرسہ بنالیں، میں اس میں شمولیت اختیار نہیں کروں گا، اس لئے کہ جس مدرسے کی بنیاد جھگڑے پر رکھی جارہی ہو، اس مدرسے میں مجھے برکت نظر نہیں آتی۔ پھر حدیث سنائی کہ حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص حق پر ہوتے ہوئے جھگڑا چھوڑ دے میں اس کو جنت کے بیچوں بیچ گھر دلوانے کا ذمہ دار ہوں، آپ حضرات یہ کہہ رہے ہیں کہ شہر کے بیچوں بیچ ایسی زمین کہاں ملے گی، لیکن سرکارِ دو عالم ﷺ فرما رہے ہیں کہ میں اس کو جنت کے بیچ میں گھر دلواؤں گا، یہ کہہ کر اس زمین کو چھوڑ دیا، آج کے دور میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے کہ کوئی شخص اس طرح جھگڑے کی وجہ سے اتنی بڑی زمین چھوڑ دے، لیکن جس شخص کا نبی کریم ﷺ کے ارشاد پر کامل یقین ہے، وہی یہ کام کر سکتا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا ایسا فضل ہوا کہ چند ہی مہینوں کے بعد اس زمین سے کئی گنا بڑی زمین عطا فرمادی، جہاں آج دارالعلوم قائم ہے۔ یہ تو میں نے آپ حضرات کے سامنے ایک مثال بیان کی، ورنہ حضرت والد صاحب کو ہم نے ساری زندگی حتی الامکان اس حدیث پر عمل کرتے دیکھا، ہاں، البتہ جس جگہ دوسرا شخص جھگڑے کے اندر پھانس ہی لے، اور دفاع کے سوا کوئی چارہ نہ رہے تو وہ الگ بات ہے۔ ہم لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر بیٹھ جاتے ہیں کہ فلاں موقع پر فلاں شخص نے یہ بات کہی تھی، فلاں نے ایسا کیا تھا، اب ہمیشہ کے لئے اس کو دل میں بٹھالیا، اور جھگڑا کھڑا ہو گیا، آج ہمارے پورے معاشرے کو اس چیز نے تباہ کر دیا ہے، یہ جھگڑا انسان کے دین کو مونڈ دیتا ہے، اور انسان کے باطن کو تباہ کر دیتا ہے، اس لئے خدا کے لئے آپس کے جھگڑوں کو ختم کر دو، اور اگر دو مسلمان بھائیوں میں جھگڑا دیکھو تو ان کے درمیان صلح کرانے کی پوری کوشش کرو۔

صلح کرانا صدقہ ہے

"عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ:
((كُلُّ سُلامی مِنَ النَّاسِ عَلَیْهِ صَدَقَةٌ كُلَّ یَوْمٍ تَطْلُعُ فِیْهِ الشَّمْسُ، یعدل

بَيْنَ الْاِثْنَيْنِ صَدَقَةٌ، وَبَيْنَ الرَّجُلِ فِيْ دَابَّتِهٖ فَيَحْمِلُهٗ عَلَيْهَا اَوْ يَرْفَعُ لَهٗ عَلَيْهَا مَتَاعَهٗ صَدَقَةٌ، وَالْكَلِمَةُ الطَّيِّبَةُ صَدَقَةٌ، وَبِكُلِّ خُطْوَةٍ يَمْشِيْهَا اِلَى الصَّلَاةِ صَدَقَةٌ، وَيُمِيْطُ الْاَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ صَدَقَةٌ))(۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ انسان کے جسم میں جتنے جوڑ ہیں، ہر جوڑ کی طرف سے انسان کے ذمہ روزانہ ایک صدقہ کرنا واجب ہے۔ اس لئے کہ ہر جوڑ ایک مستقل نعمت ہے اور ہر نعمت پر شکر ادا کرنا واجب ہے، اور ایک انسان کے جسم میں تین سو ساٹھ جوڑ ہوتے ہیں، لہٰذا ہر انسان کے ذمے روزانہ تین سو ساٹھ صدقے واجب ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس صدقے کو اتنا آسان فرمایا کہ انسان کے چھوٹے چھوٹے عمل کو صدقہ کے اندر شمار فرمادیا ہے، تاکہ کسی طرح تین سو ساٹھ کی گنتی پوری ہوجائے، چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ دو آدمیوں کے درمیان جھگڑا اور رنجش تھی، تم نے ان دونوں کے درمیان مصالحت کرادی، یہ مصالحت کرانا ایک صدقہ ہے، اسی طرح ایک شخص اپنے گھوڑے پر یا سواری پر سوار ہونا چاہ رہا تھا، لیکن کسی وجہ سے اس سے سوار نہیں ہوا جارہا تھا، اب تم نے سوار ہونے میں اس کی مدد کردی، اور اس کو سہارا دے دیا، یہ سہارا دیدینا اور سوار کرادینا ایک صدقہ ہے، یا ایک شخص اپنی سواری پر سامان لادنا چاہتا تھا، لیکن اس بیچارے سے لادا نہیں جارہا تھا، اب تم نے اس کی مدد کرتے ہوئے وہ سامان لدوادیا، اس کی سواری پر رکھ دیا، یہ بھی ایک صدقہ ہے۔ اس طرح کسی شخص سے کوئی اچھا کلمہ کہہ دیا، مثلاً کوئی غمزدہ آدمی تھا، تم نے اس کو کوئی تسلی کا کلمہ کہہ دیا، اور اس کی تسلی کردی، یا کسی سے کوئی بات ایسی کہہ دی جس سے اس مسلمان کا دل خوش ہوگیا، یہ بھی ایک صدقہ ہے۔ اسی طرح جب نماز کے لئے تم مسجد کی طرف جارہے ہو، تو ہر قدم جو مسجد کی طرف اُٹھ رہا ہے، وہ ایک صدقہ شمار ہورہا ہے۔ اسی طرح راستے میں کوئی تکلیف دہ چیز پڑی ہے، جس سے لوگوں کو تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہے، آپ نے اس کو راستے سے ہٹادیا، یہ بھی ایک صدقہ ہے۔

بہرحال اس حدیث میں سب سے پہلی چیز جس کو صدقہ شمار کرایا ہے، وہ ہے دو مسلمانوں کے درمیان صلح کرانا، اس سے معلوم ہوا کہ صلح کرانا اجر و ثواب کا موجب ہے۔

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الصلح، باب فضل الإصلاح بين الناس والعدل بينهم، رقم: ۲۵۰۸، كتاب الجهاد والسير، باب من أخذ بالركاب ونهره، رقم: ۲۷٦۷، صحيح مسلم، كتاب الزكاة، باب بيان أن أسلم الصدقة يقع على كل نوع من المعروف، رقم: ۱٦۷۷، مسند أحمد، رقم: ۸۷۳٦

اسلام کا کرشمہ

"وَعَنْ أُمِّ كُلْثُوْمِ بِنْتِ عُقْبَةَ بْنِ أَبِيْ مُعَيْطٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا، قَالَتْ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: ((لَيْسَ الْكَذَّابُ الَّذِيْ يُصْلِحُ بَيْنَ النَّاسِ فَيَنْمِيْ خَيْرًا أَوْ يَقُوْلُ خَيْرًا))(۱)

یہ حضرت اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہا ایک صحابیہ ہیں، اور عقبہ بن ابی معیط کی بیٹی ہیں، اور عقبہ بن ابی معیط حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا جانی دشمن تھا، انتہاء درجہ کا مشرک، اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچانے والے، جیسے ابوجہل اور امیہ ابن ابی خلف تھے، جو کٹر قسم کے مشرک تھے، یہ بھی انہیں میں سے تھا ــــ اور یہ وہ شخص تھا جس کے لئے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بددعا فرمائی، چنانچہ بددعا کرتے ہوئے فرمایا:

((اَللّٰهُمَّ سَلِّطْ عَلَيْهِ كَلْبًا مِنْ كِلَابِكَ))(۲)

اے اللہ، درندوں میں سے کسی درندے کو اس پر مسلط فرمادے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بددعا قبول ہوئی، بالآخر ایک شیر کے ذریعہ اس کا انتقال ہوا ــ تو ایک طرف باپ تو ایسا دشمنِ اسلام تھا، دوسری طرف اس کی بیٹی حضرت اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہا ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کی دولت عطا فرمائی، اور صحابیہ بن گئیں۔

ایسا شخص جھوٹا نہیں

بہرحال، حضرت اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص لوگوں کے درمیان مصالحت کی خاطر کوئی اچھی بات اِدھر سے اُدھر پہنچا دیتا ہے، یا ایک کی بات دوسرے کو اس انداز سے نقل کرتا ہے کہ اس کے دل میں دوسرے کی قدر پیدا ہو، اور نفرت دور ہو جائے، ایسا شخص کذاب اور جھوٹا نہیں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ وہ شخص ایسی بات کہہ رہا ہے جو بظاہر سچ نہیں ہے، لیکن وہ بات اس لئے کہہ رہا ہے تاکہ اس کے دل سے دوسرے مسلمان کی برائی نکل جائے، آپس کے دل کا غبار دور ہو جائے، اور نفرتیں ختم ہو جائیں، اس مقصد سے اگر وہ ایسی بات کہہ رہا ہے تو ایسا شخص جھوٹوں میں شمار نہیں ہوگا۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الصلح، باب لیس الکاذب الذی یصلح بین الناس، رقم: ۲۴۹۵، صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب تحریم الکذب وبیان المباح منهُ، رقم: ۴۷۱۷، مسند أحمد، رقم: ۲۶۰۱۱۔

(۲) فتح الباری (۳۹/۴)

صریح جھوٹ جائز نہیں

علماء کرام نے فرمایا کہ صریح جھوٹ بولنا تو جائز نہیں، البتہ ایسی گول مول بات کرنا جس کا ظاہری مفہوم تو واقعہ کے خلاف ہے، لیکن دل میں ایسے معنی مراد لے لیے جو واقعہ کے مطابق تھے، مثلاً دو آدمیوں کے درمیان نفرت اور لڑائی ہے، یہ اس کا نام سننے کا روادار نہیں، وہ اس کا نام سننے کا روادار نہیں، اب ایک شخص ان میں سے ایک کے پاس گیا تو اس نے دوسرے کی شکایت کرنی شروع کر دی کہ وہ تو میرا ایسا دشمن ہے، تو اس شخص نے کہا کہ تم تو اس کی برائیاں بیان کر رہے ہو، حالانکہ وہ تو تمہارا بڑا خیر خواہ ہے، اس لئے کہ میں نے خود سنا ہے کہ تمہارے حق میں دعا کر رہا تھا۔

اب دیکھئے کہ اس نے یہ دعا کرتے ہوئے نہیں سنا تھا، مگر اس نے دل میں یہ مراد لیا کہ اس نے یہ دعا کرتے ہوئے سنا تھا کہ "اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ" اے اللہ، تمام مؤمنین کی مغفرت فرما۔ چونکہ یہ بھی مسلمان تھا، اس لئے یہ بھی اس دعا میں داخل ہو گیا تھا۔ اب سامنے والا یہ سمجھے گا کہ خاص طور پر میرا نام لے کر دعا کر رہا ہوگا۔ ایسی بات کہہ دینا جھوٹ میں داخل نہیں، بلکہ انشاء اللہ، اس پر بھی اجر و ثواب ملے گا۔

زبان سے اچھی بات نکالو

اور جب اللہ تعالیٰ کا کوئی بندہ اللہ کی رضا کی خاطر دو مسلمان بھائیوں کے درمیان صلح کرانے کے ارادے سے نکلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں ایسی باتیں ڈال دیتے ہیں کہ جس سے اس کے دل سے دوسرے کی نفرت دور ہو جائے، ایسی بات نہ کہو کہ ان کے درمیان نفرت کی آگ تو پہلے سے لگی ہوئی ہے اور اب آپ نے جا کر ایسی بات سنا دی جس نے آگ پر تیل کا کام کیا، اور جس کے نتیجے میں نفرت دور ہونے کے بجائے نفرت کی آگ اور بھڑک گئی۔ یہ انتہائی درجے کی رذالت کا کام ہے، اور حضور اقدس ﷺ کو انتہائی ناپسند ہے۔

صلح کرانے کی اہمیت

حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور مقولہ آپ نے سنا ہوگا کہ "دروغ مصلحت آمیز، بہہ از راستی فتنہ انگیز" یعنی ایسا جھوٹ جس کے ذریعہ دو مسلمانوں کے درمیان مصالحت مقصود ہو، اس سچ سے بہتر ہے جس سچ سے فتنہ پیدا ہو، لیکن اس جھوٹ سے مراد یہ نہیں کہ صریح جھوٹ بول دیا جائے، بلکہ ایسی بات کہہ دے جو دو معنی رکھتی ہو۔ جب حضور اقدس ﷺ نے اس قسم کے جھوٹ کی اجازت دیدی تو

آپ اسی سے اندازہ لگایئے کہ دو مسلمانوں کے درمیان جھگڑا ختم کرانے کی کس قدر اہمیت ہے۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا واقعہ

”عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: سَمِعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَوْتَ خُصُوْمٍ بِالْبَابِ عَالِيَةٍ اَصْوَاتُهُمَا، وَإِذَا أَحَدُهُمَا يَسْتَوْضِعُ الْآخَرَ وَيَسْتَرْفِقُهُ فِيْ شَيْءٍ، وَهُوَ يَقُوْلُ: وَاللّٰهِ لَا اَفْعَلُ، فَخَرَجَ عَلَيْهِمَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: ((اَيْنَ الْمُتَأَلِّيْ عَلَى اللّٰهِ لَا يَفْعَلُ الْمَعْرُوْفَ))
فَقَالَ: أَنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، وَلَهُ أَيُّ ذٰلِكَ أَحَبَّ.(۱)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف فرما تھے، اتنے میں باہر سے دو آدمیوں کے جھگڑنے کی آواز سنی، اور جھگڑا اس بات پر تھا کہ ان میں سے ایک نے دوسرے سے قرضہ لیا تھا، قرض خواہ دوسرے سے قرض کا مطالبہ کر رہا تھا کہ میرا قرضہ واپس کرو، مقروض یہ کہہ رہا تھا کہ اس وقت میرے اندر سارا قرضہ ادا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے، تم کچھ قرضہ لے لو، کچھ چھوڑ دو۔ اس جھگڑنے کے اندران دونوں کی آوازیں بھی بلند ہو رہی تھیں، اور جھگڑنے کے دوران اس قرض خواہ نے یہ قسم کھالی کہ "واللہ لا افعل" خدا کی قسم میں قرضہ کم نہیں کروں گا۔ اس دوران حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بھی گھر سے باہر تشریف لے آئے، اور آکر آپ نے پوچھا کہ وہ شخص کہاں ہے جو اللہ کی قسم کھا کر یہ کہہ رہا ہے کہ میں نیک کام نہیں کروں گا؟ اسی وقت وہ شخص آگے بڑھا، اور کہا کہ میں ہوں یا رسول اللہ، اور پھر فوراً دوسرا جملہ یہ کہا کہ یہ شخص جتنا چاہے اس قرض میں سے کم دیدے، میں چھوڑنے کے لئے تیار ہوں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حالت

یہ تھے صحابہ کرام، کہاں تو جذبات کا یہ عالم تھا کہ آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ وہ کم کرانا چاہتے تھے تو یہ کم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے، اور کم نہ کرنے پر قسم بھی کھالی کہ میں کم نہیں کروں گا، اس کے بعد نہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابی سے قرضہ چھوڑنے کا حکم فرمایا، اور نہ ہی چھوڑنے کا مشورہ دیا، بلکہ صرف اتنا فرمادیا کہ کہاں ہے وہ شخص جو یہ قسم کھا رہا ہے کہ میں نیک کام نہیں کروں گا۔ بس، اتنی بات

(۱) صحیح البخاری، کتاب الصلح، باب هل یشیر الامام بالصلح، رقم: ۲۵۰۶، صحیح مسلم، کتاب المساقاة، باب استحباب الوضع من الدین، رقم: ۲۹۱۱، مؤطا امام مالك، کتاب البیوع، رقم: ۱۱۳۳

سننے کے بعد وہیں ڈھیلے پڑ گئے، اور سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا، اور جھگڑا ختم ہو گیا۔ وجہ یہ تھی کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے اس قدر رام تھے کہ جب آپ کی زبان سے ایک جملہ سن لیا تو اس کے بعد مجال نہیں تھی کہ آگے بڑھ جائیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس جذبہ کا کچھ حصہ ہمیں بھی عطا فرمادے، اور تمام مسلمانوں کے درمیان آپس کے اختلافات اور جھگڑے ختم فرمادے، اور تمام مسلمانوں کو ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

دوسروں کو تکلیف مت دیجئے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

"عَنْ أَبِیْ مُوْسٰی الْأَشْعَرِیِّ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَیَدِهٖ))(۱)

وہ حقیقی مسلمان نہیں

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا
''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں''

یعنی نہ اس کی زبان سے کسی کو تکلیف پہنچے، اور نہ اس کے ہاتھ سے کسی کو تکلیف پہنچے۔ گویا کہ اس حدیث میں مسلمان کی پہچان بتائی کہ مسلمان کہتے ہی اس کو ہیں جس میں یہ صفت پائی جائے۔ لہٰذا جس مسلمان کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے لوگ محفوظ نہ رہیں، حقیقت میں وہ شخص مسلمان کہلانے کا مستحق ہی نہیں۔ جیسے ایک شخص نماز نہیں پڑھتا تو اس کے نماز نہ پڑھنے کی وجہ سے کوئی مفتی اس پر کفر کا فتویٰ تو نہیں لگائے گا کہ یہ شخص چونکہ نماز نہیں پڑھتا، لہٰذا یہ کافر ہوگیا۔ لیکن حقیقت میں وہ مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں۔ اس لئے کہ وہ اللہ کے بتائے ہوئے سب سے اہم فریضے کو انجام نہیں دے رہا ہے۔ اسی طرح جس شخص کے ہاتھ اور زبان سے لوگوں کو تکلیف پہنچے تو اس پر بھی اگرچہ مفتی کفر کا فتویٰ نہیں لگائے گا، لیکن وہ حقیقت میں مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں۔ اس لئے کہ وہ مسلمانوں والا کام نہیں کر رہا ہے۔ یہ اس حدیث کا مطلب ہے۔

☆ اصلاحی خطبات (۸/۱۰۲ تا ۱۳۳)، بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب الإیمان، باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده، رقم: ۹، صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان تفاضل الإسلام وأی أموره أفضل، رقم: ۵۸، سنن الترمذی، کتاب الإیمان عنْ رسول الله، باب ما جاء فی أن المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده، رقم: ۲۵۵۱، سنن النسائی، کتاب الإیمان وشرائعه، باب صفة المسلم، رقم: ۴۹۱۰، سنن أبی داؤد، کتاب الجهاد، باب فی الهجرة هل انقطعت، رقم: ۲۱۲۲

''معاشرت'' کا مطلب

اسلام کے پانچ شعبے ہیں:

(۱) عقائد (۲) عبادات (۳) معاملات (۴) اخلاق (۵) معاشرت

یہ حدیث درحقیقت اسلام کے ان پانچ شعبوں میں سے ایک شعبے یعنی ''معاشرت'' کی بنیاد ہے ''معاشرت'' کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی بھی انسان تنہا نہیں رہتا، اور نہ ہی تنہا رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور جب وہ دنیا میں رہتا ہے تو اس کو کسی نہ کسی سے واسطہ پڑتا ہے، گھر والوں سے واسطہ، دوستوں سے واسطہ، پڑوسیوں سے، بازار والوں سے، اور جس جگہ پر وہ کام کرتا ہے وہاں کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب دوسروں سے واسطہ پڑے تو ان کے ساتھ کس طرح معاملہ کرنا چاہئے؟ کیسا رویہ اختیار کرنا چاہئے؟ اس کو ''معاشرت'' کے احکام کہا جاتا ہے۔ یہ بھی دین کے پانچ بڑے شعبوں میں سے ایک بڑا شعبہ ہے، لیکن ہماری نادانی اور بے عملی کی وجہ سے دین کا یہ شعبہ بالکل نظر انداز ہو کر رہ گیا ہے، اور اس کو دین کا حصہ ہی نہیں سمجھا جاتا اور اس کے بارے میں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے جو احکام عطا فرمائے ہیں ان کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔

معاشرت کے احکام کی اہمیت

اللہ تعالیٰ نے بھی ''معاشرت'' کے احکام بیان کرنے کا بہت اہتمام فرمایا ہے، مثلاً معاشرت کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ جب کسی دوسرے شخص کے گھر میں جاؤ تو اندر داخل ہونے سے پہلے اس سے اجازت لو کہ میں اندر آسکتا ہوں یا نہیں؟ اس اجازت لینے کو عربی زبان میں "استئذان" کہا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے "استئذان" کے احکام بیان کرنے کے لئے قرآن کریم میں پورے دو رکوع نازل فرمائے۔ جبکہ دوسری طرف قرآن کریم میں نماز پڑھنے کا حکم شاید باسٹھ جگہ آیا ہے۔ لیکن نماز کس طرح پڑھی جائے؟ اس کی تفصیل قرآن کریم نے نہیں بتائی۔ بلکہ اس کو حضورِ اقدس ﷺ کے بیان کرنے پر چھوڑ دیا۔ لیکن استئذان کی تفصیل کو قرآن کریم نے خود بیان فرمایا۔ حضورِ اقدس ﷺ کے بیان کرنے پر نہیں چھوڑا۔ اس کے علاوہ قرآن کریم میں سورۃ الحجرات کا ایک بہت بڑا حصہ معاشرتی احکام کے بیان پر مشتمل ہے۔ لہٰذا ایک طرف تو معاشرتی احکام کی اتنی اہمیت ہے، لیکن دوسری طرف ہماری روزمرہ کی زندگی میں ہم نے ان احکام پر عمل کو چھوڑ رکھا ہے اور ان احکام کا خیال نہیں کرتے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا معاشرت کے احکام کو زندہ کرنا

اللہ تعالیٰ نے حکیم الامت مجددِ ملت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے اس دور میں دین کی تجدید کا کام لیا، دین کے وہ ابواب جو لوگوں نے پسِ پشت ڈال دیئے تھے، اور دین سے ان کو خارج ہی کر دیا تھا، آپ نے ان کی اہمیت بتائی، اور اس کے بارے میں لوگوں کو احکام بتائے، اور اپنی خانقاہ میں اس کی عملی تربیت کا اہتمام فرمایا۔ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے تھے کہ خانقاہ اس کو کہتے ہیں جس میں حجروں کے اندر بیٹھ کر لوگ اللہ اللہ کر رہے ہوں اور اپنے ذکر و تسبیح اور عبادات میں مشغول ہوں۔ اس کے آگے کچھ نہ ہو۔ لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی خانقاہ میں ذکر و تسبیح اور نوافل پر اتنا زور نہیں دیا، جتنا آپ نے معاشرت کے اس مسئلے پر زور دیا کہ اپنی ذات سے کسی دوسرے انسان کو تکلیف نہ پہنچے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جو طالبین اپنی اصلاح کے لئے آتے ہیں، اگر ان میں سے کسی کے بارے میں مجھے یہ اطلاع ملتی ہے کہ جو معمولات اس کو بتائے گئے تھے وہ ان میں کوتاہی کرتا ہے۔ مثلاً دس تسبیح کے بجائے وہ پانچ تسبیحات پڑھتا ہے تو اس اطلاع سے رنج تو ہوتا ہے کہ اس کو ایک طریقہ بتایا گیا تھا، اس نے اس پر کیوں عمل نہیں کیا، لیکن جب کسی کے بارے میں مجھے یہ اطلاع ملتی ہے کہ اس نے ''معاشرت'' کے احکام میں سے کسی حکم کی خلاف ورزی کی ہے، اور اس نے اپنی ذات سے دوسرے مسلمان کو تکلیف پہنچائی ہے تو مجھے اس شخص سے نفرت ہو جاتی ہے۔

پہلے انسان تو بن جاؤ

اسی طرح حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مشہور جملہ ہے۔ وہ یہ کہ اگر تمہیں صوفی بننا ہے، یا عابد زاہد بننا ہے تو اس مقصد کے لئے بہت ساری خانقاہیں کھلی ہیں، وہاں چلے جاؤ، اگر انسان بننا ہے تو یہاں آجاؤ، اس لئے کہ یہاں تو انسان بنایا جاتا ہے۔ مسلمان بننا اور عالم بننا اور صوفی بننا تو بعد کی بات ہے، اونچے درجے کی بات ہے، ارے پہلے انسان تو بن جاؤ۔ اور پہلے جانوروں کی صف سے نکل جاؤ۔ اور انسان اس وقت تک انسان نہیں بنتا جب تک اس کو اسلامی معاشرت کے آداب نہ آتے ہوں، اور ان پر عمل نہ کرتا ہو۔

جانوروں کی تین قسمیں

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں تین قسم کے جانور پیدا فرمائے ہیں۔

(۱) جانوروں کی ایک قسم وہ ہے جو لوگوں کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ شاذ و نادر ہی کبھی ان سے نقصان پہنچتا ہو۔ مثلاً گائے، بکری وغیرہ ہے، یہ جانور ایسے ہیں جو دودھ کے ذریعہ تمہیں فائدہ پہنچاتے ہیں۔ جب دودھ دینا بند کر دے گی تو تم اس کو کاٹ کر اس کا گوشت کھالو گے۔ اور اس طرح تمہیں فائدہ پہنچانے کے لئے اپنی جان دے دیں گے۔ اور یہ جانور نقصان نہیں پہنچاتے۔

(۲) جانوروں کی دوسری قسم وہ ہے جو تکلیف ہی پہنچاتے ہیں۔ اور ان کا فائدہ بظاہر کچھ نہیں ہے۔ مثلاً سانپ، بچھو، درندے وغیرہ یہ سب موذی جانور ہیں۔ جب کسی انسان سے ملیں گے تو اس کو تکلیف دیں گے۔ ڈنگ ماریں گے۔

(۳) جانوروں کی تیسری قسم وہ ہے جو نہ تکلیف دیتے ہیں، اور نہ ہی فائدہ پہنچاتے ہیں، جیسے جنگل میں رہنے والے جانور لومڑی گیدڑ وغیرہ، نہ ان سے انسان کو کوئی خاص فائدہ پہنچتا ہے، اور نہ کوئی خاص نقصان پہنچتا ہے۔

جانوروں کی ان تین قسموں کو بیان کرنے کے بعد امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ انسان سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ اے انسان! تو اشرف المخلوقات ہے اور سارے حیوانات پر تجھے فضیلت دی گئی ہے۔ تو اگر انسان نہیں بنتا بلکہ جانور بننا چاہتا ہے تو کم از کم پہلی قسم کا جانور بن جا، جو دوسروں کو فائدہ تو پہنچاتے ہیں، اور نقصان نہیں پہنچاتے۔ جیسے گائے بکری وغیرہ۔ اور اگر تو اس سے بھی نیچے آنا چاہتا ہے تو تیسری قسم کا جانور بن جا، جو نہ نقصان پہنچاتے ہیں اور نہ فائدہ پہنچاتے ہیں۔ اور اگر تو نے دوسروں کو فائدہ کے بجائے نقصان پہنچانا شروع کر دیا تو پھر سانپ بچھو اور درندوں کی قسم میں داخل ہو جائے گا۔

ہم نے انسان دیکھے ہیں

بہر حال! مسلمان غیر مسلم کی بات بعد کی ہے۔ عالم غیر عالم اور عابد غیر عابد کی بات تو بہت بعد کی ہے۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ انسان انسان بن جائے۔ اور انسان بننے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلامی معاشرت کو اختیار کرے، اور اس کی ذات سے کسی دوسرے کو ادنیٰ تکلیف نہ پہنچے، اس کے ہاتھ سے، نہ اس کی زبان سے، اور نہ اس کے کسی فعل سے کوئی تکلیف پہنچے۔ ایک مرتبہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے غایت تواضع سے فرمایا کہ پکے اور پورے سو فیصد انسان تو ہم بھی نہیں بن سکے، لیکن ـــ الحمد للہ ـــ انسانوں کو دیکھ لیا ہے کہ انسان کیسا ہوتا ہے، اور کوئی بیل آکر ہمیں دھوکہ نہیں دے سکتا کہ میں انسان ہوں، لہٰذا اگر کبھی انسان بننا چاہیں گے، تو انشاء اللہ انسان ہی بنیں گے اور انسان کے دھوکے میں بیل نہیں بنیں گے۔

دوسروں کو تکلیف سے بچالو

دیکھئے، نوافل مستحبات، ذکرواذکار اور تسبیحات کا معاملہ یہ ہے کہ اگر کروگے تو انشاء اللہ آخرت میں اس کا ثواب ملے گا، اور اگر نہیں کروگے تو آخرت میں یہ پکڑ نہیں ہوگی کہ فلاں نفل کیوں نہیں پڑھی؟ ذکرواذکار کیوں نہیں کیا تھا؟ البتہ یہ سب فضیلت والے کام ہیں۔ ضرور کرنے چاہئیں، اور کرنے پر آخرت میں ثواب ملے گا۔ لیکن نہ کرنے پر گرفت نہیں ہوگی۔ دوسری طرف اگر تمہاری ذات سے دوسرے کو تکلیف پہنچ گئی تو یہ گناہ کبیرہ ہوگیا، اب اس کی آخرت میں پکڑ ہوجائے گی کہ ایسا کام کیوں کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی وقت نوافل میں اور اسلام کے معاشرتی احکام میں تعارض ہوجائے، یا تو نوافل پڑھ لو، یا اس معاشرتی حکم پر عمل کرتے ہوئے دوسرے کو تکلیف سے بچالو، تو اس صورت میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ نوافل کو چھوڑ دو، اور اس معاشرتی حکم پر عمل کرلو۔

نماز با جماعت کی اہمیت

دیکھئے، مردوں کو مسجد میں جماعت کے ساتھ فرض نماز پڑھنے کی سخت تاکید فرمائی گئی ہے، یہاں تک کہ ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ کسی دن ایسا کروں کہ جب جماعت کا وقت آجائے تو کسی کو امام بنا کر خود باہر جاؤں، اور گھروں میں جاکر دیکھوں کہ کون کون لوگ مسجد میں نہیں آئے بلکہ گھر میں بیٹھے رہے، پھر ان کے گھروں کو آگ لگادوں، اس لئے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے اس فریضے میں کوتاہی کررہے ہیں۔ اس سے پتہ چلا کہ جماعت سے نماز پڑھنے کی کتنی تاکید ہے، چنانچہ بعض فقہاء نے جماعت سے نماز پڑھنے کو سنتِ مؤکدہ فرمایا ہے۔ لیکن دوسرے بعض فقہاء نے جماعت سے نماز پڑھنے کو واجب قرار دیا ہے، اور جماعت سے نماز ادا کرنا اداء کامل ہے اور تنہا ادا کرنا اداء ناقص ہے۔ چنانچہ حضورِ اقدس ﷺ نے اپنے عمل سے اس کی تاکید اور اہمیت کا اس طرح اظہار فرمایا کہ مرضِ وفات میں جب کہ آپ کے لئے چلنا مشکل تھا، اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو آپ نے امام بنادیا تھا، اس وقت بھی آپ دو آدمیوں کا سہارا لے کر جماعت سے نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں تشریف لائے۔ اس سے جماعت سے نماز پڑھنے کی سخت تاکید معلوم ہوتی ہے۔

ایسے شخص کے لئے مسجد میں آنا جائز نہیں

لیکن دوسری طرف تمام فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہے جو لوگوں کے لئے گھن کا باعث ہوتی ہے، جس کی وجہ سے بدبو آتی ہے، ایسے شخص کو مسجد میں جاکر

جماعت سے نماز پڑھنا جائز نہیں، اور صرف یہ نہیں کہ جماعت سے نماز پڑھنے کا حکم اس سے ساقط ہوگیا، بلکہ جماعت سے نماز پڑھنا جائز ہی نہیں، اگر جماعت سے نماز پڑھے گا تو گناہ گار ہوگا، اس لئے کہ اگر وہ مسجد میں جماعت سے نماز پڑھے گا تو اس کے پاس کھڑے ہونے والوں کو بدبو سے تکلیف ہوگی۔ دیکھئے جماعت جیسی اہم عبادت کو صرف لوگوں کو تکلیف سے بچانے کے لئے چھڑا دیا گیا۔

حجر اسود کو بوسہ دیتے وقت تکلیف دینا

حجر اسود کی فضیلت اور اہمیت کون مسلمان نہیں جانتا، اور فرمایا گیا کہ حجر اسود کو بوسہ دینا ایسا ہے جیسے اللہ جل شانہ سے مصافحہ کرنا، اور حجر اسود کو بوسہ دینا انسان کے گناہوں کو جھاڑ دیتا ہے، اور خود حضورِ اقدس ﷺ نے حجر اسود کو بوسہ دیا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دیا۔ یہ اس کی فضیلت کی بات ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ فرمادیا کہ حجر اسود کو بوسہ دینے کے لئے اگر دھکا دینا پڑے، اور اس کے نتیجے میں دوسرے کو تکلیف پہنچ جانے کا اندیشہ ہو تو پھر اس وقت حجر اسود کو بوسہ دینا جائز نہیں۔ بلکہ گناہ ہے۔ آپ دیکھتے جائیں کہ شریعت اس بات کا کتنا اہتمام کرتی ہے کہ دوسروں کو اپنی ذات سے ادنیٰ برابر بھی تکلیف پہنچنے سے بچایا جائے۔ جب اتنی اہم چیزوں کو صرف اس لئے چھڑایا جارہا ہے کہ اپنی ذات سے دوسروں کو تکلیف نہ پہنچے تو پھر نوافل اور مستحبات کے ذریعہ دوسروں کو تکلیف پہنچانا کہاں سے جائز ہوگا؟

بلند آواز سے تلاوت کرنا

مثلاً تلاوتِ قرآن کریم ایک عبادت ہے، یہ اتنی اہم عبادت ہے کہ ایک حرف پر دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں، گویا کہ تلاوت کے وقت نیکیوں کا خزانہ جمع ہوجاتا ہے، اور فرمایا کہ سارے اذکار اور تسبیحات میں سب سے افضل ترین قرآن کریم کی تلاوت ہے، اور تلاوت میں افضل یہ ہے کہ بلند آواز سے کی جائے۔ آہستہ آواز کے مقابلے میں بلند آواز سے تلاوت کرنے پر زیادہ ثواب ملتا ہے۔ لیکن اگر تمہاری تلاوت کی وجہ سے کسی کی نیند یا آرام میں خلل آرہا ہو تو پھر بلند آواز سے تلاوت کرنا جائز نہیں۔

تہجد کے وقت آپ ﷺ کے اُٹھنے کا انداز

حضور نبی کریم ﷺ تہجد کی نماز کے لئے اُٹھتے، ساری عمر کبھی تہجد کی نماز نہیں چھوڑی، اللہ اور

اللہ کے رسول ﷺ نے ہم پر آسانی فرماتے ہوئے تہجد کی نماز واجب نہیں فرمائی۔ لیکن حضور اقدس ﷺ پر تہجد کی نماز واجب تھی۔ آپ نے کبھی تہجد کی نماز قضا نہیں فرمائی۔ لیکن حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب آپ تہجد کی نماز کے لئے اُٹھتے، تو آہستہ سے اُٹھتے اور آہستگی سے دروازہ کھولتے کہ کہیں میرے اس عمل کی وجہ سے میری بیوی کی آنکھ نہ کھل جائے، اور ان کی نیند خراب نہ ہو جائے۔ (۱)

سارا قرآن اور حدیث اس بات سے بھرا ہوا ہے کہ اپنی ذات سے دوسروں کو تکلیف نہ پہنچائے، اور قدم قدم پر شریعت نے اس کا اہتمام کیا ہے۔

لوگوں کی گزرگاہ میں نماز پڑھنا

ایسی جگہ پر نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہونا جو لوگوں کے گزرنے کی جگہ ہے، جائز نہیں۔ بعض لوگ اس کا بالکل خیال نہیں کرتے۔ پوری مسجد خالی پڑی ہے، مگر پچھلی صف میں جا کر نماز کے لئے کھڑے ہو گئے، اور نیت باندھ لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گزرنے والا یا تو اس کے پیچھے سے لمبا چکر کاٹ کر جائے یا نمازی کے سامنے سے گزرنے کے گناہ کا ارتکاب کرے۔ اس طریقے سے نماز پڑھنا جائز نہیں، بلکہ گناہ ہے۔

''مسلم'' میں سلامتی داخل ہے

بہر حال! حدیث شریف میں فرمایا:

((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ))(۲)

یعنی مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے لوگ محفوظ اور سالم رہیں۔ لفظ ''مسلم'' کا مادہ ہے ''س ل م'' اور لفظ ''سلامتی'' بھی اسی مادے سے اور انہی حروف سے مل کر بنا ہے، گویا اشارہ اس بات کی طرف کر دیا کہ ''مسلمان'' کے لفظ کے اندر سلامتی لفظ داخل ہے۔

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب الجنائز، باب ما يقال عند دخول القبور والدعاء لأهلها، رقم: ۱۶۱۹، مسند أحمد، رقم: ۲٤٦٧١

(۲) صحيح البخاري، كتاب الإيمان، باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده، رقم: ۹، صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب بيان تفاضل الإسلام وأى أموره أفضل، رقم: ٥٨، سنن الترمذي، كتاب الإيمان عن رسول الله، باب ما جاء فى أن المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده، رقم: ۲٥٥١، سنن النسائي، كتاب الإيمان وشرائعه، باب صفة المسلم، رقم: ٤٩١٠، سنن أبي داود، كتاب الجهاد، باب فى الهجرة هل انقطعت، رقم: ۲۱۲۲

السلام علیکم کا مفہوم

دوسرے مذاہب کے لوگ جب آپس میں ملاقات کرتے ہیں تو کوئی ''ہیلو'' کہتا ہے، کوئی گڈ نائٹ، اور کوئی گڈ مارننگ کہتا ہے اور کوئی ''نمستے'' کوئی ''آداب'' کہتا ہے۔ مختلف لوگوں نے ملاقات کے وقت دوسرے کو مخاطب کرنے کے لئے مختلف الفاظ اختیار کر رکھے ہیں۔ لیکن اسلام نے ہمیں یہ تعلیم دی کہ جب دوسرے سے ملاقات کرو تو یہ کہو ''السلام علیکم''، جس کے معنی یہ ہیں کہ تم پر سلامتی ہو، ایک طرف تو اس میں سلامتی کی دعا ہے، جبکہ دوسرے کلمات کہنے میں کوئی دعا نہیں ہے۔ اس وجہ سے سننے والے کو، مخاطب کو ان الفاظ کے ذریعہ کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ لیکن جب آپ نے ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' کہا تو آپ نے مخاطب کو تین دعائیں دے دیں، یعنی تم پر اللہ کی سلامتی نازل ہو، تم پر اللہ کی رحمت نازل ہو، اور برکت نازل ہو۔ اگر ایک مرتبہ کا سلام بھی دوسرے مسلمان کے حق میں اللہ کی بارگاہ میں قبول ہو جائے تو ساری زندگی کا بیڑہ پار ہو جائے، اور اس سلام کے ذریعہ دوسرا سبق یہ سکھادیا کہ دو آدمیوں کے ملنے کے وقت جو چیز سب سے زیادہ مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ اس کی طرف سے اس کے اوپر سلامتی ہو اور اس کی ذات سے اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ اور مسلمان ملاقات کے وقت سب سے پہلے یہ پیغام دیدے کہ میں تمہارے لئے سلامتی بن کر آیا ہوں، میں تمہارے لئے عذاب اور تکلیف بن کر نہیں آیا ہوں۔

زبان سے تکلیف نہ دینے کا مطلب

پھر اس حدیث میں دو لفظ استعمال فرمائے، ایک ''من لسانہ'' اور ایک دوسرا ''ویدہ'' یعنی دوسرے مسلمان دو چیزوں سے محفوظ رہیں، ایک اس کی زبان سے، اور دوسرے اس کے ہاتھ سے۔ زبان سے محفوظ رہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ کوئی ایسا کلمہ نہ کہے جس سے سننے والے کا دل ٹوٹے، اور اس کو تکلیف پہنچے۔ اس کی دل آزاری ہو، اگر بالفرض دوسرے مسلمان کی کسی بات پر تنقید کرنی ہے تو بھی ایسے الفاظ استعمال کرے جس سے اس کی دل آزاری بالکل نہ ہو، یا کم سے کم ہو۔ مثلاً اس سے یہ کہہ دیں کہ آپ کی فلاں بات مجھے اچھی نہیں لگی یا آپ فلاں بات پر غور کرلیں، وہ بات اصلاح کے لائق ہے، اور شریعت کے مطابق نہیں ہے۔ لیکن کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا جس سے اس کی بدگوئی ہو، مثلاً گالی گفتار اختیار کرنا، یا گالی گفتار سے بڑھ کر طعنہ دینا۔

''طعنہ'' کا مطلب یہ ہے کہ براہِ راست تو کوئی بات نہیں کی، لیکن لپیٹ کر بات کہہ دی، اور یہ طعنہ ایسی چیز ہے جو دلوں میں زخم ڈال دیتا ہے، عربی شاعر کا ایک شعر ہے:

جِرَاحَاتُ السِّنَانِ لَهَا الْتِيَامُ
وَلَا يَلْتَامُ مَا جَرَحَ اللِّسَانُ

یعنی نیزے کا زخم بھر جاتا ہے، لیکن زبان کا زخم نہیں بھرتا۔ اس لئے اگر کسی کی کوئی بات آپ کو ناگوار ہے تو صاف صاف اس سے کہہ دو کہ فلاں بات آپ کی مجھے پسند نہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے:

﴿يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا﴾(۱)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سیدھی بات کرو۔ لپٹی ہوئی بات مطلوب اور پسندیدہ نہیں، آج کل فقرہ بازی ایک فن بن گیا ہے، فقرہ بازی کا مطلب یہ ہے کہ ایسی بات کی جائے کہ دوسرا شخص سن کر تلملاتا ہی رہ جائے۔ براہِ راست اس سے وہ بات نہیں کہی، بلکہ لپیٹ کر کہہ دی۔ ایسی باتیں کرنے والوں کی لوگ خوب تعریف بھی کرتے ہیں کہ یہ شخص تو بڑا زبردست انشاء پرداز ہے، اور بڑا لطیف مذاق کرنے والا ہے۔

طنز کا ایک عجیب واقعہ

ایک شخص نے شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کسی کتاب کے جواب میں ایک مقالہ لکھا۔ اور اس مقالے میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ پر کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ العیاذ باللہ۔ حضرت والا کے ایک مخلص معتقد تھے، انہوں نے اس کے جواب میں فارسی میں دو شعر کہے، وہ اشعار ادبی اعتبار سے آجکل کے طنز کے مذاق کے لحاظ سے بہت اعلیٰ درجے کے اشعار تھے، وہ اشعار یہ تھے۔

مرا کافر اگر گفتی غمے نیست
چراغ کذب را نبود فروغے
مسلمانت بخوانم در جوابش
دروغے را جزا باشد دروغے

یعنی مجھے اگر تم نے کافر کہا ہے تو مجھے کوئی غم نہیں ہے، کیونکہ جھوٹ کا چراغ کبھی جلا نہیں کرتا۔ تم نے مجھے کافر کہا، میں اس کے جواب میں تمہیں مسلمان کہتا ہوں، اس لئے کہ جھوٹ کا بدلہ جھوٹ ہی ہو سکتا ہے، یعنی تم نے مجھے کافر کہہ کر جھوٹ بولا، اس کے جواب میں میں تمہیں مسلمان کہہ کر جھوٹ بول رہا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ درحقیقت تم مسلمان نہیں ہو۔ اگر یہ جواب کسی ادیب اور ذوق رکھنے والے شاعر کو سنایا جائے تو وہ اس پر خوب داد دے گا۔ اور اس کو پسند کرے گا۔ اس لئے کہ چبھتا ہوا جواب ہے۔ اس لئے کہ دوسرے شعر کے پہلے مصرعے میں یہ کہہ دیا کہ میں تمہیں مسلمان کہتا ہوں۔

(۱) الاحزاب: ۷۰

لیکن دوسرے مصرعے نے اس بات کو بالکل اُلٹ دیا۔ یعنی جھوٹ کا بدلہ تو جھوٹ ہی ہوتا ہے، تم نے مجھے کافر کہہ کر جھوٹ بولا۔ میں تمہیں مسلمان کہہ کر جھوٹ بولتا ہوں، بہر حال یہ اشعار لکھ حضرت کے جو معتقد تھے وہ حضرت والا کی خدمت میں لائے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے جب یہ اشعار سنے تو فرمایا کہ تم نے اشعار تو بہت غضب کے کہے اور بڑا چبھتا ہوا جواب دے دیا۔ لیکن میاں تم نے لپیٹ کر اس کو کافر کہہ تو دیا۔ اور ہمارا یہ طریقہ نہیں ہے کہ دوسروں کو کافر کہیں، چنانچہ وہ اشعار نہیں بھیجے۔

پھر حضرت والا نے خود ان اشعار کی اصلاح فرمائی، اور ایک شعر کا اضافہ فرمایا، چنانچہ فرمایا:

مرا کافر اگر گفتی غمے نیست
چراغ کذب را نبود فروغے
مسلمانت بخوانم در جوابش
دھم شکر بجائے تلخ دوغے
اگر تو مؤمنی فبہا والا
دروغے را جزا باشد دروغے

یعنی اگر تم نے مجھے کافر کہا ہے تو مجھے اس کا کوئی غم نہیں ہے، اس لئے کہ جھوٹ کا چراغ جلا نہیں کرتا۔ میں اس کے جواب میں تمہیں مسلمان کہتا ہوں، اور کڑوی دوا کے مقابلے میں تمہیں شکر کھلاتا ہوں۔ اگر تم مؤمن ہو تو بہت اچھا ہے، اور اگر نہیں ہو تو پھر جھوٹ کی جزا جھوٹ ہی ہوتی ہے۔

اب دیکھئے، وہ مخالف جو آپ پر کفر کا فتویٰ لگا رہا ہے۔ جہنمی ہونے کا فتویٰ لگا رہا ہے، اس کے خلاف بھی طنز کا ایسا فقرہ کہنا بھی پسند نہیں فرمایا جو حدود سے نکلا ہوا تھا، اس لئے کہ یہ طنز تو یہاں دنیا میں رہ جائے گا، لیکن جو لفظ زبان سے نکل رہا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ریکارڈ ہو رہا ہے، قیامت کے روز اس کے بارے میں جواب دینا ہوگا کہ فلاں کے حق میں یہ لفظ کس طرح استعمال کیا تھا؟ لہٰذا طنز کا یہ طریقہ جو حدود سے نکل جائے، کسی طرح بھی پسندیدہ نہیں۔ لہٰذا جب کسی سے کوئی بات کہنی ہو تو صاف اور سیدھی بات کہہ دینی چاہئے۔ لپیٹ کر بات نہیں کہنی چاہئے۔

زبان کے ڈنک کا ایک قصہ

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ بعض لوگوں کی زبان میں ڈنک ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسے لوگ جب بھی کسی سے بات کریں گے، ڈنک ماریں گے، اور طعنہ اور طنز کی بات کریں گے۔ یا کسی پر اعتراض کی بات کریں گے۔ حالانکہ اس انداز سے بات کرنے سے دل میں گرہیں پڑ جاتی ہیں۔ پھر ایک قصہ سنایا کہ ایک صاحب کسی عزیز کے گھر میں گئے تو دیکھا

ان کی بہو بہت غصے میں ہے، اور زبان سے اپنی ساس کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔ اور ساس بھی پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ ان صاحب نے اس کی ساس سے پوچھا کہ کیا بات ہوگئی؟ اتنا غصہ اس کو کیوں آرہا ہے؟ جواب میں ساس نے کہا: بات کچھ بھی نہیں تھی، میں نے صرف دو بول بولے تھے، اس کی خطاء میں پکڑی گئی۔ اور اس کے نتیجے میں یہ ناچی ناچی پھر رہی ہے، اور غصہ کر رہی ہے۔ ان صاحب نے پوچھا کہ وہ دو بول کیا تھے؟ ساس نے کہا کہ میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ باپ تیرا غلام اور ماں تیری لونڈی، بس اس کے بعد سے یہ ناچی ناچی پھر رہی ہے۔

اب دیکھئے، وہ صرف دو بول تھے۔ لیکن ایسے دو بول تھے جو انسان کے اندر آگ لگانے والے تھے۔ لہٰذا طعنہ کا انداز گھروں کو برباد کرنے والا ہے، دلوں میں بغض اور نفرتیں پیدا کرنے والا ہے۔ اس سے بچنا چاہئے۔ اور ہمیشہ صاف اور سیدھی بات کہنی چاہئے۔

پہلے سوچو پھر بولو

زبان کو استعمال کرنے سے پہلے ذرا سوچ لیا کرو کہ جو بات میں کہنے جارہا ہوں، اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اور دوسرے پر اس کا کیا اثر پڑے گا، اور یہ سوچ لیا کرو کہ جو بات میں دوسرے سے کہنے جارہا ہوں، اگر دوسرا شخص مجھ سے یہ بات کہتا تو اس کا مجھ پر کیا اثر ہوتا، مجھے اچھا لگتا یا برا لگتا۔ حضورِ اقدس نبی کریم ﷺ نے ہمیں یہ تعلیم دی اور یہ اصول بتادیا:

"اَحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ"(۱)

یعنی دوسرے کے لئے وہی بات پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو اور یہ جو ہم نے دو پیمانے بنا رکھے ہیں کہ اپنے لئے الگ پیمانہ دوسرے کے لئے الگ پیمانہ، نبی کریم ﷺ نے اس کا خاتمہ فرمادیا۔ اگر یہ ترازو اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں پیدا فرمادے تو پھر یہ سارے جھگڑے اور فسادات ختم ہوجائیں۔

زبان ایک عظیم نعمت

یہ زبان اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے، جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں مفت میں دے رکھی ہے، اس کی قیمت ہمیں ادا نہیں کرنی پڑی، اور پیدائش کے وقت سے لے کر موت تک یہ سرکاری مشین چلتی رہتی ہے۔ لیکن اگر خدانخواستہ یہ نعمت چھن جائے تب اس نعمت کی قدر معلوم ہوگی کہ یہ کتنی عظیم نعمت ہے۔

(۱) سنن الترمذی، کتاب الزهد عَنْ رسول الله، باب من اتقى المحارم فهو أعبد الناس، رقم: ۲۲۲۷، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب الورع والتقوى، رقم: ۴۲۰۷، مسند أحمد، رقم: ۷۷۴۸

اگر فالج ہو جائے، اور زبان بند ہو جائے تو اس وقت یہ حال ہوتا ہے کہ بولنا چاہتے ہیں، اور اپنے دل کی بات دوسروں سے کہنا چاہتے ہیں، لیکن زبان نہیں چلتی۔ اس وقت پتہ چلتا ہے کہ یہ گویائی کی طاقت کتنی عظیم نعمت ہے۔ لیکن ہم لوگ صبح سے لے کر شام اس زبان کو قینچی کی طرح چلا رہے ہیں، اور یہ نہیں سوچتے کہ زبان سے کیا لفظ نکل رہا ہے۔ یہ طریقہ ٹھیک نہیں، بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے تو لو، پھر بولو۔ اگر اس طریقہ پر ہم نے عمل کر لیا تو پھر یہ زبان جو ہمارے لئے جہنم میں جانے کے اسباب پیدا کر رہی ہے، انشاء اللہ جنت میں جانے کے اسباب پیدا کرنے والی اور آخرت کا ذخیرہ جمع کرنے والی بن جائے گی۔

سوچ کر بولنے کی عادت ڈالیں

ایک حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ انسان کو سب سے زیادہ جہنم میں اوندھے منہ ڈالنے والی چیز زبان ہے۔ یعنی جہنم میں اوندھے منہ گرائے جانے کا سب سے بڑا سبب زبان ہے۔(۱)

اس لئے جب بھی اس زبان کو استعمال کرو، استعمال کرنے سے پہلے ذرا سا سوچ لیا کرو، کسی کے ذہن میں سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو جب کوئی ایک جملہ بولنا ہو تو پہلے پانچ منٹ تک سوچے، پھر زبان سے وہ جملہ نکالے تو اس صورت میں بہت وقت خرچ ہو جائے گا؟ بات دراصل یہ ہے کہ اگر شروع شروع میں انسان بات سوچ سوچ کر کرنے کی عادت ڈال لے تو پھر آہستہ آہستہ اس کا عادی ہو جاتا ہے۔ اور پھر سوچنے میں دیر نہیں لگتی۔ ایک لمحہ میں انسان فیصلہ کر لیتا ہے کہ یہ بات زبان سے نکالوں یا نہ نکالوں۔ پھر اللہ تعالیٰ زبان کے اندر ہی ترازو پیدا فرما دیتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں زبان سے پھر صرف حق بات نکلتی ہے۔ غلط اور ایسی بات زبان سے نہیں نکلتی جو اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والی ہو، اور دوسروں کو تکلیف پہنچانے والی ہو۔ بشرطیکہ یہ احساس پیدا ہو جائے کہ اس سرکاری مشین کو آداب کے ساتھ استعمال کرنا ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خادم تھے۔ جن کو "بھائی نیاز" کہا کرتے تھے۔ بڑے ناز پروردہ خادم تھے، اس لئے آنے والے لوگ بھی ان سے محبت کرتے

(۱) سنن الترمذی، کتاب الإیمان عَنْ رسول اللہ، باب ما جاء فی حرمة الصلاة، رقم: ۲۵٤۱، سنن ابن ماجه، کتاب الفتن، باب کف اللسان فی الفتنة، رقم: ۳۹٦۳، مسند أحمد، رقم: ۲۱۰۰۸

تھے۔ اور چونکہ خانقاہ کے اندر ہر چیز کا ایک نظم اور وقت ہوتا تھا، اس لئے آنے والوں پر روک ٹوک بھی کیا کرتے تھے کہ یہ کام مت کرو، یہ کام اس طرح کرو وغیرہ، کسی شخص نے حضرت والا کے پاس ان کی شکایت کی کہ آپ کے یہ خادم بھائی نیاز صاحب بہت سر چڑھ گئے ہیں، اور بہت سے لوگوں پر غصہ اور ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دیتے ہیں۔ حضرت والا کو یہ سن کر غصہ آیا کہ یہ ایسا کرتے ہیں، اور ان کو بلوایا، اور ان کو ڈانٹا کہ کیوں بھائی نیاز، یہ کیا تمہاری حرکت ہے۔ ہر ایک کو تم ڈانٹتے رہتے ہو، تمہیں ڈانٹنے کا حق کس نے دیا ہے؟ جواب میں بھائی نیاز نے کہا کہ حضرت! اللہ سے ڈرو، جھوٹ نہ بولو، ان کا مقصد حضرت والا کو کہنا نہیں تھا، بلکہ مقصد یہ تھا کہ جو لوگ آپ سے شکایت کر رہے ہیں، ان کو چاہئے کہ وہ اللہ سے ڈریں اور جھوٹ نہ بولیں، جس وقت حضرت والا نے بھائی نیاز کی زبان سے یہ جملہ سنا، اسی وقت گردن جھکائی اور "استغفر اللہ استغفر اللہ" کہتے ہوئے وہاں سے چلے گئے، دیکھنے والے حیران رہ گئے کہ یہ کیا ہوا۔ ایک ادنیٰ خادم نے حضرت والا سے ایسی بات کہہ دی۔ لیکن حضرت بجائے ان کو کچھ کہنے کے استغفر اللہ کہتے ہوئے چلے گئے، بعد میں خود حضرت والا نے فرمایا کہ دراصل مجھ سے غلطی ہوگئی تھی کہ میں نے ایک طرف کی بات سن کر فوراً ڈانٹنا شروع کر دیا تھا۔ مجھے چاہئے تھا کہ میں پہلے ان سے پوچھتا کہ لوگ آپ کے بارے میں یہ شکایت کر رہے ہیں۔ آپ کیا کہتے ہیں کہ شکایت درست ہے یا غلط ہے۔ اور دوسرے فریق کی بات سنے بغیر ڈانٹنا شریعت کے خلاف ہے۔ چونکہ یہ بات شریعت کے خلاف تھی، اس لئے میں اس پر استغفار کرتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس شخص کے دل میں اللہ تعالیٰ حق و باطل کو جانچنے کی ترازو پیدا فرما دیتے ہیں، اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ اس کا کوئی کلمہ حد سے متجاوز نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی فہم عطا فرمادے۔ آمین۔

غیر مسلموں کو بھی تکلیف پہنچانا جائز نہیں

اس حدیث میں فرمایا کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں، اس سے بعض اوقات لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس حدیث میں صرف مسلمانوں کو تکلیف سے محفوظ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، لہٰذا غیر مسلم کو تکلیف پہنچانے کی ممانعت اس حدیث میں موجود نہیں ـــــ یہ بات درست نہیں کیونکہ حدیث میں مسلمان کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ مسلمان جس ماحول میں رہتے ہیں وہاں پر عام طور پر مسلمانوں ہی سے ان کو واسطہ پڑتا ہے۔ اس لئے خاص طور پر حدیث میں مسلمانوں کا ذکر کر دیا ہے۔ ورنہ یہ حکم مسلمان اور غیر مسلم سب کے لئے برابر ہے کہ اپنی ذات سے غیر مسلم کو بھی حالتِ امن میں تکلیف پہنچانا جائز نہیں۔ البتہ اگر کافروں کے ساتھ جہاد ہو رہا ہو، اور حالتِ جنگ ہو، تو چونکہ وہ تو کافروں کی شان و شوکت توڑنے کا ایک ذریعہ ہے، اس میں تکلیف پہنچانا

جائز ہے۔ لیکن جن کافروں کے ساتھ حالتِ جنگ نہیں ہے، ان کافروں کو تکلیف پہنچانا بھی اسی حکم میں داخل ہے۔

ناجائز ہونے کی دلیل

اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کی حکومت میں مصر میں رہتے تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علاوہ پوری قوم کفر اور گمراہی میں مبتلا تھی۔ اس وقت یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک اسرائیلی اور قبطی میں جھگڑا ہوگیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قبطی کو ایک مکا مار دیا، جس کے نتیجے میں اس کی موت واقع ہوگئی۔ وہ قبطی اگرچہ کافر تھا، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کی موت کو اپنے لئے گناہ قرار دیتے ہوئے فرمایا:

﴿لَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ فَأَخَافُ أَنْ يَقْتُلُوْنِ﴾(۱)

یعنی مجھ سے ان کا ایک گناہ ہوگیا ہے۔ جس کی وجہ سے مجھے اندیشہ ہے کہ اگر میں ان کے پاس جاؤں گا تو وہ مجھے قتل کردیں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کافر کے قتل کو گناہ سے تعبیر کیا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ تو کافر تھا۔ اور کافر کو قتل کرنا تو جہاد کا ایک حصہ ہے۔ پھر آپ نے اس کو گناہ کیوں قرار دیا، اور اس پر استغفار کیوں کیا؟

جواب یہ ہے کہ وہ قبطی اگرچہ کافر تھا، اور حالتِ امن تھی، اور اگر مسلمان اور کافر ایک ساتھ رہائش پزیر ہوں، اور حالتِ امن ہو، اس حالت میں کافر کا بھی دنیا کے اعتبار سے وہی حق ہے جو مسلمان کا ہے۔ یعنی جس طرح مسلمان کو تکلیف پہنچانا جائز نہیں، اسی طرح کافر کو بھی تکلیف پہنچانا جائز نہیں۔ کیونکہ یہ انسانیت کا حق ہے، اور انسان کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ آدمی بنے۔ مسلمان بننا اور صوفی بننا تو بعد کی بات ہے، پہلا کام یہ ہے کہ انسان آدمی بن جائے۔ اور آدمیت کا حق یہ ہے کہ اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہ دے۔ اس میں مسلمان اور غیر مسلم سب برابر ہیں۔

وعدہ خلافی کرنا زبان سے تکلیف دینا ہے

بعض کام ایسے ہیں جن کو لوگ زبان کے ذریعہ تکلیف دینے کے اندر شمار نہیں کرتے، حالانکہ وہ کام زبان سے تکلیف دینے کے حکم میں داخل ہیں، مثلاً وعدہ خلافی کرنا۔ آپ نے کسی سے یہ وعدہ کرلیا کہ فلاں وقت آپ کے پاس آؤں گا۔ یا فلاں وقت میں آپ کا کام کردوں گا۔ لیکن وقت پر وعدہ پورا نہیں کیا۔ جس کے نتیجے میں اس کو تکلیف پہنچی۔ اس میں ایک طرف تو وعدہ خلافی کا گناہ ہوا۔

(۱) الشعراء: ۱٤

دوسری طرف دوسرے شخص کو تکلیف پہنچانے کا بھی گناہ ہوا۔ یہ زبان سے تکلیف پہنچانے کے حکم میں داخل ہے۔

تلاوتِ قرآن کے وقت سلام کرنا

بعض اوقات انسان کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ میں زبان سے تکلیف پہنچا رہا ہوں، بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ میں تو ثواب کا کام کر رہا ہوں، لیکن حقیقت میں وہ گناہ کا کام کر رہا ہوتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ دوسرے کو تکلیف پہنچاتا ہے۔ مثلاً سلام کرنا کتنی بڑی فضیلت اور ثواب کا کام ہے۔ لیکن شریعت نے دوسرے کی تکلیف کا اتنا خیال کیا ہے کہ سلام کرنے کے بھی احکام مقرر فرما دیئے کہ ہر وقت سلام کرنا جائز نہیں، بلکہ بعض مواقع پر سلام کرنے پر ثواب کے بجائے گناہ ہوگا۔ کیونکہ سلام کے ذریعہ تم نے دوسرے کو تکلیف پہنچائی ہے۔ مثلاً ایک شخص قرآن کریم کی تلاوت میں مشغول ہے، اس کو سلام کرنا جائز نہیں۔ اس لئے کہ ایک طرف تو تمہارے سلام کی وجہ سے اس کی تلاوت میں رخنہ ہوگا۔ اور دوسری طرف اس کو تلاوت چھوڑ کر تمہاری طرف مشغول ہونے میں تکلیف ہوگی۔ اب ایسے وقت کے اندر سلام کرنا زبان سے تکلیف پہنچانے میں داخل ہے۔ اسی طرح اگر لوگ مسجد میں بیٹھ کر ذکر میں مشغول ہوں، ان کو مسجد میں داخل ہوتے وقت سلام کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا رشتہ جڑا ہوا ہے۔ اس کی زبان پر ذکر جاری ہے۔ تمہارے سلام کی وجہ سے اس کے ذکر میں خلل واقع ہوگا، اور اس کو توجہ ہٹانے میں تکلیف بھی ہوگی۔

مجلس کے دوران سلام کرنا

فقہاء کرام رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ ایک شخص دوسرے لوگوں سے کوئی لمبی بات کر رہا ہے۔ اور دوسرے لوگ توجہ سے اس کی بات سن رہے ہیں۔ اگرچہ وہ دنیاوی باتیں ہوں۔ اس حالت میں بھی اس مجلس میں جا کر سلام کرنا جائز نہیں۔ اس لئے کہ وہ لوگ باتیں سننے میں مصروف تھے۔ آپ نے سلام کے ذریعہ ان کی باتوں میں خلل ڈال دیا۔ اور جس کی وجہ سے باتوں کے درمیان میں بدمزگی پیدا ہوگئی۔ اس لئے اس موقع پر سلام کرنا جائز نہیں ــــ اس لئے حکم ہے کہ جب تم کسی مجلس میں شرکت کے لئے جاؤ اور وہاں پر بات شروع ہو چکی ہو تو وہاں پر سلام کے بغیر بیٹھ جاؤ، اس وقت سلام کرنا زبان سے تکلیف پہنچانے کے مرادف ہوگا۔ اس سے اندازہ لگایئے کہ شریعت اس بارے میں کتنی حساس ہے کہ دوسرے شخص کو ہماری ذات سے ادنیٰ تکلیف نہ پہنچے۔

کھانا کھانے والے کو سلام کرنا

ایک شخص کھانا کھانے میں مشغول ہے، اس وقت اس کو سلام کرنا حرام تو نہیں، البتہ مکروہ ضرور ہے، جبکہ یہ اندیشہ ہو کہ تمہارے سلام کے نتیجے میں اس کو تشویش ہوگی۔ اب دیکھئے کہ وہ تو کھانا کھانے میں مشغول ہے، نہ تو وہ عبادت کر رہا ہے، نہ ذکر کرنے میں مشغول ہے، اگر تم سلام کرلو گے تو اس پر پہاڑ نہیں ٹوٹ پڑے گا۔ لیکن سلام کے نتیجے میں اس کو تشویش ہونے اور اس کو ناگوار ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے اس وقت سلام نہ کرے، اس طرح ایک شخص اپنے کسی کام کے لئے تیزی سے جارہا ہے، آپ کو اندازہ ہوا کہ یہ شخص بہت جلدی میں ہے، آپ نے آگے بڑھ کر اس کو سلام کرلیا، اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ اس لئے کہ آپ کو اس کی تیزی سے اندازہ لگانا چاہئے تھا کہ یہ شخص جلدی میں ہے۔ یہ سلام کرنے اور مصافحہ کرنے کا مناسب وقت نہیں ہے۔ ایسے وقت میں اس کو سلام نہ کرو، بلکہ اس کو جانے دو۔ یہ سب باتیں زبان کے ذریعہ تکلیف پہنچانے میں داخل ہیں۔

ٹیلیفون پر لمبی بات کرنا

میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اب ایذاء رسائی کا ایک آلہ بھی ایجاد ہو چکا ہے۔ وہ ہے ''ٹیلیفون''۔ یہ ایک ایسا آلہ ہے کہ اس کے ذریعہ جتنا چاہو دوسرے کو تکلیف پہنچا دو۔ چنانچہ آپ نے کسی کو ٹیلیفون کیا اور اس سے لمبی گفتگو شروع کر دی اور اس کا خیال نہیں کیا کہ وہ شخص اس وقت کسی کام کے اندر مصروف ہے۔ اس کے پاس وقت ہے یا نہیں، میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے ''معارف القرآن'' میں یہ بات لکھی ہے کہ ٹیلیفون کرنے کے آداب میں یہ بات داخل ہے کہ اگر کسی سے لمبی بات کرنی ہو تو پہلے اس سے پوچھ لو کہ مجھے ذرا لمبی بات کرنی ہے، چار پانچ منٹ لگیں گے۔ اگر آپ اس وقت فارغ ہوں تو ابھی بات کرلوں۔ اور اگر فارغ نہ ہوں تو کوئی مناسب وقت بتا دیں، اس وقت بات کرلوں گا۔ سورۃ نور کی تفسیر میں یہ آداب لکھے ہیں، دیکھ لیا جائے، اور خود حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی ان پر عمل فرمایا کرتے تھے۔

باہر کے لاؤڈ اسپیکر پر تقریر کرنا

یا مثلاً آپ کو مسجد کے اندر چند افراد سے کچھ بات کرنی ہے، اور ان تک آواز پہنچانے کے لئے مسجد کے اندر کا لاؤڈ اسپیکر بھی کافی ہو سکتا تھا۔ لیکن آپ نے باہر کا بھی لاؤڈ اسپیکر بھی کھول دیا۔

جس کے نتیجے میں پورے علاقے اور پورے محلے کے لوگوں تک آواز پہنچ رہی ہے۔ اب محلے میں کوئی شخص اپنے گھر کے اندر تلاوت کرنا چاہتا ہے، یا ذکر کرنا چاہتا ہے، یا سونا چاہتا ہے، یا کوئی شخص بیمار ہے۔ وہ آرام کرنا چاہتا ہے۔ مگر آپ نے زبردستی اپنا وعظ پورے محلے والوں پر مسلط کر دیا۔ یہ عمل بھی زبان کے ذریعہ تکلیف پہنچانے میں داخل ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے کا ایک واقعہ

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک صاحب مسجد نبوی میں آکر وعظ کیا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ مسجد نبوی سے بالکل متصل تھا۔ اگرچہ اس زمانے میں لاؤڈ اسپیکر نہیں تھا، مگر وہ صاحب بلند آواز سے وعظ کرتے تھے۔ ان کی آواز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کے اندر پہنچتی۔ آپ اپنی عبادات تلاوت ذکر واذکار یا دوسرے کاموں میں مشغول ہوتیں، اور ان صاحب کی آواز سے آپ کو تکلیف پہنچتی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو پیغام بھجوایا کہ یہ ایک صاحب اس طرح میرے حجرے کے قریب آکر وعظ کرتے ہیں، مجھے اس سے تکلیف ہوتی ہے۔ آپ ان سے کہہ دیں کہ وعظ کسی اور جگہ پر جا کر کریں، یا آہستہ آواز سے کریں۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ان صاحب کو بلایا اور ان کو سمجھایا کہ آپ کی آواز سے اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو تکلیف ہوتی ہے، آپ اپنا وعظ اس جگہ پر بند کر دیں۔ چنانچہ وہ صاحب رک گئے۔ مگر وہ صاحب وعظ کے شوقین تھے۔ چند روز کے بعد دوبارہ وعظ کہنا شروع کر دیا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی کہ انہوں نے دوبارہ وعظ کہنا شروع کر دیا ہے۔ آپ نے دوبارہ ان کو بلایا اور فرمایا کہ اب میں تم کو آخری مرتبہ منع کر رہا ہوں۔ اب اگر آئندہ مجھے اطلاع ملی کہ تم نے یہاں آکر وعظ کہا ہے تو یہ لکڑی کی چھڑی تمہارے اوپر توڑ دوں گا۔ یعنی اتنا ماروں گا کہ تمہارے اوپر یہ لکڑی ٹوٹ جائے گی۔

آج ہماری حالت

آج ہم لوگ اس کا بالکل خیال نہیں کرتے۔ مسجد میں وعظ ہو رہا ہے، اور سارے محلے والوں کو عذاب کے اندر مبتلا کر رکھا ہے۔ لاؤڈ اسپیکر فل آواز میں کھلا ہوا ہے۔ محلے میں کوئی شخص سو نہیں سکتا۔ اگر کوئی شخص جا کر منع کرے تو اس کے اوپر طعن و تشنیع شروع ہو جاتی ہے کہ یہ دین کے کام میں رکاوٹ ڈالنے والا ہے۔ حالانکہ اس وعظ کے ذریعہ شریعت کے حکم کو پامال کیا جا رہا ہے۔ دوسروں کو تکلیف پہنچائی جا رہی ہے، حتیٰ کہ عالم کے آداب میں یہ لکھا ہے:

"يَنْبَغِيْ لِلْعَالِمِ اَنْ لَا يَعْدُوَ صَوْتَهٗ مَجْلِسَهٗ" (۱)

عالم کی آواز اس کی مجلس سے دور نہ جائے۔ یہ سب باتیں زبان سے تکلیف پہنچانے میں داخل ہیں، یہ زبان اللہ تعالیٰ نے اس لئے دی ہے کہ یہ اللہ کا ذکر کرے، یہ زبان سچائی کی باتیں کرے۔ یہ زبان اس لئے دی گئی ہے کہ اس کے ذریعہ تم لوگوں کے دلوں پر مرہم رکھو۔ یہ زبان اس لئے نہیں دی گئی ہے کہ اس کے ذریعہ تم لوگوں کو تکلیف پہنچاؤ۔

وہ عورت دوزخی ہے

حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ ایک خاتون کے بارے میں سوال کیا گیا کہ وہ خاتون سارے دن روزہ رکھتی ہے۔ اور ساری رات عبادت کرتی ہے۔ لیکن وہ خاتون اپنے پڑوسیوں کو تکلیف پہنچاتی ہے، وہ خاتون کیسی ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ وہ عورت دوزخی ہے جہنم میں جائے گی۔ (۲)

اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد اس کی تشریح میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "اس حدیث میں اس کی شناعت ہے کہ لوگوں کو ناحق ایذا دی جاوے، اور اس سے معاملات کا عبادت پر مقدم ہونا بھی مذکور ہے"

یعنی لوگوں کے ساتھ برتاؤ میں درستگی عبادات کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ معاملات کا باب عملاً اتنا متروک ہوگیا ہے کہ آج کوئی شخص دوسرے کو یہ نہ سمجھاتا ہے اور نہ سکھاتا ہے کہ یہ بھی دین کا ایک حصہ ہے۔

ہاتھ سے تکلیف مت دیجئے

دوسری چیز جس کا ذکر اس حدیث میں فرمایا، وہ ہے "ہاتھ" یعنی تمہارے ہاتھ سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ اب ہاتھ سے تکلیف پہنچنے کی بعض صورتیں تو ظاہر ہیں۔ مثلاً کسی کو ماردیا۔ ہر شخص دیکھ کر یہ کہے گا کہ اس نے ہاتھ کے ذریعہ تکلیف پہنچائی، لیکن ہاتھ سے تکلیف پہنچانے کی بہت سی صورتیں ایسی ہیں کہ لوگ ان کو ایذا دینے کے اندر شمار نہیں کرتے۔ حالانکہ ہاتھ سے ایذا دینے کی بھی بے شمار صورتیں ہیں۔ اور حدیث شریف میں "ہاتھ" کا ذکر کرکے ہاتھ سے صادر ہونے والے افعال

---

(۱) الجامع لأخلاق الراوی وآداب السامع للخطیب البغدادی (۳/۱٤٤)، یہ قول حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب ہے۔

(۲) مسند أحمد بن حنبل، رقم: ۹۲۹۸

کی طرف اشارہ کیا ہے، کیونکہ زیادہ تر افعال انسان اپنے ہاتھ سے انجام دیتا ہے، اسی وجہ سے علماء نے ہاتھ کے ذکر میں تمام افعال داخل کیے ہیں۔ چاہے اس فعل میں براہِ راست ہاتھ ملوث نظر نہ آ رہا ہو۔

کسی چیز کو بے جگہ رکھنا

مثلاً ایک مشترک رہائش میں آپ دوسرے لوگوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ اس مکان میں کسی مشترکہ استعمال کی چیز کی ایک جگہ مقرر ہے۔ مثلاً تولیہ رکھنے کی ایک جگہ مقرر ہے۔ آپ نے تولیہ استعمال کرنے کے بعد اس کو بے جگہ ڈال دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب دوسرا شخص وضو کر کے آیا، اور تولیہ کو اس کی جگہ پر تلاش کیا اور اس کو نہ ملا، اب وہ تولیہ ڈھونڈ رہا ہے، اس کو تکلیف ہو رہی ہے۔ یہ جو تکلیف اس کو پہنچی، یہ آپ کے ہاتھ کی کرتوت کا نتیجہ ہے کہ آپ نے وہ تولیہ اس کی صحیح جگہ سے اُٹھا کر بے جگہ ڈال دیا۔ یہ اذیت رسانی ہوئی جو کہ اس حدیث کے تحت حرام ہے۔ یہ تولیہ کی ایک مثال دی، ورنہ چاہے مشترک لوٹا ہو، یا صابن ہو یا گلاس ہو یا جھاڑو وغیرہ ہو، ان کو اپنی مقرر جگہ سے اُٹھا کر بے جگہ رکھنا ایذا رسانی میں داخل ہے۔

یہ گناہِ کبیرہ ہے

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ ہمیں یہ چھوٹی چھوٹی باتیں سکھا گئے۔ جب ہم چھوٹے تھے تو ہم بھی یہ حرکت کرتے تھے کہ ایک چیز اس کی جگہ سے اُٹھا کر استعمال کی۔ اور دوسری جگہ لے جا کر ڈال دی۔ جب ان کو ضرورت ہوتی تو وہ گھر کے اندر تلاش کرتے رہتے۔ ایک دن ہم لوگوں سے فرمایا کہ تم لوگ جو حرکت کرتے ہو کہ ایک چیز اُٹھا کر دوسری جگہ ڈال دی، یہ بداخلاقی تو ہے ہی، اس کے ساتھ ساتھ یہ گناہِ کبیرہ بھی ہے، اس لئے کہ اس عمل کے ذریعہ مسلمان کو تکلیف پہنچتی ہے، اور ایذاء مسلم گناہِ کبیرہ ہے۔ اس دن ہمیں پتہ چلا کہ یہ بھی دین کا حکم ہے، اور یہ بھی گناہِ کبیرہ ہے، ورنہ اس سے پہلے اس کا احساس بھی نہیں تھا۔ یہ سب باتیں ہاتھ سے تکلیف پہنچانے میں داخل ہیں۔

اپنے عزیز اور بیوی بچوں کو تکلیف دینا

ایک بات یہ بھی سمجھ لیں کہ مشترک رہائش میں یہ ضروری نہیں ہے کہ جن لوگوں کے ساتھ رہائش پزیر ہیں وہ اجنبی ہوں۔ بلکہ اپنے قریبی رشتہ دار، بیوی، بچے، بہن بھائی سب اس میں داخل ہیں۔ آج ہم لوگ اپنے ان قریبی رشتہ داروں کو تکلیف پہنچنے کا احساس نہیں کرتے۔ بلکہ یہ سوچتے ہیں کہ اگر ہمارے عمل سے بیوی کو تکلیف پہنچ رہی ہے تو پہنچا کرے، یہ ہماری بیوی ہی تو ہے۔ یا اولاد کو یا

بہن بھائی کو تکلیف پہنچ رہی ہے تو پہنچا کرے، ہماری اولاد ہی تو ہیں، ہمارے بہن بھائی تو ہیں۔ ارے اگر وہ تمہاری بہن یا تمہارا بھائی بن گیا ہے تو اس نے آخر کیا خطا کر لی ہے؟ یا کوئی خاتون تمہاری بیوی بن گئی ہے، یا یہ بچے تمہاری اولاد بن گئے ہیں تو انہوں نے کیا خطا کر لی ہے کہ اب ان کو تم تکلیف پہنچا رہے ہو۔ حالانکہ حضورِ اقدس ﷺ کا تو یہ حال تھا کہ تہجد کے وقت صرف اس خیال سے ہر کام بہت آہستہ آہستہ کرتے کہ کہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی آنکھ نہ کھل جائے۔ لہٰذا جس طرح غیروں کو تکلیف پہنچانا حرام ہے، اسی طرح اپنے گھر والوں کو اپنے بہن بھائیوں کو اپنے بیوی بچوں کو بھی تکلیف پہنچانا حرام ہے۔

اطلاع کیے بغیر کھانے کے وقت غائب رہنا

مثلاً آپ گھر والوں کو بتا کر چلے گئے کہ فلاں وقت آ کر کھانا کھاؤں گا۔ لیکن اس کے بعد اطلاع کیے بغیر کہیں اور چلے گئے۔ اور کھانا بھی وہیں کھالیا۔ اور وہاں پر گھنٹوں گزار دیئے۔ اور وقت پر گھر واپس نہیں پہنچے۔ اور گھر پر آپ کی بیوی کھانے پر آپ کا انتظار کر رہی ہے۔ اور پریشان ہو رہی ہے کہ کیا وجہ پیش آ گئی کہ واپس نہیں آئے۔ کھانا لیے بیٹھی ہے، آپ کا یہ عمل گناہِ کبیرہ ہے۔ اس لئے کہ آپ نے اس عمل کے ذریعہ ایک ایسی ذات کو تکلیف پہنچائی جس کو اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات سے وابستہ کر دیا تھا۔ آپ کو اگر کھانا کسی اور جگہ کھانا تھا تو آپ اس کو اطلاع کر کے اس کے ذہن کو فارغ کر دیتے۔ اس کو انتظار اور پریشانی کی تکلیف میں مبتلا نہ کرتے۔ لیکن آج ہم لوگ اس بات کا دھیان نہیں کرتے، اور یہ سوچتے ہیں کہ وہ تو ہے، ہماری بیوی ہی تو ہے، ہماری ماتحت ہے۔ اگر انتظار کر رہی ہے تو کرے۔ حالانکہ یہ عمل گناہِ کبیرہ اور حرام ہے اور ایذاءِ مسلم ہے۔

راستے کو گندہ کرنا حرام ہے

یا مثلاً سڑک پر چلتے ہوئے آپ نے چھلکا یا گندگی سڑک پر پھینک دی، اب اس کی وجہ سے کسی کا پاؤں پھسل جائے۔ یا کسی کو تکلیف پہنچ جائے تو قیامت کے روز آپ کی پکڑ ہو جائے گی۔ اور اگر اس سے تکلیف نہ بھی پہنچی، لیکن آپ نے کم از کم گندگی تو پھیلا دی۔ اس گندگی پھیلانے کا گناہ آپ کو ہوگا۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب حضورِ اقدس ﷺ سفر پر ہوتے اور سفر کے دوران آپ کو راستہ میں کہیں پیشاب کرنے کی ضرورت پیش آتی تو آپ پیشاب کرنے کے لئے مناسب جگہ کی تلاش کے لئے آپ اتنی ہی جستجو فرماتے جتنا ایک آدمی مکان بنانے کے لئے مناسب جگہ تلاش کرتا

ہے۔ ایسا کیوں کرتے؟ اس لئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لوگوں کی گزرگاہ ہو، اور وہاں گندگی کی وجہ سے لوگوں کو تکلیف پہنچے۔

ایک اور حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ ایمان کے ستر سے زیادہ شعبے ہیں، جن میں سے ایمان کا اعلیٰ ترین شعبہ کلمہ ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کہنا اور ادنیٰ ترین شعبہ ایمان کا راستے سے گندگی کو اور تکلیف دینے والی چیز کو دور کر دینا ہے۔ (۱)

مثلاً راستے میں کوئی کانٹا یا چھلکا پڑا ہوا ہے۔ آپ نے اُٹھا کر اس کو دور کر دیا۔ تا کہ گزرنے والے کو تکلیف نہ ہو، یہ ایمان کا ادنیٰ درجے کا شعبہ ہے۔ لہٰذا جب راستے سے تکلیف دینے والی چیز کو دور کرنا ایمان کا شعبہ ہو تو پھر راستے میں تکلیف دینے والی چیز ڈالنا کفر کا شعبہ ہوگا۔ ایمان کا شعبہ نہ ہوگا۔ یہ سب باتیں اس حدیث کے تحت داخل ہیں۔

ذہنی تکلیف میں مبتلا کرنا حرام ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں زبان اور ہاتھ کے ذریعہ ظاہری افعال کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ لیکن اگر آپ نے اپنی زبان یا ہاتھ سے کوئی ایسا کام کیا جس سے دوسرے کو ذہنی تکلیف ہوئی تو وہ بھی اس حدیث میں داخل ہے۔ مثلاً آپ نے کسی سے قرض لیا اور اس سے یہ وعدہ کرلیا کہ اتنے دنوں کے اندر ادائیگی کر دوں گا۔ اب اگر آپ وقت پر ادائیگی نہیں کر سکتے تو اس کو بتا دیں کہ میں فی الحال ادائیگی نہیں کر سکتا۔ اتنے دن کے بعد ادا کروں گا۔ پھر بھی ادا نہ کر سکو تو پھر بتا دو۔ لیکن یہ ٹھیک نہیں ہے کہ آپ اس کو لٹکا دیں۔ اور اس کا ذہن الجھا دیں۔ وہ بیچارہ انتظار میں ہے کہ آپ آج قرض ادا کر دیں گے یا کل دے دیں گے۔ لیکن آپ نہ تو اس کو اطلاع دیتے ہیں۔ اور نہ قرض واپس کرتے ہیں۔ اس طرح آپ نے اس کو ذہنی اذیت اور تکلیف میں مبتلا کر دیا۔ اب وہ نہ تو کوئی پلان بنا سکتا ہے، نہ وہ کوئی منصوبہ بندی کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ اس کو پتہ ہی نہیں ہے کہ اس کو قرض واپس ملے گا یا نہیں؟ اگر ملے گا تو کب تک ملے گا۔ آپ کا یہ طرزِ عمل بھی ناجائز اور حرام ہے۔

ملازم پر ذہنی بوجھ ڈالنا

حتیٰ کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہاں تک فرمایا کہ آپ کا ایک نوکر اور ملازم ہے۔ اب آپ

(۱) صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان عدد شعب الإیمان وأفضلها وأدناها......، رقم: ۵۱، سنن النسائی، کتاب الإیمان وشرائعه، باب ذکر شعب الإیمان، رقم: ۴۹۱۹، سنن ابن ماجه، المقدمة، باب فی الإیمان، رقم: ۵۶، مسند أحمد، رقم: ۸۹۹۳

نے چار کام ایک ساتھ بتادیئے کہ پہلے یہ کام کرو۔ پھر یہ کام، پھر یہ کام کرنا۔ پھر یہ کام کرنا۔ اس طرح آپ نے چار کاموں کو یاد رکھنے کا بوجھ اس کے ذہن پر ڈال دیا۔ اگر ایسا کرنا بہت ضروری نہیں ہے تو ایک ساتھ چار کاموں کا بوجھ اس کے ذہن پر نہیں ڈالنا چاہئے۔ بلکہ اس کو پہلے ایک کام بتادو۔ جب وہ پہلا کام کر چکے تو اب دوسرا کام بتایا جائے۔ وہ اس کو کر چکے تو پھر تیسرا کام بتایا جائے۔ چنانچہ خود اپنا طریقہ بتایا کہ میں اپنے نوکر کو ایک وقت میں ایک کام بتاتا ہوں۔ اور دوسرے کام جو اس سے کرانے ہیں ان کو یاد رکھنے کا بوجھ اپنے سر پر رکھتا ہوں۔ نوکر کے سر پر نہیں رکھتا، تاکہ وہ ذہنی بوجھ میں مبتلا نہ ہو جائے۔ جب وہ ایک کام کر کے فارغ ہو جاتا ہے تو پھر دوسرا کام بتاتا ہوں۔ اس سے اندازہ لگایئے کہ حضرت والاؒ کی نگاہ کتنی دوررس تھی۔

نماز پڑھنے والے کا انتظار کس جگہ کیا جائے؟

یا مثلاً ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے۔ آپ کو اس سے کچھ کام ہے۔ اب آپ اس کے بالکل قریب جا کر بیٹھ گئے۔ اور اس کے ذہن پر یہ فکر سوار کر دی کہ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ تم جلدی سے اپنی نماز پوری کرو تاکہ میں تم سے ملاقات کروں، اور کام کراؤں۔ چنانچہ آپ کے قریب بیٹھنے کی وجہ سے اس کی نماز میں خلل واقع ہو گیا۔ اور اس کے دماغ پر یہ بوجھ بیٹھ گیا کہ یہ شخص میرے انتظار میں ہے، اس کا انتظار ختم کرنا چاہئے۔ اور جلدی سے نماز ختم کر کے اس سے ملاقات کرنی چاہئے، حالانکہ یہ بات آداب میں داخل ہے کہ اگر آپ کو کسی ایسے شخص سے ملاقات کرنی ہے جو اس وقت نماز میں مصروف ہے تو تم دور بیٹھ کر اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرو۔ جب وہ خود سے فارغ ہو جائے تو پھر ملاقات کرو۔ لیکن اس کے بالکل قریب بیٹھ کر یہ تأثر دینا کہ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ لہٰذا تم جلدی نماز پوری کرو۔ ایسا تأثر دینا ادب کے خلاف ہے ـــــ یہ سب باتیں دوسرے کو ذہنی تکلیف میں مبتلا کرنے میں داخل ہیں۔ الحمد للہ۔ جن بزرگوں کو ہم نے دیکھا، اور جن سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں دین سیکھنے کی توفیق عطاء فرمائی، اللہ تعالیٰ نے ان پر دین کے تمام شعبے برابر رکھے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ دین کے ایک یا دو شعبوں پر تو عمل ہے، اور باقی شعبے نظروں سے اوجھل ہیں۔ اور ان کی طرف سے غفلت ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَاۤفَّةً﴾(۱)

"اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ"

یہ نہ ہو کہ عبادت نماز روزہ وغیرہ تو کر لیے، لیکن معاشرت، معاملات اور اخلاق میں دین کے

(۱) البقرة: ۲۰۸

احکام کی پرواہ نہ کی، حالانکہ یہ سب دین کا حصہ ہے۔

''آداب المعاشرت'' پڑھئے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک مختصری کتاب ہے ''آداب المعاشرت''، اس میں معاشرت کے آداب تحریر فرمائے ہیں، یہ کتاب ہر مسلمان کو ضرور پڑھنی چاہئے۔ اس کتاب کے شروع میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ میں اس کتاب میں معاشرت کے تمام آداب تو نہیں لکھ سکا، بلکہ متفرق طور پر جو آداب ذہن میں آئے وہ اس میں جمع کر دیئے ہیں تا کہ جب تم ان آداب کو پڑھو گے تو خود بخود تمہارا ذہن اس طرف منتقل ہوگا کہ جب یہ بات ادب میں داخل ہے تو فلاں جگہ پر بھی ہمیں اس طرح کرنا چاہئے، آہستہ آہستہ خود تمہارے ذہن میں وہ آداب آتے چلے جائیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے ذہن کو کھول دیں گے۔ چنانچہ معاشرت ہی کا ایک ادب یہ ہے کہ گاڑی ایسی جگہ کھڑی کرو کہ اس کی وجہ سے دوسروں کا راستہ بند نہ ہو، اور دوسرے کو تکلیف نہ ہو، یہ بھی دین کا ایک حصہ ہے۔ آج ہم نے ان چیزوں کو بھلا دیا ہے۔ اس کی وجہ سے نہ صرف ہم گناہ گار ہو رہے ہیں، بلکہ دین کی غلط نمائندگی کر رہے ہیں۔ چنانچہ ہمیں دیکھ کر باہر سے آنے والا شخص یہ کہے گا کہ یہ لوگ نماز تو پڑھتے ہیں، لیکن گندگی بہت پھیلاتے ہیں۔ اور دوسروں کو تکلیف پہنچاتے ہیں، اس سے اسلام کا کیا رخ سامنے آئے گا؟ اور وہ ان چیزوں سے اسلام کی طرف کشش محسوس کرے گا یا اسلام سے دور بھاگے گا؟ اللہ بچائے۔ ہم لوگ دین کا ایک اچھا نمونہ پیش کر کے لوگوں کے لئے کشش کا باعث بننے کے بجائے ہم دین سے رکاوٹ کا باعث بن رہے ہیں۔ معاشرت کے اس باب کو ہم نے خاص طور پر چھوڑ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس کوتاہی سے جلد از جلد نجات عطا فرمائے۔ اور ہماری فہم کو درست فرمائے۔ اور ہمیں دین کے تمام شعبوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

مسلمان اور ایذا رسانی ☆

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

"عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ وَالْمُؤْمِنُ مَنْ اٰمَنَهُ النَّاسُ عَلٰى دِمَائِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ))(۱)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں، اور مؤمن وہ ہے کہ لوگوں کو اس کی طرف سے اپنے جان و مال کو کوئی خطرہ نہ ہو''

اس حدیث میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسلمان کی بعض امتیازی خصوصیات بیان فرما کر دین کے ایک بڑے وسیع شعبے کی طرف توجہ دلائی ہے جسے لوگ ناواقفیت کے سبب دین کا شعبہ نہیں سمجھتے۔ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ دین صرف چند عقائد، نماز روزے اور کچھ مخصوص عبادتوں کا نام ہے، اور ان عبادتوں کو بجالانے کے بعد انسان اپنے عام روزمرہ کی زندگی میں آزاد اور خودمختار ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے جہاں ہمیں نماز روزے اور دوسری عبادتوں کی تعلیم دی ہے، وہاں زندگی کے ہر شعبے میں ایسی تعلیمات عطا کی ہیں جن پر عمل کر کے ہم اپنے معاشرے کو جنت کا نمونہ بنا سکتے ہیں۔

☆ نشری تقریریں، ص:۸۹-۹۲، فرد کی اصلاح، ص:۹۳-۹۵

(۱) صحيح البخاری، كتاب الإيمان، باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده، رقم: ٩، صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب بيان تفاضل الإسلام وأی أموره أفضل، رقم: ٥٨، سنن الترمذی، كتاب الإيمان عَنْ رسول الله، باب ما جاء فی أن المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده، رقم: ٢٥٥١، سنن النسائی، كتاب الإيمان وشرائعه، باب صفة المسلم، رقم: ٤٩١٠، سنن أبی داؤد، كتاب الجهاد، باب فی الهجرة هل انقطعت، رقم: ٢١٢٢

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات میں صرف ایک چوتھائی حصہ عقائد اور عبادات پر مشتمل ہے، اور باقی تین چوتھائی تعلیمات معاملات، اخلاق اور معاشرت سے متعلق ہیں۔ دین کے ان اہم شعبوں میں سے ایک اہم شعبہ معاشرت ہے، جس میں دوسرے انسانوں کے ساتھ میل جول اور باہم زندگی گزارنے کے آداب بتائے گئے ہیں۔

جو حدیث ابھی آپ کو سنائی گئی ہے اس میں آنحضرت ﷺ نے اسلام کی معاشرتی تعلیمات کا نہایت جامع خلاصہ بیان فرمادیا ہے، کیونکہ اسلام نے معاشرت سے متعلق جتنے احکام دیئے ہیں ان کا آخری مقصد یہ ہے کہ اپنی ذات سے کسی بھی مسلمان، بلکہ کسی بھی انسان کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچنے دی جائے۔ آنحضرت ﷺ نے اسلامی زندگی کے اس اصول کو انتہائی پُرزور طریقے سے ذہن نشین کرانے کے لئے فقرہ یہ ارشاد فرمایا ہے کہ ''مسلمان درحقیقت وہی ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں''، یعنی دوسروں کو تکلیف پہنچانے سے احتراز اسلام کا وہ بنیادی نشان ہے جس سے ایک مسلمان پہچانا جاتا ہے، لہٰذا جو شخص دوسروں کو تکلیف پہنچاتا ہو وہ قانونی اور لفظی اعتبار سے خواہ مسلمان ہی کہلائے، لیکن ایک سچے مسلمان کی حقیقی صفات اور بنیادی علامتوں سے کوسوں دور ہے۔

پھر اس حدیث کے پہلے جملے میں تو الفاظ یہ ارشاد فرمائے گئے ہیں کہ ''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں'' لیکن اگلے ہی فقرے میں ارشاد ہے کہ ''لوگوں کی جان و مال کو اس سے کوئی خطرہ نہ ہو'' نیز صحیح ابن حبان کی روایت میں الفاظ یہ ہیں:

((مَنْ سَلِمَ النَّاسُ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ))(۱)

یعنی ''جس کے ہاتھ اور زبان سے تمام لوگ محفوظ رہیں''

جس سے معلوم ہوا کہ مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ کسی بھی انسان کو تکلیف نہ پہنچائے خواہ وہ انسان مسلمان ہو یا غیر مسلم۔ لہٰذا جس طرح کسی مسلمان کی ایذا رسانی سے بچنا مسلمان کے لئے ضروری ہے، اسی طرح کسی غیر مسلم کو بھی بلاوجہ پریشان کرنا یا تکلیف پہنچانا حرام ہے۔

پھر اس حدیث میں ہاتھ اور زبان کا ذکر محض اس لئے کر دیا گیا ہے کہ عام طور سے ایذا رسانی انہی راستوں سے ہوتی ہے، ورنہ حدیث کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو کسی بھی طرح کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ پہنچے، نہ ہاتھ سے، نہ زبان سے اور نہ کسی اور طریقے سے۔

ہاتھ سے تکلیف پہنچانے کا مطلب تو ظاہر ہے کہ اس میں ناحق مار پیٹ، لڑائی جھگڑا وغیرہ داخل ہے، لیکن زبان سے تکلیف پہنچانے میں بے شمار گناہ آجاتے ہیں، مثلاً جھوٹ، دھوکہ فریب،

(۱) مسند أحمد، رقم: ۷۰٦٤، شعب الإيمان، السابع والسبعون من شعب الإيمان، وهو باب في أن يحب الرجل للأخ، رقم: ۱۱۱۲۳۔

بدعہدی، غیبت، چغل خوری، گالم گلوچ، یا کوئی بھی ایسی بات کہنا جس سے دوسرے کا دل ٹوٹے یا اسے ذہنی یا جسمانی اذیت میں مبتلا ہونا پڑے، اور ان کے علاوہ بھی دوسرے کو تکلیف پہنچانے کے جتنے طریقے تصور میں آسکتے ہیں ان سب کو اس حدیث میں ایسا ہی حرام قرار دیا گیا ہے جیسے چوری، ڈاکہ، شراب نوشی اور دوسرے کبیرہ گناہ حرام ہیں، چنانچہ اسلام نے اپنے ہر حکم میں دوسروں کو تکلیف سے بچانے کا خاص اہتمام کیا ہے، مثلاً حکم یہ ہے کہ جمعہ کے روز جب مسجد میں جاؤ تو لوگوں کی گردنیں پھلانگ کر آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو، بلکہ جہاں جگہ ملے بیٹھ جاؤ، نیز جمعہ کے لئے جاؤ تو نہا دھو کر جاؤ، کوئی بدبودار چیز کھا کر نہ جاؤ، تاکہ پاس بیٹھنے والوں کو تکلیف نہ پہنچے، نیز حکم ہے کہ نماز پڑھنے کے لئے ایسی جگہ نہ کھڑے ہو کہ دوسروں کے لئے گزرنے کا راستہ بند ہو جائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تہجد کے لئے بیدار ہوتے تو ہر کام اتنی آہستگی سے کرتے تھے کہ کسی کی آنکھ نہ کھلے۔[1]

اس لئے کہ اپنی نفلی عبادت کی خاطر دوسروں کو تکلیف پہنچانا اسلام کے مزاج کے بالکل خلاف ہے۔

پھر تکلیف پہنچانے کی بھی بعض صورتیں تو بالکل واضح ہوتی ہیں، مثلاً مار پیٹ، گالم گلوچ وغیرہ، لیکن بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا ارتکاب ہم محض بے پروائی اور بے خیالی میں کر گزرتے ہیں، مثلاً سڑک پر پھل کا چھلکا پھینکتے وقت کسی کے خیال میں یہ بات نہیں ہوتی کہ یہ کسی گناہ کا ارتکاب ہو رہا ہے، حالانکہ اگر اس چھلکے کی وجہ سے کوئی انسان پھسل کر گر پڑے تو اس کی تکلیف کا سارا گناہ اس شخص پر ہے جس نے وہ چھلکا بے جگہ پھینکا تھا، اور اس سے جتنے آدمیوں کو تکلیف پہنچے گی ان سب کا گناہ اس کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا۔

اس طرح عام راستوں پر کوڑا کرکٹ ڈال دینا، سواری کو غلط جگہ کھڑا کرنا، بلاضرورت لاؤڈ اسپیکر استعمال کر کے لوگوں کے آرام وسکون میں خلل انداز ہونا، جس سے لوگوں کو سخت تکلیف پہنچتی ہے، محض بدتہذیبی اور ناشائستگی ہی نہیں ہے بلکہ اس حدیث کی رو سے شرعی گناہ بھی ہے۔ لہٰذا اس حدیث کی تعلیم یہ ہے کہ مسلمان کو اپنے ہر کام میں یہ سوچنا چاہئے کہ اس سے کوئی دوسرا شخص کسی ذہنی یا جسمانی تکلیف میں مبتلا تو نہیں ہوگا، اور جس کام سے کسی کو تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہو اس سے مکمل احتراز کرنا چاہئے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

---

(۱) صحیح مسلم، كتاب الجنائز، باب ما يقال عند دخول القبور والدعاء لأهلها، رقم: ١٦١٩، مسند أحمد، رقم: ٢٤٦٧١

دوستی اور دشمنی میں اعتدال ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

اَمَّا بَعْدُ!

"عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: ((اَحْبِبْ حَبِیْبَكَ هَوْنًا مَّا عَسٰی اَنْ یَّكُوْنَ بَغِیْضَكَ یَوْمًا مَا وَاَبْغِضْ بَغِیْضَكَ هَوْنًا مَّا عَسٰی اَنْ یَّكُوْنَ حَبِیْبَكَ یَوْمًا مَا))(۱)

دوستی کرنے کا زرّین اصول

یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور سند کے اعتبار سے صحیح حدیث ہے۔ یہ بڑی عجیب حدیث ہے اور اس میں بڑا عجیب سبق دیا ہے اور اس میں ہماری پوری زندگی کے لئے زرّین اصول بیان فرمایا ہے۔ وہ یہ کہ حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اپنے دوست سے دھیرے دھیرے محبت کرو۔ یعنی اعتدال سے کرو، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ تمہارا وہ دوست کسی دن تمہارا دشمن بن جائے اور مبغوض بن جائے۔ اور جس شخص سے تمہیں دشمنی اور بغض ہے، اس کے ساتھ بغض اور دشمنی بھی دھیرے دھیرے کرو، کیا پتہ کہ وہ دشمن کسی دن تمہارا محبوب اور دوست بن جائے۔

اس حدیث میں یہ عجیب تعلیم ارشاد فرمائی کہ دوست سے دوستی اور محبت بھی اعتدال کے ساتھ کرو اور جس سے دشمنی ہو تو اس کے ساتھ دشمنی بھی اعتدال کے ساتھ ہو۔ یاد رکھو، دنیا کی دوستیاں اور محبتیں بھی پائیدار نہیں ہوتیں اور دنیا کی دشمنیاں اور بغض بھی پائیدار نہیں ہوتا۔ ہوسکتا ہے کہ کسی وقت وہ دوستی دشمنی میں تبدیل ہو جائے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی وقت وہ دشمنی دوستی میں تبدیل ہو جائے۔ اس لئے اعتدال سے آگے نہ بڑھو۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۰/۸۴ تا ۹۶)، بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد بیت المکرّم، کراچی۔

(۱) سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول اللّٰه، باب ما جاء فی الإقتصاد فی الحب والبغض، رقم: ۱۹۲۰

ہماری دوستی کا حال

اس حدیث میں ان لوگوں کو خاص طور پر زرّین تعلیم عطا فرمائی جن کا یہ حال ہوتا ہے کہ جب ان کی دوستی کسی سے ہوجاتی ہے یا کسی سے تعلق ہوجاتا ہے اور محبت ہوجاتی ہے تو اس دوستی اور محبت میں بے دھڑک آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں کہ پھر ان کو کسی حد کی پرواہ نہیں ہوتی، بس جن سے محبت اور تعلق قائم ہوگیا اب ان کے اندر کوئی عیب نظر نہیں آتا اور اب دن رات کھانا پینا ان کے ساتھ ہے، اُٹھنا بیٹھنا ان کے ساتھ ہے، چلنا پھرنا ان کے ساتھ ہے، ہر کام ان کے ساتھ ہے، اور دن رات ان کی رفاقت اور صحبت حاصل ہے اور ان کی تعریف کے گن گائے جارہے ہیں۔ لیکن اچانک معلوم ہوا کہ دوستی ٹوٹ گئی، اب وہ دوستی ایسی ٹوٹی کہ اب ایک دوسرے کی شکل وصورت دیکھنے کے روادار نہیں، ایک دوسرے کا نام سننے کے روادار نہیں، اب ان کے اندر ایک اچھائی بھی نظر نہیں آتی بلکہ اب ان کی برائیاں شروع ہوگئیں۔ یہ انتہاپسندی اور یہ اعتدال سے باہر جانا شریعت کا تقاضا نہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے، بلکہ یہ تعلیم دی ہے کہ محبت بھی اعتدال سے کرو اور اگر بغض ہے تو وہ بھی اعتدال سے رکھو، کسی بھی چیز کو حد سے آگے نہ بڑھاؤ۔

دوستی کے لائق ایک ذات

یاد رکھو، اول تو دوستی اور محبت جس چیز کا نام ہے، یہ دنیا کی مخلوق میں حقیقی اور صحیح معنی میں تو ہے ہی نہیں، اصل دوستی اور محبت کے لائق تو صرف ایک ہی ذات ہے اور وہ اللہ جل جلالہ کی ذات ہے۔ دل میں بٹھانے کے لائق کہ جس کی محبت دل میں گھس جائے وہ تو ایک ہی ذات ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے جسم میں جو دل بنایا ہے وہ صرف اپنے لئے ہی بنایا ہے، یہ انہی کی تجلّی گاہ ہے اور انہی کے لئے بنا ہے۔ اب اس دل میں کسی اور کو اس طرح بٹھانا کہ وہ دل پر قبضہ جمالے، یہ کسی مؤمن کے لئے مناسب نہیں، کیونکہ دوستی کے لائق تو ایک ہی ہے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ایک سچے دوست

اگر اس کائنات میں کوئی شخص کسی کا سچا دوست ہوسکتا تھا تو حضورِ اقدس ﷺ کے لئے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر اور کون ہوسکتا تھا۔ حضورِ اقدس ﷺ کے ساتھ دوستی کا تعلق جس طرح حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے نبھایا اس کی مثال دنیا میں نہیں مل سکتی۔ کوئی دوسرا شخص یہ دعویٰ ہی نہیں کرسکتا کہ میں ان جیسی دوستی کرسکتا ہوں، ہر ہر مرحلے پر آپ کو آزمایا گیا مگر آپ کھرے نکلے۔ پہلے

دن سے جب آپ حضورِ اقدس ﷺ پر آمنّا وصدّقنا کہہ کر ایمان لائے تھے، ساری عمر اس تصدیق اور ایمان میں ذرّہ برابر کبھی تزلزل نہیں آیا۔

غارِ ثور کا واقعہ

غارِ ثور میں آپ نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے، جس کو قرآن کریم میں اس طرح بیان فرمایا:

﴿إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾(۱)

وہ دونوں غار میں تھے تو وہ اپنے ساتھی سے فرما رہے تھے کہ آپ غم نہ کریں، بیشک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں۔ جب غار کے اندر داخل ہونے لگے تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پہلے داخل ہوئے تاکہ غار کو صاف فرمائیں اور غار کے اندر سانپ بچھو اور زہریلے جانوروں کے جو بل ہیں ان کو بند فرمائیں۔ چنانچہ آپ نے کپڑے کاٹ کر ان سوراخوں کو بند فرمایا اور جب کپڑے ختم ہو گئے اور سوراخ باقی رہ گئے تو آپ نے اپنے پاؤں کی ایڑی سے سوراخوں کو بند فرمایا۔(۲)

ہجرت کا ایک واقعہ

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب حضورِ اقدس ﷺ ہجرت کے سفر میں تھے تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے آپ کے چہرۂ انور پر بھوک کے آثار دیکھے، آپ کہیں سے دودھ لے آئے اور آپ ﷺ کی خدمت میں لا کر پیش کیا، حالانکہ اس وقت آپ خود بھی بھوک سے تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ جب حضورِ اقدس ﷺ نے دودھ پی لیا تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بعد میں اس کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ حضورِ اقدس ﷺ نے اس طرح دودھ پیا کہ میں سیراب ہو گیا۔ یعنی دودھ تو حضور ﷺ نے پیا لیکن سیراب میں ہو گیا۔ لہٰذا دوستی اور ایثار و قربانی کا جو مقام حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے پیش کیا وہ دنیا میں کوئی دوسرا شخص پیش نہیں کر سکتا۔(۳)

دوستی اللہ کے ساتھ خاص ہے

لیکن اس کے باوجود سرکارِ دو عالم ﷺ فرماتے ہیں:

---

(۱) التوبة: ۴۰ (۲) البداية والنهاية (۳/ ۱۸۰)، كنز العمال (۸/ ۳۳۵)

(۳) صحيح البخاري، كتاب المناقب، باب علامات النبوة في الإسلام، رقم: ۳۳۴۶، صحيح مسلم، كتاب الزهد والرقائق، باب في حديث الهجرة ويقال له حديث الرحل، رقم: ۵۳۲۹، مسند أحمد، رقم: ۳

((لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيْلًا لَاتَّخَذْتُ اَبَابَكْرٍ خَلِيْلًا))(۱)

یعنی اگر میں اس دنیا میں کسی کو سچا دوست بناتا تو "ابوبکر" کو بناتا۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو بھی دوست بنایا نہیں، اس لئے کہ اس دنیا میں حقیقی معنی میں دوست بننے کے لائق کوئی نہیں ہے، یہ دوستی تو صرف اللہ جل شانہٗ کے ساتھ مخصوص ہے، کیونکہ ایسی دوستی جو انسان کے دل پر قبضہ جمالے کہ جو وہ کہے وہ کرے اور پھر انسان کا دل اس کے تابع ہوجائے، یہ دوستی اللہ کے سوا کسی اور کے ساتھ زیبا نہیں۔

دوستی اللہ کی دوستی کے تابع ہونی چاہئے

البتہ دنیا کے اندر جو دوستی ہوگی وہ اللہ کی محبت اور دوستی کے تابع ہوگی۔ چنانچہ دوست کے کہنے کی وجہ سے گناہ نہیں کیا جائے گا، دوستی کی مد میں معصیت اور نافرمانی نہیں ہوگی۔ لہٰذا پہلی بات تو یہ ہے کہ اس دنیا میں تمام دوستیاں اللہ تعالیٰ کی محبت اور دوستی کے تابع ہونی چاہئیں۔

مخلص دوستوں کا فقدان

دوسری بات یہ ہے کہ اس دنیا میں ایسا دوست ملتا ہی کہاں ہے جس کی دوستی اللہ کی دوستی کے تابع ہو، تلاش کرنے اور ڈھونڈنے کے باوجود بھی ایسا دوست نہیں ملتا جس کو صحیح معنی میں دوست کہہ سکیں اور جس کی دوستی اللہ کی دوستی کے تابع ہو اور جو کڑی آزمائش کے وقت پکا نکلے۔ ایسا دوست بڑی مشکل سے ملتا ہے، قسمت والے کو ہی ایسا دوست ملتا ہے۔ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے جب میرے دوسرے بڑے بھائی صاحبان اپنے دوستوں کا ذکر کرتے تو والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اُن سے فرماتے کہ تمہارے دنیا میں بہت دوست ہیں، ساٹھ سال عمر ہوگئی ہمیں تو کوئی دوست نہیں ملا، ساری عمر میں صرف ڈیڑھ دوست ملا، ایک پورا اور ایک آدھا، مگر تمہیں بہت دوست مل جاتے ہیں۔ لہٰذا دوستی کے معیار پر پورا اُترنے والا جو کٹھن آزمائش میں بھی پکا اور کھرا ثابت ہو، ایسا دوست بہت کم ملتا ہے۔

بہر حال، اگر کسی کو اللہ تعالیٰ کے تابع بنا کر بھی دوست بناؤ تو اس دوستی کے اندر بھی کا

(۱) صحيح البخاري، كتاب الصلاة، باب الخوفة والممر في المسجد، رقم: ٤٤٦، صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب فضائل أبي بكر، رقم: ٤٣٩٠، سنن الترمذي، كتاب المناقب عَنْ رسول الله، باب مناقب أبي بكر الصديق، رقم: ٣٥٨٨، سنن ابن ماجه، المقدمة، باب فضل أبي بكر الصديق، رقم: ٩٠، مسند أحمد، رقم: ٣٣٩٩

اہتمام کرو کہ وہ دوستی حدود سے تجاوز نہ کرے، بس وہ دوستی ایک حد کے اندر رہے، یہ نہ ہو کہ جب دوستی ہوگئی تو اب صبح سے لے کر شام تک ہر وقت اسی کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا ہے اور اسی کے ساتھ کھانا پینا ہے، اور اب اپنے راز بھی اس پر ظاہر کیے جارہے ہیں، اپنی ہر بات اس سے کہی جارہی ہے، اگر کل کو دوستی ختم ہوگئی تو چونکہ تم نے اپنے سارے راز اس پر ظاہر کردیئے ہیں، اب وہ تمہارے راز ہر جگہ اُچھالے گا اور تمہارے لئے نقصان دہ ثابت ہوگا۔ اس لئے دوستی اعتدال کے ساتھ ہونی چاہئے، یہ نہ ہو کہ آدمی حدود سے تجاوز کر جائے۔

دشمنی میں اعتدال

اسی طرح اگر کسی کے ساتھ دشمنی ہے اور کسی سے تعلقات اچھے نہیں ہیں تو یہ نہ ہو کہ اس کے ساتھ تعلقات اچھے نہ ہونے کی وجہ سے اس کے اندر ہر وقت کیڑے نکالے جارہے ہیں، اس کے ہر کام میں عیب تلاش کیے جارہے ہیں۔ ارے بھائی! اگر کوئی آدمی برا ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر اچھائی بھی رکھی ہوگی، ایسا نہ ہو کہ عداوت کی وجہ سے تم اس کی اچھائیوں کو بھی نظر انداز کرتے چلے جاؤ۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰٓ أَلَّا تَعْدِلُوا۟ ٱعْدِلُوا۟﴾(۱)

یعنی کسی قوم کے ساتھ عداوت تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم اس کے ساتھ انصاف نہ کرو۔ بیشک اس کے ساتھ تمہاری دشمنی ہے، لیکن اس دشمنی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اب اس کی اچھائی کا بھی اعتراف نہ کیا جائے، بلکہ اگر وہ کوئی اچھا کام کرے تو اس کی اچھائی کا اعتراف کرنا چاہئے۔ لیکن چونکہ حضورِ اقدس ﷺ کا یہ ارشاد عام طور پر ہمارے پیشِ نظر نہیں رہتا، اس لئے محبتوں میں بھی حدود سے تجاوز ہو جاتا ہے اور بغض اور عداوت میں بھی حدود سے تجاوز ہو جاتا ہے۔

حجاج بن یوسف کی غیبت

آج حجاج بن یوسف کو کون مسلمان نہیں جانتا، جس نے بے شمار ظلم کیے، کتنے علماء کو شہید کیا، کتنے حافظوں کو قتل کیا، حتیٰ کہ اس نے کعبہ شریف پر حملہ کردیا۔ یہ سارے برے کام کیے اور جو مسلمان بھی اس کے ان برے افعال کو پڑھتا ہے تو اس کے دل میں اس کی طرف سے کراہیت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن ایک مرتبہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے سامنے حجاج بن یوسف کی برائی شروع کردی اور اس برائی کے اندر اس کی غیبت کی، تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فوراً ٹوکا اور فرمایا کہ یہ

(۱) المائدہ: ۸

مت سمجھنا کہ اگر حجاج بن یوسف ظالم ہے تو اب اس کی غیبت حلال ہوگئی یا اس پر بہتان باندھنا حلال ہوگیا۔ یاد رکھو، جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن حجاج بن یوسف سے اس کے ناحق قتل اور ظلم اور خون کا بدلہ لیں گے تو تم اس کی جو غیبت کر رہے ہو یا بہتان باندھ رہے ہو تو اس کا بدلہ اللہ تعالیٰ تم سے لیں گے۔ یہ نہیں کہ جو شخص بدنام ہوگیا تو اس کی بدنامی کے نتیجے میں اس پر جو چاہو الزام عائد کرتے چلے جاؤ، اس پر بہتان باندھتے چلے جاؤ اور اس کی غیبت کرتے چلے جاؤ۔ لہٰذا عداوت اور دشمنی بھی اعتدال کے ساتھ کرو اور محبت بھی اعتدال کے ساتھ کرو۔

ہمارے ملک کی سیاسی فضا کا حال

آج کل ہمارے یہاں جو سیاسی فضا ہے، اس سیاسی فضا کا حال یہ ہے کہ اگر کسی کے ساتھ تعلق ہوگیا اور اس کے ساتھ سیاسی وابستگی ہوگئی تو اس کو اس طرح بانس پر چڑھاتے ہیں کہ اب اس کے اندر کوئی عیب نظر نہیں آتا، اور اگر دوسرا شخص کوئی عیب بیان کرے تو اس کا سننا گوارہ نہیں ہوتا، اور اس کے بارے میں یہ رائے قائم کرلی جاتی ہے کہ یہ غلطی سے پاک ہے۔ اور جب اس سے سیاسی دشمنی ہوجاتی ہے تو اب اس کے اندر کوئی اچھائی ہی نظر نہیں آتی۔ دونوں جگہ پر حدود سے تجاوز ہو رہا ہے۔ اس طریقے سے حضورِ اقدس ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

جیسا کہ بار بار عرض کرتا رہتا ہوں کہ صرف نماز روزے کا نام دین نہیں ہے۔ بلکہ یہ بھی دین کا حصہ ہے کہ محبت کرو تو اعتدال کے ساتھ کرو اور بغض رکھو تو اعتدال کے ساتھ رکھو۔ جو اللہ کے بندے ہیں وہ ان باتوں کو سمجھتے ہیں۔ یہ حکمران، یہ سیاسی لیڈر اور رہنما جو ہیں، ان کے ساتھ تعلق بھی باعزت فاصلے کے ساتھ ہو، یہ نہ ہو کہ جب ان کے ساتھ تعلق ہوگیا تو آدمی حد سے متجاوز ہو رہا ہے۔

قاضی بکّار بن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ کا سبق آموز واقعہ

ایک قاضی گزرے ہیں قاضی بکار بن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ، یہ بڑے درجے کے محدثین میں سے ہیں۔ دینی مدارس میں حدیث کی کتاب "طحاوی شریف" پڑھائی جاتی ہے اس کے مصنف ہیں امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ، یہ ان کے استاذ ہیں۔ ان کے زمانے میں جو بادشاہ تھا وہ ان پر مہربان ہوگیا، اور ایسا مہربان ہوگیا کہ ہر معاملے میں ان سے صلاح اور مشورہ ہو رہا ہے، ہر معاملے میں ان کو بلایا جا رہا ہے، ہر دعوت میں ان کو بلایا جا رہا ہے، حتیٰ کہ ان کو پورے ملک کا قاضی بنادیا۔ اور اب سارے فیصلے ان کے پاس آرہے ہیں، دن رات بادشاہ کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا ہے، جو سفارش کرتے ہیں بادشاہ ان کی سفارش کو قبول کرلیتا ہے۔ ایک عرصہ دراز تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہ اپنا قضا کا کام بھی کرتے ہے اور جو مناسب مشورہ ہوتا

وہ بادشاہ کو دے دیا کرتے تھے۔

چونکہ وہ تو عالم اور قاضی تھے، بادشاہ کے غلام تو نہیں تھے، تو ایک مرتبہ بادشاہ نے غلط کام کر دیا، قاضی صاحب نے فتویٰ دے دیا کہ بادشاہ کا یہ کام غلط ہے اور درست نہیں ہے، اور یہ کام شریعت کے خلاف ہے۔ اب بادشاہ سلامت ناراض ہو گئے کہ ہم اتنے عرصے تک ان کو کھلاتے پلاتے رہے، ان کو ہدیے تحفے دیتے رہے اور ان کی سفارش قبول کرتے رہے اور اب انہوں نے ہمارے خلاف ہی فتویٰ دے دیا۔ چنانچہ فوراً ان کو قاضی کے عہدے سے معزول کر دیا۔ یہ دنیاوی بادشاہ بڑے تنگ ظرف ہوتے ہیں، دیکھنے میں بڑے سخی نظر آتے ہیں لیکن کم ظرف ہوتے ہیں، تو صرف یہ نہیں کیا کہ ان کو قضا کے عہدے سے معزول کر دیا بلکہ ان کے پاس اپنا قاصد بھیجا کہ جا کر ان سے کہو کہ ہم نے آج تک تمہیں جتنے ہدیے تحفے دیئے ہیں، وہ سب واپس کرو، اس لئے کہ اب تم نے ہماری مرضی کے خلاف کام شروع کر دیا ہے۔ اب آپ اندازہ کریں کہ کئی سالوں کے وہ ہدایا، کبھی کچھ دیا ہوگا، کبھی کچھ بھیجا ہوگا، لیکن جب بادشاہ کا وہ آدمی آیا تو آپ اس آدمی کو اپنے گھر کے اندر ایک کمرے میں لے گئے اور ایک الماری کا تالہ کھولا تو وہ پوری الماری تھیلیوں سے بھری ہوئی تھی۔ آپ نے اس قاصد سے کہا کہ تمہارے بادشاہ کے پاس سے جو تحفے کی تھیلیاں آتی تھیں وہ سب اس الماری کے اندر رکھی ہوئی ہیں، اور ان تھیلیوں پر جو مہر لگی تھی وہ مہر بھی ابھی تک نہیں ٹوٹی، یہ ساری تھیلیاں اُٹھا کر لے جاؤ۔ اس لئے کہ جس دن بادشاہ سے تعلق قائم ہوا، الحمدللہ اسی دن حضورِ اقدس ﷺ کا یہ ارشاد ذہن میں تھا:

((أَحْبِبْ حَبِيبَكَ هَوْنًا مَّا عَسٰى أَنْ يَّكُوْنَ بَغِيضَكَ يَوْمًا مَّا))(۱)

اور مجھے اندازہ تھا کہ شاید کوئی وقت ایسا آئے گا کہ مجھے یہ سارے تحفے واپس کرنے پڑیں گے۔ الحمدللہ بادشاہ کے دیئے ہوئے ہدیے اور تحفوں میں سے ایک ذرّہ بھی آج تک اپنے استعمال میں نہیں لایا۔ یہ ہے حضورِ اقدس ﷺ کے ارشاد پر عمل کا صحیح نمونہ۔ یہ نہیں کہ جب دوستی ہو گئی تو اب ہر طرح کا فائدہ اُٹھایا جا رہا ہے اور جب دشمنی ہوئی تو اب پریشانی اور شرمندگی ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔ آمین

یہ دعا کرتے رہو

اول تو صحیح معنی میں محبت صرف اللہ جل شانہٗ سے ہونی چاہئے۔ اسی لئے حضورِ اقدس ﷺ نے یہ دعا تلقین فرمائی جو ہر مسلمان کو ہمیشہ مانگنی چاہئے:

(۱) سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عَنْ رسول الله، باب ما جاء فی الاقتصاد فی الحب والبغض، رقم: ۱۹۲۰

((اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ الْاَشْیَاءِ اِلَیَّ))(۱)

''اے اللہ! اپنی محبت کو تمام محبتوں پر غالب فرما''

اب انسان چونکہ کمزور ہے اور اس کے ساتھ بشری تقاضے لگے ہوئے ہیں، اس لئے انسان کو دوسروں سے بھی محبت ہوتی ہے۔ مثلاً بیوی سے محبت، اولاد سے محبت، دوستوں سے محبت، ماں باپ سے محبت، عزیز و رشتہ داروں سے محبت، یہ ساری محبتیں انسان کے ساتھ لگی ہوئی ہیں، یہ محبتیں انسان کے ساتھ رہیں گی اور کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ آدمی یہ دعا کرے کہ یا اللہ! یہ ساری محبتیں آپ کی محبت کے تابع ہو جائیں اور آپ کی محبت ان تمام محبتوں پر غالب آجائے۔

اگر محبت حد سے بڑھ جائے تو یہ دعا کرو

اگر کسی سے محبت ہو اور یہ محسوس ہو کہ یہ محبت حد سے بڑھ رہی ہے تو فوراً اللہ کی طرف رجوع کرو کہ یا اللہ! یہ محبت آپ نے میرے دل میں ڈالی ہے لیکن یہ محبت حد سے بڑھتی جارہی ہے۔ اے اللہ! کہیں ایسا نہ ہو کہ میں کسی فتنے میں مبتلا ہو جاؤں۔ اے اللہ! اپنی رحمت سے مجھے فتنے میں مبتلا ہونے سے محفوظ رکھئے۔ اور پھر اپنے اختیاری طرزِ عمل میں بھی ہمیشہ احتیاط سے کام لو۔ جو آج کا دوست ہے وہ کل کا دشمن بھی ہو سکتا ہے۔ کل تک تو ہر وقت ساتھ اُٹھنا بیٹھنا تھا، ساتھ کھانا پینا تھا، اور آج یہ نوبت آگئی کہ صورت دیکھنے کے روادار نہیں۔ یہ نوبت نہیں آنی چاہئے، اور اگر آئے تو اس کی طرف سے آئے، تمہاری طرف سے نہ آئے۔

بہر حال، دوستی کے بارے میں یہ حضور اقدس ﷺ کی تلقین ہے، اور حضورِ اقدس ﷺ کی ایک ایک تلقین ایسی ہے کہ اگر ہم ان کو پلّے باندھ لیں تو ہماری دنیا اور آخرت سنور جائے۔

دوستی کے نتیجے میں گناہ

بسا اوقات ان دوستیوں کے نتیجے میں ہم گناہ کے اندر مبتلا ہو جاتے ہیں، اور یہ سوچتے ہیں کہ چونکہ یہ دوست ہے اگر اس کی بات ہم نے نہ مانی تو اس کا دل ٹوٹے گا، لیکن اگر اس کے دل ٹوٹنے کے نتیجے میں شریعت ٹوٹ جائے تو اس کی پرواہ نہیں۔ حالانکہ شریعت کو ٹوٹنے سے بچانا دل کو ٹوٹنے سے بچانے سے مقدّم ہے بشرطیکہ شریعت میں گنجائش نہ ہو، لیکن اگر شریعت کے اندر گنجائش ہو تو اس صورت میں بیشک یہ حکم ہے کہ مسلمان کا دل رکھنا چاہئے اور حتی الامکان دل نہ توڑنا چاہئے، کیونکہ یہ بھی عبادت ہے۔

(۱) کنز العمال (۲/۱۸۲)

اعتدال کا راستہ اختیار کیجئے

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں معاملات کے اندر ''غلو'' کرنے کی ممانعت ہے۔ کسی بھی معاملے میں غلو نہ ہو، نہ تعلقات میں اور نہ ہی معاملات میں۔ اور غلو کے معنی ہیں ''حد سے بڑھنا'' کسی بھی معاملے میں انسان حد سے نہ بڑھے بلکہ مناسب حد کے اندر رہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس حدیث پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

برائی کا بدلہ اچھائی سے دیجئے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ،
﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ٥ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خٰشِعُونَ ٥ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ٥ وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُونَ ٥ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حٰفِظُونَ ٥ إِلَّا عَلٰى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ٥ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُونَ﴾(۱)

گزشتہ چند جمعوں سے سورۃ مؤمنون کی ابتدائی آیات کا بیان چل رہا ہے۔ ان آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے مؤمنوں کی ان صفات کو بیان کیا ہے جو ان کی دنیا وآخرت کی فلاح اور کامیابی کی موجب ہیں، لہٰذا اگر مسلمان چاہتے ہیں کہ ان کو دنیا وآخرت کی کامیابی حاصل ہو تو ان کے لئے ان صفات کا اہتمام کرنا ضروری ہے جو ان آیات میں بیان کی گئی ہیں، ان میں سے پہلی صفت جو ان آیات میں بیان کی گئی ہے وہ ''نماز میں خشوع اختیار کرنا'' ہے، اس کا مفصل بیان الحمدللہ ہو چکا ہے۔

مؤمنوں کی دوسری صفت

دوسری صفت یا دوسرا عمل جو ان آیات میں بیان کیا گیا ہے وہ ہے:

﴿وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ﴾

یعنی فلاح یافتہ مؤمن وہ ہیں جو لغو سے اعراض کرتے ہیں اور کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں۔ اس آیت کریمہ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان کے ساتھ بیہودہ گفتگو کرے یا بیہودہ معاملہ کرے تو اس کا جواب ترکی بہ ترکی دینے کے بجائے اس سے کنارہ کر لیتے ہیں اور اپنے آپ کو لغو باتوں سے اور لغو افعال سے بچاتے ہیں۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۴/۲۵۲ تا ۲۶۸)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) المؤمنون: ۱ تا ۷

حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ سنا۔ ایسی بزرگ ہستی کہ ماضی قریب میں اس کی نظیر ملنی مشکل ہے، شاہی خاندن کے شہزادے تھے، اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لئے نکل پڑے اور قربانیاں دیں۔ ایک مرتبہ دہلی کی جامع مسجد میں خطاب فرمارہے تھے، خطاب کے دوران بھرے مجمع میں ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا (العیاذ باللہ) ہم نے سنا ہے کہ آپ حرام زادے ہیں۔ اتنے بڑے عالم اور شہزادے کو ایک بڑے مجمع میں یہ گالی دی اور وہ مجمع بھی معتقدین کا تھا۔ میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم جیسا کوئی آدمی ہوتا تو اس کو سزا دیتا، اگر وہ سزا نہ بھی دیتا تو اس کے معتقدین اس کی تکہ بوٹی کر دیتے، ورنہ کم از کم اس کو ترکی بہ ترکی یہ جواب تو دے ہی دیتے کہ تو حرام زادہ، تیرا باپ حرام زادہ، لیکن حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ جو پیغمبرانہ دعوت کے حامل تھے، جواب میں فرمایا:

''آپ کو غلط اطلاع ملی ہے، میری والدہ کے نکاح کے گواہ تو آج بھی دلی میں موجود ہیں''

اس گالی کو ایک مسئلہ بنادیا لیکن گالی کا جواب گالی سے نہیں دیا۔

ترکی بہ ترکی جواب مت دو

لہٰذا طعنہ کا جواب طعنہ سے نہ دیا جائے۔ اگرچہ شرعاً تمہیں یہ حق حاصل ہے کہ جیسی دوسرے شخص نے تمہیں گالی دی ہے، تم بھی ویسی ہی گالی اس کو دیدو، لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کے وارثین انتقام کا یہ حق استعمال نہیں کرتے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری زندگی یہ حق کبھی استعمال نہیں فرمایا بلکہ ہمیشہ معاف کر دینے اور درگزر کر دینے کا شیوہ رہا ہے اور انبیاء علیہم السلام کے وارثین کا بھی یہی شیوہ رہا ہے۔

انتقام کے بجائے معاف کر دو

ارے بھائی! اگر کسی نے تمہیں گالی دیدی تو تمہارا کیا بگڑا؟ تمہاری کونسی آخرت خراب ہوئی؟ بلکہ تمہارے تو درجات میں اضافہ ہوا، اگر تم انتقام نہیں لوگے بلکہ درگزر کر دو گے اور معاف کر دو گے تو اللہ تبارک وتعالیٰ تمہیں معاف کر دیں گے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص دوسرے کی غلطی کو معاف کر دے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس دن معاف فرمائیں گے جس دن وہ معافی کا سب سے

زیادہ محتاج ہوگا یعنی قیامت کے دن ۔ لہٰذا انتقام لینے کی فکر چھوڑ دو، اور معاف کردو اور درگزر کردو۔

بزرگوں کی مختلف شانیں

ایک بزرگ سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت ہم نے سنا ہے کہ اولیاء کرام رحمہم اللہ کی شانیں عجیب وغریب ہوتی ہیں، کسی کا کوئی رنگ ہے، کسی کا کوئی رنگ ہے، اور کسی کی کوئی شان ہے، میرا دل چاہتا ہے کہ ان اولیاء کرام رحمہم اللہ کی مختلف شانیں دیکھوں کہ وہ کیا شانیں ہوتی ہیں۔ ان بزرگ نے ان سے فرمایا کہ تم کس چکر میں پڑ گئے، اولیاء اور بزرگوں کی شانیں دیکھنے کی فکر میں مت پڑو بلکہ اپنے کام میں لگو۔ ان صاحب نے اصرار کیا کہ نہیں! میں ذرا دیکھنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں کیسے کیسے بزرگ ہوتے ہیں۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ اگر تم دیکھنا ہی چاہتے ہو تو ایسا کرو کہ دہلی کی فلاں مسجد میں چلے جاؤ، وہاں تمہیں تین بزرگ اپنے ذکر واذکار میں مشغول نظر آئیں گے، تم جا کر ہر ایک کی پشت پر ایک مُکا مار دینا، پھر دیکھنا کہ اولیاء کرام کی شانیں کیا ہوتی ہیں۔ چنانچہ وہ صاحب گئے، وہاں جا کر دیکھا تو واقعۃً تین بزرگ بیٹھے ہوئے ذکر میں مشغول ہیں۔ انہوں نے جا کر پہلے بزرگ کو پیچھے سے ایک مُکا مارا تو انہوں نے پلٹ کر دیکھا تک نہیں بلکہ اپنے ذکر واذکار میں مشغول رہے۔ جب دوسرے بزرگ کو مُکا مارا تو انہوں نے بھی پلٹ کر ان کو مُکا مار دیا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ جب تیسرے بزرگ کو مُکا مارا تو انہوں نے پلٹ کر ان کا ہاتھ سہلانا شروع کر دیا کہ آپ کو چوٹ تو نہیں لگی۔

اس کے بعد یہ صاحب ان بزرگ کے پاس واپس آئے جنہوں نے ان کو بھیجا تھا۔ ان بزرگ نے ان سے پوچھا کہ کیا ہوا؟ انہوں نے بتایا کہ بڑا عجیب قصہ ہوا۔ جب میں نے پہلے بزرگ کو مُکا مارا تو انہوں نے پلٹ کر مجھے دیکھا بھی نہیں اور جب دوسرے بزرگ کو مُکا مارا تو انہوں نے بھی پلٹ کر مجھے مُکا مار دیا، اور جب تیسرے بزرگ کو مُکا مارا تو انہوں نے پلٹ کر میرا ہاتھ سہلانا شروع کر دیا۔

ان بزرگ نے فرمایا کہ اچھا یہ بتاؤ کہ جنہوں نے تمہیں مُکا مارا تھا انہوں نے زبان سے کچھ کہا تھا؟ ان صاحب نے بتایا کہ زبان سے تو کچھ نہیں کہا، بس مُکا مارا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔

میں اپنا وقت بدلہ لینے میں کیوں ضائع کروں

ان بزرگ نے فرمایا کہ اب سنو! پہلے بزرگ جنہوں نے بدلہ نہیں لیا، انہوں نے یہ سوچا کہ میں اپنا وقت بدلہ لینے میں کیوں ضائع کروں، اگر اس نے مجھے مُکا مارا تو میرا کیا بگڑ گیا، اب میں پیچھے مڑوں، اور یہ دیکھوں کہ کس نے مارا ہے اور پھر اس کا بدلہ لوں، جتنا وقت اس میں صرف ہوگا وہ وقت میں اللہ تعالیٰ کے ذکر میں کیوں نہ صرف کردوں۔

پہلے بزرگ کی مثال

ان پہلے بزرگ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص کو بادشاہ نے بلایا اور اس سے کہا کہ تم میرے پاس آؤ، میں تمہیں ایک عالیشان انعام دوں گا۔ اب وہ شخص اس انعام کے شوق میں دوڑتا ہوا بادشاہ کے محل کی طرف جا رہا ہے، وقت کم رہ گیا ہے اور اس کو وقت پر پہنچنا ہے، راستے میں ایک شخص نے اس کو مُکا مار دیا، اب یہ شخص اس مُکا مارنے والے سے الجھے گا یا اپنا سفر جاری رکھے گا کہ میں جلد از جلد کسی طرح بادشاہ کے پاس پہنچ جاؤں۔ ظاہر ہے کہ اس مُکا مارنے والے سے نہیں اُلجھے گا بلکہ وہ تو اس فکر میں رہے گا کہ میں کسی طرح جلد از جلد بادشاہ کے پاس پہنچ جاؤں اور جاکر اس سے انعام وصول کروں۔ اسی طرح یہ بزرگ اس مُکا مارنے والے سے نہیں اُلجھے بلکہ اپنے ذکر میں مشغول رہے۔ تاکہ وقت ضائع نہ ہو۔

دوسرے بزرگ کا انداز

دوسرے بزرگ جنہوں نے بدلہ لے لیا، انہوں نے یہ سوچا کہ شریعت نے یہ حق دیا ہے کہ جتنی زیادتی کوئی شخص تمہارے ساتھ کرے، اتنی زیادتی تم بھی اس کے ساتھ کرسکتے ہو، اس سے زیادہ نہیں کرسکتے۔ اب تم نے ان کو ایک مُکا مارا تو انہوں نے بھی تمہیں ایک مُکا مار دیا، تم نے زبان سے کچھ نہیں کہا تو انہوں نے بھی زبان سے کچھ نہیں کہا۔

بدلہ لینا بھی خیر خواہی ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض بزرگوں سے یہ جو منقول ہے کہ انہوں نے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کا بدلہ لے لیا، یہ بدلہ لینا بھی درحقیقت اس شخص کی خیر خواہی کی وجہ سے ہوتا ہے، اس لئے کہ بعض اولیاء اللہ کا یہ حال ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص ان کو تکلیف پہنچائے یا ان کی شان میں کوئی گستاخی کرے اور وہ صبر کر جائیں تو ان کے صبر کے نتیجے میں وہ شخص تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔

حدیث قدسی میں اللہ جل شانہ فرماتے ہیں:

((مَنْ عَادَى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ))

''جو شخص میرے کسی ولی سے دشمنی کرے، اس کیلئے میری طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔''(۱)

---

(۱) جامع العلوم والحکم، ابن رجب الحنبلی (۱/۳۵۷)، معارج القبول، حافظ بن احمد حکمی (۳/۱۰۰۱)

بعض اوقات اللہ تعالیٰ اپنے پیاروں کے ساتھ کی ہوئی زیادتی پر ایسا عذاب نازل فرماتے ہیں کہ ایسے عذاب سے اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے، کیونکہ اس ولی کا صبر اس شخص پر واقع ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ والے بعض اوقات اپنے ساتھ کی ہوئی زیادتی کا بدلہ لے لیتے ہیں تاکہ اس کا معاملہ برابر ہو جائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ کا عذاب اس پر نازل ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ کیوں بدلہ لیتے ہیں؟

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو اس بات پر اشکال ہو کہ اللہ تعالیٰ کا یہ عجیب معاملہ ہے کہ اولیاء اللہ تو اتنے شفیق ہوتے ہیں کہ وہ اپنے اوپر کی ہوئی زیادتی کا بدلہ نہیں لیتے، لیکن اللہ تعالیٰ عذاب دینے پر تلے ہوئے ہیں کہ اگر بدلہ نہ لیا جائے تو وہ ضرور عذاب دیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اولیاء اللہ کی شفقت اللہ تعالیٰ کی شفقت اور رحمت کے مقابلے میں زیادہ ہوگئی۔ پھر اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ بات دراصل یہ ہے کہ شیرنی کو اگر کوئی جاکر چھیڑ دے تو وہ شیرنی طرح دے جاتی ہے اور بدلہ نہیں لیتی اور اس پر حملہ نہیں کرتی، لیکن اگر کوئی جاکر اس شیرنی کے بچوں کو چھیڑ دے تو پھر شیرنی اس کو برداشت نہیں کرتی بلکہ چھیڑنے والے پر حملہ کر دیتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی شان میں لوگ گستاخیاں کرتے ہیں، کوئی شرک کر رہا ہے، کوئی اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار کر رہا ہے، مگر اللہ تعالیٰ اپنے تحمل سے اس کو درگزر فرما دیتے ہیں، لیکن اولیاء اللہ جو اللہ تعالیٰ کے پیارے ہیں، ان کی شان میں گستاخی کرنا اللہ تعالیٰ کو برداشت نہیں ہوتا، اس لئے یہ گستاخی انسان کو تباہ کر دیتی ہے۔ لہٰذا جہاں کہیں یہ منقول ہے کہ کسی اللہ کے ولی نے بدلہ لے لیا، وہ بدلہ لینا اس کی خیر خواہی کے لئے ہوتا ہے، کیونکہ اگر بدلہ نہ لیا تو نہ معلوم اللہ تعالیٰ کا کیا عذاب اس پر نازل ہو جائے گا۔

تیسرے بزرگ کا انداز

جہاں تک تیسرے بزرگ کا تعلق ہے جنہوں نے تمہارا ہاتھ سہلانا شروع کر دیا تھا، ان کو اللہ تعالیٰ نے خلقِ خدا پر رحمت اور شفقت کا وصف عطا فرمایا تھا، اس لئے انہوں نے پلٹ کر ہاتھ سہلانا شروع کر دیا۔

پہلے بزرگ کا طریقہ سنت تھا

لیکن اصل طریقہ سنت کا وہ ہے جس کو پہلے بزرگ نے اختیار فرمایا۔ اس لئے کہ اگر کسی نے تمہیں نقصان پہنچایا ہے تو میاں! کہاں تم اس سے بدلہ لینے کے چکر میں پڑ گئے، کیونکہ اگر تم بدلہ لے لو

گے تو تمہیں کیا فائدہ مل جائے گا؟ بس اتنا ہی تو ہوگا کہ سینے کی آگ ٹھنڈی ہو جائے گی، لیکن اگر تم اس کو معاف کر دو گے اور درگزر کر دو گے تو سینے کی آگ کیا بلکہ جہنم کی آگ بھی ٹھنڈی ہو جائے گی، انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ جہنم کی آگ سے نجات عطا فرمائیں گے۔

معاف کرنا باعثِ اجر و ثواب ہے

آج کل ہمارے گھروں میں، خاندانوں میں، ملنے جلنے والوں میں، دن رات یہ مسائل پیش آتے رہتے ہیں کہ فلاں نے میرے ساتھ یہ کر دیا اور فلاں نے یہ کر دیا، اب اس سے بدلہ لینے کی سوچ رہے ہیں، دوسروں سے شکایت کرتے پھر رہے ہیں، اس کو طعنہ دے رہے ہیں، دوسروں سے اس کی برائی اور غیبت کر رہے ہیں، حالانکہ یہ سب گناہ کے کام ہیں۔ لیکن اگر تم معاف کر دو اور درگزر کر دو تو تم بڑی فضیلت اور ثواب کے مستحق بن جاؤ گے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ﴾(۱)

”جس نے صبر کیا اور معاف کر دیا بیشک یہ بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہے“

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿إِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ﴾(۲)

دوسرے کی برائی کا بدلہ اچھائی سے دو، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جن کے ساتھ عداوت ہے، وہ سب تمہارے گرویدہ ہو جائیں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا يُلَقّٰهَآ إِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَآ إِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ﴾(۳)

یعنی یہ عمل ان ہی کو نصیب ہوتا ہے، جن کو اللہ تعالیٰ صبر کی توفیق عطا فرماتے ہیں اور یہ دولت بڑے نصیب والے کو حاصل ہوتی ہے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کے اندازِ جواب

حضرات انبیاء علیہم السلام کا طریقہ یہ ہے کہ وہ طعنہ نہیں دیتے، حتیٰ کہ اگر کوئی سامنے والا شخص طعنہ بھی دے تو بھی جواب میں یہ حضرات طعنہ نہیں دیتے۔

غالباً حضرت ہود علیہ السلام کی قوم کا واقعہ ہے کہ ان کی قوم نے ان سے کہا:

﴿إِنَّا لَنَرٰكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ﴾(٤)

(۱) الشوریٰ: ۴۳ (۲) حم السجدہ: ۳۴ (۳) حم السجدہ: ۳۵ (٤) الاعراف: ٦٦

نبی سے کہا جا رہا ہے کہ ہمارا یہ خیال ہے کہ تم انتہا درجے کے بیوقوف ہو، احمق ہو اور ہم تمہیں کاذبین میں سے سمجھتے ہیں، تم جھوٹے معلوم ہوتے ہو۔ وہ انبیاء علیہم السلام جن پر حکمت اور صدق قربان ہیں، ان کے بارے میں یہ الفاظ کہے جا رہے ہیں، لیکن دوسری طرف جواب میں پیغمبر فرماتے ہیں:

﴿يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾(۱)

''اے قوم! میں بیوقوف نہیں ہوں بلکہ میں اللہ رب العالمین کی طرف سے ایک پیغام لے کر آیا ہوں''

ایک اور پیغمبر سے کہا جا رہا ہے:

﴿إِنَّا لَنَرٰكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾(۲)

''ہم تمہیں دیکھ رہے ہیں کہ تم گمراہی میں پڑے ہوئے ہو۔''

جواب میں پیغمبر فرماتے ہیں:

﴿يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾(۳)

''اے قوم! میں گمراہ نہیں ہوں بلکہ میں اللہ رب العالمین کی طرف سے پیغمبر بن کر آیا ہوں''

آپ نے دیکھا کہ پیغمبر نے طعنہ کا جواب طعنہ سے نہیں دیا۔

رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا انداز

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جن کو رحمت للعالمین بنا کر بھیجا گیا، ان پر پتھروں کی بارش ہو رہی ہے، گھٹنے خون سے لہولہان ہو رہے ہیں، لیکن زبان پر یہ الفاظ جاری ہیں:

((اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِيْ فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ))

اے اللہ! میری اس قوم کو ہدایت عطا فرما، کیونکہ یہ جاہل ہے اور اس کو حقیقت کا پتہ نہیں ہے، اس وجہ سے میرے ساتھ یہ سلوک کر رہی ہے۔(۴)

انبیاء علیہم السلام کبھی کسی برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے، گالی کا بدلہ گالی سے نہیں دیتے، وہ

---

(۱) الاعراف: ٦٠ (۲) الاعراف: ٦٠ (۳) الاعراف: ٦١

(٤) صحيح البخاري، كتاب استتابة المرتدين والمعاندين وقتالهم، باب اذا عرض الذمي وغيره بسب النبي ولم يصرح...... الخ، رقم: ٦٤١٧، صحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب غزوة أحد، رقم: ٣٣٤٧، سنن ابن ماجه، كتاب الفتن، باب الصبر على البلاء، رقم: ٤٠١٥، مسند أحمد، رقم: ٣٤٢٩

اہل مکہ جنہوں نے مکہ میں رہنے والے صحابہ کرام کی زندگی عذاب کر دی تھی، ان صحابہ کرام کو تپتی ہوئی ریت پر لٹایا جا رہا ہے، پتھر کی سلیں ان کے سینوں پر رکھی جا رہی ہیں، ان کا بائیکاٹ کیا جا رہا ہے، ان کا کھانا پانی بند کیا جا رہا ہے، ان کے قتل کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ ۱۳ سال تک حضورِ اقدس ﷺ اور صحابہ کرام کو ظلم کی چکی میں پیسا، لیکن اسی شہر مکہ میں فتح مکہ کے موقع پر جب حضورِ اقدس ﷺ فاتح بن کر داخل ہوئے تو اس موقع کا نقشہ کھینچتے ہوئے حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ حضورِ اقدس ﷺ اونٹنی پر سوار ہو کر فاتح بن کر مکہ مکرمہ میں اس شان سے داخل ہو رہے ہیں کہ آپ کی گردن جھکی ہوئی ہے۔ کوئی دوسرا فاتح ہوتا تو اس کی گردن تنی ہوئی ہوتی، لیکن حضورِ اقدس ﷺ کی گردن جھکی ہوئی ہے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور زبان مبارک پر یہ آیات جاری ہیں:

﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا﴾(۱)

''ہم نے آپ کو فتح مبین عطا فرمائی''(۲)

عام معافی کا اعلان

اور اس وقت آپ ﷺ نے عام معافی کا اعلان کر دیا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے وہ مامون ہے، جو شخص اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے اس کو بھی امن ہے، جو شخص حرم میں داخل ہو جائے اس کو بھی امن ہے، جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے اس کو بھی امن ہے۔ پھر آپ نے تمام اہل مکہ کو جمع کر کے فرمایا:

((لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَأَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ))

''آج کے دن تم پر کوئی ملامت نہیں اور تم سب آزاد ہو''(۳)

یہ سلوک آپ ﷺ نے ان لوگوں کے ساتھ کیا جو آپ کے خون کے پیاسے تھے۔

ان سنتوں پر بھی عمل کرو

بہر حال! انبیاء علیہم السلام کی سنت یہ ہے کہ برائی کا جواب برائی سے مت دو، گالی کا جواب گالی سے مت دو، بلکہ اپنے مقابل کے ساتھ احسان کرو۔ حضورِ اقدس ﷺ کی زندگی کے جتنے طریقے ہیں وہ سب سنت ہیں۔ ہم نے صرف چند ظاہری چیزوں کا نام سنت رکھ لیا ہے، مثلاً داڑھی رکھ لینا، خاص طریقے کا لباس پہن لینا، جتنی سنتوں پر بھی عمل کی توفیق ہو جائے، وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، لیکن سنتیں

---

(۱) الفتح: ۱ (۲) سيرة المصطفى (۳/ ۲٤) بحوالة ابن اسحاق و مستدرك الحاكم

(۳) البداية والنهاية (٤/ ۳۰۰- ۳۰۱)

صرف ان کے اندر منحصر نہیں، بلکہ یہ بھی حضورِ اقدس ﷺ کی سنت ہے کہ برائی کا جواب برائی سے نہ دو، گالی کا جواب گالی سے نہ دو، اگر اس سنت پر عمل ہو جائے تو ایسے شخص کے بارے میں قرآن شریف کا ارشاد ہے:

﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ﴾(۱)

''جس شخص نے صبر کیا اور معاف کر دیا تو البتہ یہ بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہے''

یہ بڑے ہمت کی بات ہے کہ آدمی کو غصہ آ رہا ہے اور خون کھول رہا ہے، اس وقت آدمی ضبط کر کے حدود پر قائم رہے اور سامنے والے کو معاف کر دے اور راستہ بدل دے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا﴾(۲)

''جو لغو باتوں سے کنارہ کش رہنے والے ہیں''

اس سنت پر عمل کرنے سے دنیا جنت بن جائے

آپ حضرات ذرا سوچیں کہ اگر حضورِ اقدس ﷺ کی یہ سنت حاصل ہو جائے تو پھر دنیا میں کوئی جھگڑا باقی رہے گا؟ سارے جھگڑے، سارے فسادات، ساری عداوتیں، ساری دشمنیاں اس وجہ سے ہیں کہ آج اس سنت پر عمل نہیں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس سنت پر عمل کی توفیق عطا فرما دیں تو یہ دنیا جو آج جھگڑوں کی وجہ سے جہنم بنی ہوئی ہے، جس میں عداوتوں کی آگ سلگ رہی ہے، نبی کریم ﷺ کی اس سنت پر عمل کرنے کے نتیجے میں جنت بن جائے، گل و گلزار بن جائے۔

جب تکلیف پہنچے تو یہ سوچ لو

جب بھی آپ کو کسی سے تکلیف پہنچے تو یہ سوچو کہ میں بدلہ لینے کے کس چکر میں پڑوں، ہٹاؤ اس کو اور اللہ اللہ کروں اور اس کو معاف کر دوں۔ اصل میں ہوتا یہ ہے کہ ایک شخص نے آپ کے ساتھ زیادتی کر لی، آپ نے اس سے زیادہ زیادتی کر لی، اب دوسرا شخص اس زیادتی کا بدلہ لے گا اور پھر آپ اس سے بدلہ لیں گے، اس طرح عداوتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا جس کی کوئی انتہا نہیں، لیکن بالآخر تمہیں کسی مرحلے پر ہار ماننی پڑے گی اور اس جھگڑے کو ختم کرنا ہوگا، لہٰذا تم پہلے دن ہی معاف کر کے جھگڑا ختم کر دو۔

(۱) الشوریٰ: ۴۳ (۲) الفرقان: ۷۲

چالیس سالہ جنگ کا سبب

زمانۂ جاہلیت میں ایک طویل جنگ ہوئی ہے جو ''جنگِ بسوس'' کہلاتی ہے۔ اس جنگ کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ ایک شخص کی مرغی کا بچہ تھا، وہ کسی دوسرے شخص کے کھیت میں چلا گیا اور وہاں جا کر اس نے پودے خراب کر دیئے، بس اس پر لڑائی شروع ہوگئی، ان دونوں کے قبیلے اور خاندان والے آگئے، پہلے لاٹھیاں نکلیں اور پھر تلواریں نکل آئیں، پھر یہ لڑائی چالیس سال تک جاری رہی، جب باپ کا انتقال ہوتا تو وہ اپنے بیٹے کو وصیت کر جاتا کہ بیٹا اور سب کام کر لینا لیکن میرے قاتلوں کو معاف نہ کرنا۔ صرف ایک مرغی کے بچے کی وجہ سے چالیس سال تک لڑائی چلتی رہی، اگر پہلے دن ہی قرآن کریم کی اس آیت:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ﴾

پر عمل کر لیتے تو یہ لڑائی اسی دن ختم ہو جاتی۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے یہ بات ہمارے دلوں میں اُتار دے اور ہمیں اس پر عمل کرنے کی ہمت اور حوصلہ عطا فرما دے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

دوسروں کی چیزوں کا استعمال ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

اَمَّا بَعْدُ!

عَنْ مُسْتَوْرِدِ بْنِ شَدَّادٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ حَدَّثَهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:((مَنْ أَكَلَ بِرَجُلٍ مُسْلِمٍ اَكْلَةً فَإِنَّ اللّٰهَ يُطْعِمُهُ مِثْلَهَا مِنْ جَهَنَّمَ، وَمَنْ كُسِیَ ثَوْبًا بِرَجُلٍ مُسْلِمٍ فَإِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ يَكْسُوْهُ مِثْلَهُ مِنْ جَهَنَّمَ، وَمَنْ قَامَ بِرَجُلٍ مَقَامَ سُمْعَةٍ وَرِيَاءٍ فَإِنَّ اللّٰهَ يَقُوْمُ بِهٖ مَقَامَ سُمْعَةٍ وَرِيَاءٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ))(۱)

دوسروں کو تکلیف دے کر اپنا مفاد حاصل کرنا

حضرت مستورد بن شداد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص کسی مسلمان کے ذریعہ کوئی لقمہ کھائے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی مسلمان کی حق تلفی کر کے یا کسی مسلمان کو تکلیف پہنچا کر یا کسی مسلمان کو بدنام کر کے اپنا کوئی مفاد حاصل کرے، جیسے بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی معیشت کا دارومدار اس پر ہے کہ دوسروں کو تکلیف پہنچا کر اپنے کھانے کا سامان کرتے ہیں، مثلاً رشوت لے کر کھانا کھایا، اب اس نے درحقیقت ایک مسلمان کو ناحق تکلیف پہنچا کر کھانا کھایا۔ اسی طرح اگر کسی کو دھوکہ دے کر اس سے پیسے حاصل کر لیے تو اس نے بھی ایک مسلمان کو تکلیف پہنچا کر کھانا کھایا۔

اسی طرح اگر کسی مسلمان کو بدنام کر کے پیسے حاصل کر لیے، جیسے آج کل نشر و اشاعت اور پبلسٹی کا زمانہ ہے۔ بعض لوگ ایسے ہیں جنہوں نے نشر و اشاعت کے ذریعہ لوگوں کی بلیک میلنگ کو اپنا پیشہ اور ذریعہ آمدنی بنا رکھا ہے، اب ایسا شخص دوسرے کو بدنام کر کے پیسے حاصل کرتا ہے اور کھانا کھاتا ہے۔ یہ تمام صورتیں اس حدیث کے مفہوم کے اندر داخل ہیں کہ جو شخص کسی مسلمان کو تکلیف پہنچا کر

☆ اصلاحی خطبات (۱۱/ ۱۴۸ تا ۱۶۷)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) سنن أبی داود، کتاب الأدب، باب فی الغیبة، رقم: ٤٢٣٧، مسند أحمد، رقم: ١٧٣٢٥

کھانا کھائے تو جتنا کھانا اس نے اس طریقے سے حاصل کر کے کھایا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو اس کھانے کے وزن کے برابر جہنم کے انگارے کھلائیں گے۔

دوسروں کو تکلیف دے کر لباس یا شہرت حاصل کرنا

اسی طرح جو شخص کسی دوسرے مسلمان کو تکلیف پہنچا کر اور اس کی حق تلفی کر کے پیسے کمائے گا اور پھر ان پیسوں سے لباس بنائے گا تو اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ اس کو جہنم کا اتنا ہی لباس پہنائیں گے یعنی آگ کے انگاروں کا لباس پہنائیں گے۔

اسی طرح جو شخص دوسرے مسلمان کو تکلیف پہنچا کر شہرت کے مقام تک پہنچے، جیسے بعض لوگ دوسروں کی برائی کر کے اپنی اچھائی ثابت کرتے ہیں، چنانچہ الیکشن کے دوران لوگ یہ کام کرتے ہیں کہ انتخابی جلسوں میں دوسروں کی خرابی بیان کر کے اپنی اچھائی بیان کرتے ہیں، ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بدنامی کے مقام پر کھڑا کریں گے۔ یہاں دنیا میں تو اس نے نیک شہرت حاصل کر لی، لیکن اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ وہاں اس کو بری شہرت عطا فرمائیں گے، اور برسرِ عام اس کو رسوا کریں گے کہ یہ وہ شخص ہے جس نے مسلمان کو تکلیف پہنچا کر شہرت کا مقام حاصل کیا تھا۔

اس حدیث سے آپ اندازہ لگائیں کہ کسی مسلمان کو تکلیف پہنچانا اور اس کے حق کو پامال کرنا کتنا خطرناک کام ہے اور یہ کتنی بری بلا ہے۔ اس لئے میں بار بار یہ عرض کرتا ہوں کہ ہر شخص اپنے برتاؤ اور اپنے طرزِ عمل میں اس بات کو مدنظر رکھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دوسرے کا حق پامال ہو جائے اور پھر قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کا حساب ہم سے لے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین

دوسرے کی چیز لینا

ایک اور حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے کسی ساتھی یا دوست کا سامان نہ مذاق میں لے اور نہ سنجیدگی میں لے۔ (۱)

ایک چیز دوسرے کی ملکیت ہے تو آپ کے لئے یہ جائز نہیں کہ اس کی اجازت بلکہ اس کی خوشدلی کے بغیر وہ چیز استعمال کریں یا اس کو قبضہ میں لیں، نہ تو سنجیدگی میں ایسا کرنا جائز ہے اور نہ ہی مذاق میں ایسا کرنا جائز ہے، چاہے وہ دوسرا شخص تمہارا قریبی دوست اور رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، لیکن اس کی چیز کو اس کی اجازت اور اس کی خوشدلی کے بغیر استعمال کرنا ہرگز جائز نہیں۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الفتن عن رسول اللہ، ما جاء لا یحلّ لمسلم أن یروع مسلما، رقم: ۲۰۸۶، سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، من یأخذ الشیء علی المزاح، رقم: ۴۳۵۰، مسند أحمد، رقم: ۱۷۲۶۱

خوش دلی کے بغیر دوسرے کی چیز حلال نہیں

ایک اور حدیث میں جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ إِلَّا بِطِيْبِ نَفْسٍ مِنْهُ))(۱)

کسی بھی مسلمان کا کوئی مال اس کی خوشدلی کے بغیر دوسرے کے لئے حلال نہیں۔ اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے اجازت کا لفظ استعمال نہیں فرمایا بلکہ خوشدلی کا لفظ استعمال فرمایا، مثلاً آپ نے کسی شخص سے ایسی چیز مانگ لی کہ اس کا دل تو نہیں چاہ رہا ہے لیکن مروّت کے دباؤ میں آ کر اس نے وہ چیز دیدی اور اندر سے اس کا دل خوش نہیں ہے، اس صورت میں اگر آپ اس کی چیز استعمال کریں گے تو آپ کے لئے اس کا استعمال کرنا جائز نہیں ہوگا، اس لئے کہ آپ نے اس کا مال اس کی خوشدلی کے بغیر لے لیا۔

''مولویت'' بیچنے کی چیز نہیں

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے کسی استاذ یا شیخ کا واقعہ نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہ کسی دکان پر کوئی چیز خریدنے گئے، اور انہوں نے اس چیز کی قیمت پوچھی، دکاندار نے قیمت بتادی، جس وقت قیمت ادا کرنے لگے تو اس وقت ایک اور صاحب وہاں پہنچ گئے جو ان کے جاننے والے تھے، وہ دکاندار ان کو نہیں جانتا تھا کہ یہ فلاں مولانا صاحب ہیں، چنانچہ ان صاحب نے دکاندر سے کہا کہ یہ فلاں مولانا صاحب ہیں، لہٰذا ان کے ساتھ رعایت کریں۔ حضرت مولانا نے فرمایا:

> ''میں اپنے مولوی ہونے کی قیمت نہیں لینا چاہتا، اس چیز کی جو اصل قیمت ہے وہی مجھ سے لے لو۔ اس لئے کہ پہلے جو قیمت تم نے بتائی تھی، اس قیمت پر تم خوشدلی سے یہ چیز دینے کے لئے تیار تھے، اب اگر دوسرے آدمی کے کہنے سے تم نے رعایت کردی، اور دل اندر سے مطمئن نہیں ہے تو اس صورت میں وہ خوشدلی سے دینا نہیں ہوگا، اور پھر میرے لئے اس چیز میں برکت نہیں ہوگی اور اس کا لینا بھی میرے لئے حلال نہیں ہوگا، لہٰذا جتنی قیمت تم نے لگائی ہے اتنی قیمت لے لو''

اس واقعہ سے اس طرف اشارہ فرمادیا کہ ''یہ ''مولویت'' بیچنے کی چیز نہیں'' کہ بازار میں اس کو

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب تفسیر القرآن عن رسول اللہ، رقم: ۳۰۱۲، مسند أحمد، حدیث عم أبی حرة الرقاشی عن عمه، رقم: ۱۹۷۷٤

بیچا جائے کہ لوگ اس کی وجہ سے اشیاء کی قیمت کم کردیں۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی وصیت

بلکہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جن کے ہم سب مقلد ہیں، اپنے شاگرد حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کو یہ وصیت فرمائی:

''جب تم کوئی چیز خرید دیا کرایہ پرلو تو جتنا کرایہ اور جتنی قیمت عام لوگ دیتے ہیں، تم اس سے کچھ زیادہ دیدو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے کم دینے کی وجہ سے علم اور دین کی بے عزتی اور بے توقیری ہو''

جن حضرات کو اللہ تعالیٰ نے احتیاط کا یہ مقام عطا فرمایا ہے وہ اس حد تک رعایت فرماتے ہیں کہ دوسرے کی چیز کہیں اس کی خوشدلی کے بغیر ہمارے پاس نہ آجائے۔ مثلاً آپ نے کسی سے کوئی چیز مانگ لی تو مانگنے سے پہلے ذرا یہ سوچو کہ اگر تم سے کوئی دوسرا شخص یہ چیز مانگتا تو کیا تم خوشدلی سے اس کو دینے پر راضی ہوجاتے؟ اگر تم خوشدلی سے راضی نہ ہوتے تو پھر وہ چیز دوسرے سے بھی مت مانگو۔ اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ مروّت کے دباؤ میں آکر وہ شخص تمہیں وہ چیز دیدے لیکن اس کا دل اندر سے راضی نہ ہو، اور اس کے نتیجے میں تم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مصداق بن جاؤ کہ کسی مسلمان کا مال اس کی خوشدلی کے بغیر حلال نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احتیاط کا ایک واقعہ

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا عالی مقام تھا کہ آپ نے اس حد تک احتیاط فرمائی کہ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے فرمانے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے جو محل جنت میں بنایا ہے، وہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اور وہ محل اتنا شاندار تھا کہ میرا دل چاہا کہ میں اس محل کے اندر چلا جاؤں، لیکن جب میں نے اندر جانے کا ارادہ کیا تو مجھے تمہاری غیرت یاد آگئی، مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں بڑی غیرت بخشی ہے، اگر کوئی دوسرا شخص تمہارے گھر کے اندر اجازت کے بغیر داخل ہو تو تمہیں غیرت آتی ہے، اس لئے میں نے یہ سوچا کہ تمہارے بغیر اس میں داخل نہیں ہونا چاہئے، لہٰذا میں داخل نہ ہو۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ یہ سن کر رو پڑے اور عرض کیا:

"أَوَ عَلَيْكَ أَغَارُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟"

''یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، کیا میں آپ سے غیرت کروں گا؟''(۱)

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب مناقب عمر بن (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

اُمت کے لئے سبق

اب آپ اندازہ لگائیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ جانتے ہیں کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جیسا انسان وہ اپنی جان، اپنا مال، اپنی عزت و آبرو، اپنا سب کچھ آپ پر قربان کرنے کے لئے تیار ہیں، ان کے پاس اگر کوئی بڑی سے بڑی نعمت ہو اور وہ نعمت جناب رسول اللہ ﷺ کے استعمال میں آجائے تو وہ اس کو اپنے لئے باعثِ فخر سمجھیں گے، لیکن اس کے باوجود آپ ان کے محل میں داخل نہیں ہوئے، جبکہ وہ جگہ بھی جنت کی جگہ تھی جو تکلیف کی جگہ نہیں ہوتی۔ لیکن علماء کرام رحمہم اللہ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث سے درحقیقت سرکارِ دو عالم ﷺ اُمت کو یہ سبق دینا چاہتے ہیں کہ دیکھو! میں بھی اپنے ایسے فدا کار اور جانثار صحابی کے گھر میں اس کی اجازت کے بغیر داخل نہیں ہوا، تو تم لوگوں کے لئے عام حالات میں دوسروں کی چیز اس کی خوشدلی اور اجازت کے بغیر استعمال کرنا کیسے جائز ہوگا۔؟

سلام کے جواب کے لئے تیمّم کرنا

اللہ تعالیٰ ہمارے محدثین عظام اور فقہاء کرام رحمہم اللہ کی قبروں کو نور سے بھر دے، آمین۔ یہ حضرات ہمارے لئے عجیب ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں۔ چنانچہ ایک صحابی نے ایک حدیث بیان فرمائی کہ حضورِ اقدس ﷺ ایک مرتبہ ایک راستے میں گزر رہے تھے، ایک صحابی نے آپ کو دیکھ کر آپ کو سلام کیا۔ یہ ابتداء اسلام کا زمانہ تھا، اور اس وقت اللہ تعالیٰ کا نام وضو کے بغیر لینا مکروہ تھا، اور ''سلام'' بھی اللہ کے اسماء حسنیٰ میں سے ہے، اس وقت حضورِ اقدس ﷺ وضو سے نہیں تھے، اب اگر اس حالت میں ''وعلیکم السلام'' فرماتے تو اللہ تعالیٰ کا نام وضو کے بغیر لینا ہو جاتا، اس لئے آپ ﷺ نے وضو کے بغیر نام لینے سے بچنے کے لئے یہ کیا کہ قریب میں جو مکان تھا، اس کی دیوار سے تیمّم فرمایا اور پھر آپ نے ''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' کہہ کر جواب دیا۔ (۱)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) الخطاب أبی حفص القرشی العدوی، رقم: ۳٤۰۳، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل عمر، رقم: ٤٤۰۸، مسند أحمد، رقم: ۱۳۸۰۱

(۱) صحیح البخاری، کتاب التیمم، باب التیمم فی الحضر إذا لم یجد الماء وخاف فوت الصلاة، رقم: ۳۲۵، صحیح مسلم، کتاب الحیض، باب التیمم، رقم: ٥٥٤، سنن النسائی، کتاب الطهارة، باب التیمم فی الحضر، رقم: ۳۰۹، سنن أبی داؤد، کتاب الطهارة، باب التیمم فی الحضر، رقم: ۲۷۸، مسند أحمد، رقم: ۱٦۸۸۳۔

علماء کا احادیث سے مسائل کا نکالنا

ان صحابی نے یہ حدیث بیان فرمادی، لیکن فقہاء کرام رحمہم اللہ کا معاملہ ایسا ہے کہ ایک ایک حدیث سے اُمت کے لئے کیا کیا ہدایات نکل رہی ہیں، ان کے نکالنے میں لگ جاتے ہیں۔ احادیث سے احکام نکالنے کا جب میں تصور کرتا ہوں تو میرے سامنے یہ منظر آجاتا ہے کہ جب کوئی ہوائی جہاز کسی ایئرپورٹ پر اُترتا ہے تو جیسے ہی وہ اُترتا ہے فوراً تمام لوگ اپنی اپنی ڈیوٹیاں انجام دینا شروع کردیتے ہیں، کوئی اس کی صفائی کر رہا ہے، کوئی اس میں پٹرول بھر رہا ہے، کوئی مسافروں کو اُتار رہا ہے، کوئی کھانا چڑھا رہا ہے، سب لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ اسی طرح جب سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث سامنے آتی ہے تو اُمت کے علماء بھی مختلف جہتوں سے اس حدیث پر کام کرنے میں لگ جاتے ہیں، کوئی اس حدیث کی سند کی چھان بین کر رہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے یا نہیں؟ کوئی راویوں کی جانچ پڑتال کر رہا ہے، کوئی اس حدیث سے نکلنے والے احکام بتا رہا ہے کہ اس حدیث سے کیا کیا احکام نکل رہے ہیں، کیا کیا رہنمائی اس سے حاصل ہو رہی ہے۔ تو حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کا کام یہ ہے کہ جب کوئی حدیث ان کے سامنے آتی ہے تو اس حدیث کے ایک ایک جز کی بال کی کھال نکال کر احکام مستنبط فرماتے ہیں۔

بلبل والی حدیث سے ۱۱۰ مسائل کا استنباط

یاد آیا کہ شمائل ترمذی میں حدیث ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے ایک چھوٹے بھائی تھے، جو بچے تھے، انہوں نے ایک بلبل پال رکھا تھا، وہ بلبل مرگیا، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن ان کے پاس تشریف لے گئے تو اس بچے سے آپ نے پوچھا:

((يَا أَبَا عُمَيْرٍ مَا فَعَلَ النُّغَيْرُ؟))

''اے ابوعمیر! تم نے وہ جو بلبل پال رکھا تھا، اس کا کیا ہوا؟''(۱)

صرف ایک اس حدیث سے حضرات فقہاء کرام نے ایک سو دس ۱۱۰ فقہی مسائل نکالے ہیں۔ اور ایک محدث نے اس ایک حدیث کی تشریح اور اس سے نکلنے والے احکام پر مستقل کتاب لکھی ہے۔

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الأدب، باب الإنبساط الى الناس......، رقم: ٥٦٦٤، سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب ما جاء في الصلاة على البسط، رقم: ٣٠٥، سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب ما جاء في الرجل يتكنى وليس له ولد، رقم: ٤٣١٨، سنن ابن ماجه، كتاب الأدب، باب المزاح، رقم: ٣٧١٠، مسند أحمد، رقم: ١٠٦٧

سلام کے جواب کے لئے تیمّم کرنا جائز ہے

بہر حال، ان صحابی کے سلام کے جواب کے لئے آپ نے پہلے تیمم فرمایا پھر سلام کا جواب دیا۔ اس حدیث سے بھی فقہاء کرام نے بہت سے مسائل نکالے ہیں۔ چنانچہ اس حدیث سے فقہاء رحمہم اللہ نے ایک مسئلہ یہ نکالا ہے کہ جس کام کے لئے وضو کرنا واجب نہیں بلکہ مستحب ہے تو اس کام کے لئے وضو کے بجائے تیمم کرنا جائز ہے۔ مثلاً دعا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے وضو کو ضروری اور واجب قرار نہیں دیا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنا دروازہ کھٹکھٹانے اور دعا کرنے کو آسان کر دیا کہ اس کے لئے وضو کی شرط نہیں رکھی بلکہ پاکی کی شرط بھی نہیں رکھی، لہٰذا اگر کوئی شخص جنابت اور ناپاکی کی حالت میں بھی دعا کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ لیکن بہتر اور مستحب یہ ہے کہ آدمی دعا کرتے وقت باوضو ہو اور اگر وضو کا موقع نہ ہو تو تیمم کر لے، کیونکہ تیمم کر کے دعا کرنا بے وضو دعا کرنے سے بہتر ہے۔ اگرچہ اس تیمم سے نماز پڑھنا اور ایسے کام کرنا جائز نہیں ہوگا جن کے لئے وضو کرنا واجب ہے، لیکن اس تیمّم سے دعا کر سکتا ہے۔

ذکر کے لئے تیمّم کرنا

مثلاً کوئی شخص ذکر کرنا چاہتا ہے یا تسبیح پڑھنا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنا نام لینا اتنا آسان فرما دیا ہے کہ اس کے لئے وضو کی شرط نہیں، البتہ باوضو ہو کر ذکر کرنا مستحب ہے، لہٰذا اگر وضو کرنے کا موقع نہیں ہے اور ذکر کرنا چاہتا ہے تو کم از کم یہ کرے کہ تیمم کر کے ذکر کر لے، کیونکہ تیمم کر کے ذکر کرنا بے وضو ذکر کرنے سے بہتر ہے۔ البتہ اس تیمم سے کسی قسم کی نماز پڑھنا جائز نہیں ہوگا۔

دوسرے کی دیوار سے تیمّم کرنا

فقہاء کرام رحمہم اللہ نے اس حدیث سے دوسرا مسئلہ یہ نکالا ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دیوار سے تیمم فرمایا اور وہ کسی دوسرے شخص کے گھر کی دیوار تھی، تو اب سوال یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے شخص کے گھر کی دیوار کو اس کی اجازت کے بغیر تیمم کے لئے کیسے استعمال فرمایا؟ اس لئے کہ دوسرے کی چیز اس کی اجازت اور اس کی خوشدلی کے بغیر استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔ فقہاء کرام نے یہ سوال اُٹھایا، وہ بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اُٹھایا کہ آپ نے وہ دیوار کس طرح استعمال فرمائی۔

پھر فقہاء کرام رحمہم اللہ نے اس کا جواب بھی خود دیا، کہ بات دراصل یہ تھی کہ مکان کے باہر کی دیوار سے تیمم کرنے کی صورت میں یہ بات سو فیصد یقینی تھی کہ کوئی بھی آپ کو اس عمل سے منع نہ کرتا،

اس لئے آپ کے لئے اس دیوار سے تیمم کرنا جائز تھا۔ لہٰذا جہاں اس بات کا سو فیصد مکمل یقین ہو کہ دوسرا شخص نہ صرف یہ کہ اس کو استعمال کرنے کی اجازت دے گا بلکہ وہ خوش ہوگا تو اس صورت میں اس چیز کا استعمال کر لینا جائز ہے۔ اب آپ اندازہ لگائیں کہ فقہاء کرام نے کتنی باریک بات کو پکڑ لیا۔

کسی قوم کی کوڑی کو استعمال کرنا

فقہاء کرام رحمہم اللہ نے یہی سوال ایک اور حدیث پر بھی اُٹھایا ہے، وہ حدیث شریف یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کہیں تشریف لے جارہے تھے، آپ کو پیشاب کرنے کی حاجت ہوئی، ایک جگہ پر کسی قوم کی ''کوڑی'' تھی، جہاں لوگ اپنا کچرا ڈالتے تھے، اس ''کوڑی'' پر آپ نے پیشاب کیا۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

''اَتٰی سُبَاطَۃَ قَوْمٍ''

''کسی قوم کے کوڑا ڈالنے کی جگہ پر آپ پہنچے''(۱)

اب فقہاء نے اس پر سوال اُٹھایا ہے کہ وہ کوڑا ڈالنے کی جگہ کسی قوم کی ملکیت تھی تو آپ نے اس کو ان کی اجازت کے بغیر کیسے استعمال فرمالیا؟

پھر خود ہی فقہاء نے اس کا جواب بھی دیا کہ دراصل وہ عام استعمال کی جگہ تھی اور اسی مقصد کے لئے وہ جگہ چھوڑی گئی تھی، لہٰذا کسی شخص کی ملکیت میں کوئی خلل ڈالنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

میزبان کے گھر کی چیز استعمال کرنا

اس سے آپ اندازہ لگائیں کہ شریعت میں کسی دوسرے شخص کی چیز کو استعمال کرنے کے بارے میں کتنی حساسیت پائی جاتی ہے۔ مثلاً ہم دوسرے شخص کے گھر مہمان بن کر گئے۔ اب اگر اس کے گھر کی کوئی چیز آپ کو استعمال کرنی ہے تو استعمال کرنے سے پہلے ذرا یہ سوچو کہ میرے لئے اس کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟ اور یہ سوچو کہ میرے استعمال کرنے سے میزبان خوش ہوگا یا اس کے دل میں تنگی پیدا ہوگی؟ اگر اس کے دل میں تنگی پیدا ہونے کا ذرا بھی اندیشہ ہو تو اس صورت میں اس چیز کو آپ

(۱) صحیح البخاری، کتاب الوضوء، باب البول قائما وقاعدا، رقم: ۲۱۷، صحیح مسلم، کتاب الطھارۃ، باب المسح علی الخفین، رقم: ۴۰۲، سنن الترمذی، کتاب الطھارۃ عن رسول اللّٰہ، باب الرخصۃ فی ذلک، رقم: ۱۳، سنن النسائی، کتاب الطھارۃ، باب الرخصۃ فی ترک ذلک، رقم: ۱۸، سنن أبی داؤد، کتاب الطھارۃ، باب البول قائما، رقم: ۲۱، سنن ابن ماجہ، کتاب الطھارۃ وسننھا، باب ما جاء فی البول قائما، رقم: ۳۰۱، مسند أحمد، رقم: ۲۲۱۵۷۔

کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں۔

ہمارے معاشرے میں اس بارے میں بہت بے احتیاطی پائی جاتی ہے، چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ دوست کے گھر میں چلے گئے اور سوچا کہ یہ تو ہمارا بے تکلف دوست ہے، اب دوستی اور بے تکلفی کی مد میں اس کو لوٹنا شروع کردیا اور اس کی چیزوں کو استعمال کرنا شروع کردیا۔ یہ جائز نہیں، کیونکہ حضورِ اقدس ﷺ نے صاف صاف فرمادیا کہ مذاق میں بھی دوسرے کی چیز اُٹھا کر استعمال کرنا جائز نہیں، تو پھر سنجیدگی میں کیسے جائز ہوسکتا ہے۔ لہٰذا ہمیں اس بات کا جائزہ لینا چاہئے کہ ہم بے تکلفی کی آڑ میں کہاں کہاں حضورِ اقدس ﷺ کے اس حکم کی خلاف ورزی کررہے ہیں۔

بیٹے کے کمرے میں داخل ہونے کے لئے اجازت

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ساری عمر یہ معمول ہم نے دیکھا کہ جب کبھی آپ کسی کام سے اپنی اولاد کے کمرے میں داخل ہونے کا ارادہ فرماتے تو داخل ہونے سے پہلے اجازت لیتے، حالانکہ وہ کمرہ ہماری ملکیت نہیں ہوتا تھا، انہی کی ملکیت ہوتا تھا، اس کے باوجود پہلے اجازت لیتے کہ اندر آجائیں۔ اور اگر کبھی حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو وہ چیز استعمال کرنے کی ضرورت پیش آتی جو ہمارے استعمال میں ہے، تو ہمیشہ پہلے پوچھ لیتے کہ یہ تمہاری چیز میں استعمال کرلوں؟ اب آپ اندازہ لگائیں کہ ایک باپ اپنے بیٹے سے پوچھ رہا ہے کہ میں تمہاری چیز استعمال کرلوں؟ حالانکہ حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

((أَنْتَ وَمَالُكَ لِأَبِيْكَ))

''تم خود اور تمہارا مال سب تمہارے باپ کا ہے''(۱)

لیکن اس کے باوجود اس درجہ احتیاط تھی کہ بیٹے سے پوچھ کر اس کی چیز استعمال فرمارہے ہیں، تو جب اپنی اولاد کی چیز استعمال کرنے میں یہ احتیاط ہونی چاہئے تو جن کے ساتھ یہ رشتہ نہیں ہے، ان کی چیزوں کو ان کی اجازت کے بغیر استعمال کرنا کتنی سنگین بات ہے۔

اطلاع کے بغیر دوسرے کے گھر جانا

یہ تمام چیزیں ہم نے اپنے دین سے خارج کردی ہیں، بس آج کل تو عبادات کا اور نماز روزے کا نام دین سمجھ لیا ہے، اور اس سے آگے جو معاملات ہیں ان کو ہم نے دین سے خارج کردیا

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب التجارات، باب ما للرجل من مال ولده، رقم: ۲۲۸۲، مسند أحمد، رقم: ٦٦٠٨

ہے۔ مثلاً کسی دوسرے کے گھر میں اطلاع کے بغیر کھانے کے وقت پہنچ جانا دین کے خلاف ہے۔ جیسے آج کل ہوتا ہے کہ پیر صاحب اپنے مریدوں کا لشکر لے کر کسی مرید پر حملہ آور ہو گئے۔ اور پیر صاحب کے ذہن میں یہ ہے کہ یہ تو ہمارا مرید ہے، لہٰذا اس کو تو ہر حال میں ہماری خاطر تواضع کرنی ہی کرنی ہے۔ یہ میں آپ کو آنکھوں دیکھا واقعہ بتا رہا ہوں۔ اب وہ مرید بیچارہ پریشان کہ عین وقت پر میں کیا انتظام کروں، اتنی بڑی فوج آگئی ہے اس کے لئے کہاں سے تواضع کا انتظام کروں؟ ـــ اب دیکھئے! نمازیں بھی ہو رہی ہیں، تہجد، اشراق، چاشت، ذکر واذکار، سب عبادات ہو رہی ہیں، اور پیر صاحب بنے ہوئے ہیں۔ لیکن بغیر اطلاع کے مرید کے گھر پہنچ گئے۔ یاد رکھئے! یہ اس حدیث کے اندر داخل ہے جس میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ إِلَّا بِطِيبِ نَفْسٍ مِنْهُ))(۱)

لیکن پیر صاحب کو اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ اس سے مرید کو تکلیف ہو رہی ہے یا پریشانی ہو رہی ہے، یا اس کا مال اس کی خوشدلی کے بغیر حاصل کیا جا رہا ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں یہ باتیں پھیل گئی ہیں اور اس کو دین کا حصہ ہی نہیں سمجھتے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کی صحیح فہم عطا فرمائے اور ہر چیز کو اس کے مقام پر رکھنے کا ذوق عطا فرمائے کہ جس چیز کا جو مقام ہے اسی کے مطابق اس پر عمل ہو۔

خوش دلی کے بغیر چندہ لینا

اسی طرح آج کل چندہ کا مسئلہ ہے، یہ چندہ خواہ کسی بھی نیک مقصد کے لئے ہو، چاہے مدرسے کے لئے ہو، چاہے مسجد کے لئے ہو، یا جہاد کے لئے ہو، یا تبلیغ کے لئے ہو، لیکن اگر چندہ کرتے وقت کسی موقع پر ذرا سا بھی دباؤ کا عنصر آجائے گا تو وہ چندہ حرام ہو جائے گا۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا اس موضوع پر مستقل رسالہ ہے، جس میں انہوں نے فرمایا کہ آج کل جو چندہ کا طریقہ ہے کہ بڑی شخصیات اپنی شخصیت کا دباؤ ڈال کر چندہ وصول کرتے ہیں، کیونکہ اگر مدرسے کے کسی معمولی سفیر کو چندہ کے لئے بھیجا جائے گا تو چندہ کم وصول ہوگا، لہٰذا کسی بڑے اور صاحبِ حیثیت کو چندہ کے لئے بھیجا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس کے پاس وہ صاحبِ حیثیت چندہ کے لئے پہنچے گا تو وہ یہ سوچے گا کہ اتنا بڑا آدمی میرے پاس آیا ہے تو اب تھوڑے پیسے کیا دوں، چنانچہ وہ زیادہ پیسے دے گا۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ درحقیقت شخصیت کا دباؤ ڈالنا ہے، اور

(۱) سنن الترمذی، کتاب تفسیر القرآن عن رسول الله، رقم: ۳۰۱۲، مسند أحمد، حدیث عم أبی حرۃ الرقاشی عن عمه، رقم: ۱۹۷۷٤، حدیث مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: "کسی انسان کا مال دوسرے کے لئے اس کی دلی خوشی کے بغیر جائز نہیں"

شخصیت کا دباؤ ڈال کر جو چندہ وصول کیا جائے گا وہ خوشدلی کا چندہ نہیں ہوگا، اور جب وہ چندہ خوشدلی کا نہیں ہے تو وہ حرام ہے اور اس حدیث کے تحت داخل ہے جس میں آپ نے فرمایا:

((لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ إِلَّا بِطِيْبِ نَفْسٍ مِنْهُ))(۱)

عام مجمع میں چندہ کرنا

اسی طرح عام مجمع کے اندر چندہ کا اعلان کر کے وہیں چندہ جمع کیا جارہا ہے، اب جو صاحبِ حیثیت اس مجمع کے اندر بیٹھا ہے، وہ سوچ رہا ہے کہ سب لوگ تو چندہ دے رہے ہیں، اگر میں چندہ نہیں دوں گا تو میری ناک کٹ جائے گی، اور اگر تھوڑا چندہ دوں گا تو بھی بے عزتی ہو جائے گی، لہٰذا مجھے زیادہ دینا چاہئے۔ اب اس دباؤ میں آ کر اس نے زیادہ چندہ دیدیا۔

یاد رکھئے! اس دباؤ میں آ کر جو چندہ دے گا وہ خوشدلی کا چندہ نہیں ہے اور اس حدیث کے تحت داخل ہے جس میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

((لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ إِلَّا بِطِيْبِ نَفْسٍ مِنْهُ))(۱)

اسی لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا اپنے متعلقین کے لئے عام معمول یہ تھا کہ عام مجمع میں چندہ کرنے کی اجازت نہیں تھی، اس لئے کہ اس میں لوگ شرما حضوری میں اور مروّت میں آ کر چندہ دیدیتے ہیں جو جائز اور حلال نہیں۔

غزوۂ تبوک کے واقعہ سے اشکال اور اس کا جواب

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بات میں نے ایک مرتبہ بیان کی تو ایک صاحب نے کہا کہ حضورِ اقدس ﷺ نے بھی غزوۂ تبوک کے موقع پر مجمع میں چندہ کیا تھا۔ جب غزوۂ تبوک میں ضرورت پیش آئی تو آپ نے کھڑے ہو کر اعلان فرمایا کہ اس وقت جہاد کے لئے سامان کی شدید ضرورت ہے، جو شخص بھی اس میں خرچ کرے گا اس کو یہ ثواب ملے گا، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ یہ اعلان سن کر گھر کا سارا مال لے کر آ گئے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضورِ اقدس ﷺ نے بھی مجمع میں چندہ کا اعلان فرمایا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ اسی وقت اور اسی جگہ پر چندہ

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب تفسیر القرآن عن رسول اللہ، رقم: ۳۰۱۲، مسند أحمد، حدیث عم أبی حرۃ الرقاشی عن عمہ، رقم: ۱۹۷۷٤، حدیث مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: "کسی انسان کا مال دوسرے کے لئے اس کی دلی خوشی کے بغیر جائز نہیں"

کرو، بلکہ آپ نے یہ اعلان فرمادیا تھا کہ اتنی ضرورت ہے، جو شخص بھی اپنی سہولت کے مطابق جس وقت جتنا چاہے لاکر دیدے، چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بعد میں اشیاء لالاکر جمع کراتے رہے۔ یہ اعلان نہیں تھا کہ ابھی اور یہیں جمع کرو۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات کو ہم اپنے حالات پر کہاں قیاس کرسکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اخلاق ایسے مصفّی مزکی اور مجلی فرمادیئے تھے کہ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو محض دکھاوے کی خاطر چندہ دے۔ اللہ کے لئے چندہ دینا ہوتا دیتے، نہ دینا ہوتا تو نہ دیتے۔ ہمارے معاشرے کے لوگ دباؤ میں آجاتے ہیں، اور اس دباؤ کے نتیجے میں شرماشرمی میں دینے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا آج کل کے حالات کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عام مجمع میں اس طرح چندہ کرنا جس طرح عام دستور ہے، یہ جائز نہیں، کیونکہ ایسے چندے میں خوشدلی کا عنصر مفقود ہوتا ہے۔

چندہ کرنے کا صحیح طریقہ

چندہ کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ لوگوں کو متوجہ کردیں کہ یہ ایک ضرورت ہے اور دین کا صحیح مصرف ہے اور اس میں دینے میں ثواب ہے۔ لہٰذا جو چاہے اپنی خوشی کے ساتھ جب چاہے اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اور ثواب کے حصول کے لئے چندہ دیدے۔ یہ تمام احکام اسی حدیث سے نکل رہے ہیں کہ کوئی شخص دوسرے کا مال اور دوسرے کا سامان نہ تو سنجیدگی میں لے اور نہ مذاق میں لے۔

عاریت کی چیز جلدی واپس نہ کرنا

پھر حدیث میں ایک جملہ یہ ارشاد فرمایا:

((فَإِذَا أَخَذَ أَحَدُكُمْ عَصَا صَاحِبِهِ فَلْيَرُدَّهَا إِلَيْهِ))(۱)

یعنی اگر تم نے کسی وقت دوسرے کی لاٹھی بھی لے لی ہے تو اس کو واپس کردے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے کوئی چیز عاریۃً استعمال کے لئے لے لی ہے اور اس نے خوشدلی سے تمہیں دیدی ہے، خوشدلی سے اس نے وہ چیز دے کر کوئی جرم نہیں کیا، لہٰذا جب تمہاری وہ ضرورت پوری ہوجائے جس

(۱) سنن الترمذی، کتاب الفتن عن رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، باب ما جاء لا یحل لمسلم أن یروع مسلما، رقم: ۲۰۸۶، سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب من یأخذ الشیء علی المزاح، رقم: ۴۳۵۰، مسند أحمد، رقم: ۱۷۲۶۱

ضرورت کے لئے تم نے وہ چیز لی تھی تو پھر اس چیز کو جلد از جلد واپس لوٹاؤ۔ اس بارے میں بھی ہمارے یہاں کوتاہیاں اور غفلتیں ہوتی ہیں۔ ایک چیز کسی ضرورت کی وجہ سے کسی سے لے لی تھی، اب وہ گھر میں پڑی ہے، واپس کرنے کی فکر نہیں۔ ارے بھائی! جب تمہاری ضرورت پوری ہوگئی تو اب واپس کرو۔ اب جس شخص کی وہ چیز ہے ہوسکتا ہے کہ اس کو استعمال کرنے کی ضرورت ہو، لیکن وہ مانگتے ہوئے شرماتا ہو کہ اس کے پاس جا کر وہ چیز کیا مانگوں۔ اب اگر تم اس چیز کو استعمال کرو گے تو تم اس کی خوشدلی کے بغیر استعمال کرو گے، لہٰذا یہ استعمال کرنا تمہارے لئے حرام ہے۔

کتاب لے کر واپس نہ کرنا

اسی طرح ہمارے معاشرے میں یہ مسئلہ باقاعدہ گھڑ لیا گیا ہے کہ کتاب کی چوری، یہ کوئی چوری نہیں ہوتی، یعنی اگر کسی دوسرے سے کتاب پڑھنے کے لئے لے لی تو اب اس کتاب کو واپس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لہٰذا مطالعے کے بعد کتاب گھر میں پڑی ہے، اس کی واپسی کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ جبکہ حضور ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ جب تم نے دوسرے کی کوئی چیز لی ہو تو اس کو واپس کرنے کی فکر کرو اور جلد از جلد اس کو اصل مالک تک واپس پہنچاؤ۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو حضورِ اقدس ﷺ کے ان ارشادات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

دوسروں کے لئے پسندیدگی کا معیار ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

"أَمَّا بَعْدُ!

فَقَدْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((وَأَحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ))(۱)

ایک حدیث کا بیان کئی روز سے چل رہا ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے پانچ نصیحتیں فرمائیں، اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو یہ تاکید فرمائی کہ وہ خود ان باتوں کو سمجھیں اور عمل کریں، اور دوسروں تک بھی اس کو پہنچائیں۔ ان میں سے تین نصیحتوں کا بیان گذشتہ دنوں میں ہوا، اللہ تعالیٰ ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو

حضورِ اقدس ﷺ نے چوتھی نصیحت یہ فرمائی:

((وَأَحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ))

"دوسروں کے لئے وہی بات پسند کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو"

ان نصیحتوں میں سے ایک ایک نصیحت اتنی جامع، اتنی مانع اور ہمہ گیر ہے کہ اگر انسان کو ان پر عمل کی توفیق ہو جائے تو اس کی ساری زندگی سنور جائے۔ یہ نصیحت بھی انہی میں سے ہے کہ دوسروں کے لئے بھی وہی پسند کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو۔ نبی کریم ﷺ نے یہ ایک ایسا معیار عطا فرمادیا کہ اس کے ذریعے معاشرت کے جتنے اسلامی احکام ہیں، وہ سب اس ایک جملے کے اندر آجاتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو دین ہمیں عطا فرمایا ہے وہ عقائد اور عبادات کی حد تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق معاملات سے بھی ہے، معاشرت سے بھی ہے، اخلاق سے بھی ہے، اور دین کا ایک بہت بڑا باب "معاشرت" ہے، یعنی آپس میں ملنے جلنے میں اور آپس میں رہنے سہنے میں کیا

☆ اصلاحی خطبات (۱۶/ ۱۶۷۔۱۸۲) بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرّم، کراچی

(۱) سنن الترمذی، كتاب الزهد عن رسول الله، باب من اتقى المحارم فهو أعبد الناس، رقم: ۲۲۲۷، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب الورع والتقوى، رقم: ٤٢٠٧، مسند أحمد، رقم: ٧٧٤٨

آداب ہونے چاہئیں؟ کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزاری جائے؟ یہ معاشرت کا باب ہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے خاص طور پر اپنی مجددانہ تعلیمات میں ''معاشرت'' کو بہت زیادہ اہمیت کے ساتھ لوگوں کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے۔

مجھے اس سے نفرت ہو جاتی ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں تک فرمایا کہ میرے مریدین اور متعلقین میں سے کسی کے بارے میں جب مجھے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس نے ذکر، تسبیح یا نوافل کے معمولات میں کوتاہی کی ہے تو اس سے رنج ضرور ہوتا ہے۔ لیکن اگر مجھے یہ پتہ چلے کہ کسی نے معاشرتی احکام میں سے کسی حکم کی خلاف ورزی کی ہے تو اس سے مجھے نفرت ہو جاتی ہے۔ کیونکہ معاشرتی احکام کا تعلق حقوق العباد سے ہے، جن کے بارے میں یہ مسئلہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان میں کوتاہی کا ارتکاب کرلے تو یہ گناہ اس وقت تک معاف نہیں ہوتا، جب تک صاحبِ حق معاف نہ کرے، اس لئے معاشرتی احکام کی خلاف ورزی بڑا سنگین معاملہ ہے۔

مجھ سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے

بہرحال! معاشرتی احکام کا ایک بہت بڑا باب ہے، چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''آدابِ معاشرت'' کے نام سے ایک پورا رسالہ لکھا ہے، اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جو لوگ تربیت کے لئے تھانہ بھون جایا کرتے تھے، ان کے لئے معاشرت کے احکام پر پابندی کا بہت اہتمام ہوتا تھا، اسی لئے حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ اگر کسی کو صوفی بننا ہو تو کہیں اور چلا جائے، (صوفی سے مراد جس کو عرف عام میں ''صوفی'' کہتے ہیں) اور اگر کسی کو ''آدمی'' بننا ہو تو وہ یہاں آجائے، کیونکہ وہاں اس بات کو دیکھا جاتا تھا کہ اس کے نشست و برخاست کے انداز میں، اس کے ملنے جلنے کے طریقہ کار میں اسلامی احکام جھلک رہے ہیں یا نہیں؟ یا ان کی خلاف ورزی ہو رہی ہے؟ بہرحال! معاشرت دین کے احکام کا عظیم باب ہے۔ اب اگر معاشرت کے سارے احکام کا خلاصہ نکالنا چاہیں تو یہ حدیث:

((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ))[1]

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الإیمان، باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده، رقم: ۹، صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان تفاضل الإسلام وأی أموره أفضل، رقم: ۵۸، سنن الترمذی، کتاب الإیمان عنْ رسول الله، باب ما جاء فی أن المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده، رقم: ۲۵۵۱، سنن النسائی، کتاب الإیمان وشرائعه، باب صفة المسلم، رقم: ۴۹۱۰، سنن أبی داؤد، کتاب الجهاد، باب فی الهجرة هل انقطعت، رقم: ۲۱۲۲

اس کا خلاصہ ہے، یعنی تمہاری ذات سے دوسرے مسلمان کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ پہنچے، نہ جسمانی تکلیف پہنچے، نہ روحانی تکلیف پہنچے، نہ نفسیاتی تکلیف پہنچے، نہ ذہنی تکلیف پہنچے، وہ ہے مسلمان، اور اس کی ذات کسی بھی طرح سے دوسروں کے لئے تکلیف کا سبب نہ بنے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ نظر آئے گا کہ "معاشرت" کے سارے احکام اسی حدیث کے گرد گھومتے ہیں کہ آدمی اس کا اہتمام کرے کہ مجھ سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔

ہر کام کو اس معیار پر تولو

آدمی جو بھی کام کرے اس میں اس بات کا لحاظ کرے کہ میرے اس کام سے دوسرے کو تکلیف تو نہیں پہنچ رہی ہے؟ اگر اس کا لحاظ کرلیا تو سارے معاشرتی احکام کی پابندی ہوگئی، اور سارے حقوق العباد ادا ہوگئے، لیکن اس کا پتہ کیسے لگایا جائے کہ مجھ سے دوسرے کو تکلیف پہنچ رہی ہے یا نہیں؟ اس کا معیار یہ حدیث ہے:

((أَحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ))

دوسروں کے لئے وہی بات پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو۔ ہر چیز کو اس معیار پر تول کر دیکھو تو پتہ چلے گا کہ دوسرے کو تکلیف پہنچ رہی ہے یا نہیں؟ اگر دوسرے کو تکلیف پہنچ رہی ہے تو اس کام کو چھوڑ دو۔

کھانے کے بعد پان کھانا

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے یہاں تو اس قسم کا تصوف ہے، اگر مراقبے اور مجاہدے والا تصوف چاہتے ہو تو کہیں اور چلے جاؤ، ہمارے یہاں تو اسی کی تربیت دی جاتی ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کے لئے باعثِ تکلیف نہ بنے۔

میں نے یہ واقعہ آپ حضرات کو پہلے بھی سنایا تھا کہ میرے بھائی جناب محمد ذکی کیفی مرحوم، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔ جب یہ بچے تھے تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جایا کرتے تھے۔ حضرت والا بچوں سے بہت پیار کیا کرتے تھے، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہر سال رمضان تھانہ بھون میں بچوں کے ساتھ گزارتے تھے۔ بچے چونکہ قواعد و ضوابط سے مستثنیٰ ہوتے ہیں، اس لئے بڑے بڑے لوگ تو خانقاہ میں قیام کے دوران اس بات سے ڈرتے تھے کہ کوئی بات حضرت والا کے مزاج کے خلاف نہ ہو جائے، لیکن بچے آزادی سے حضرت والا کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ حضرت والا کا معمول یہ تھا کہ

کھانا کھانے کے بعد چونا کتھا اور چھالیہ کے بغیر پان کا پتہ چبالیا کرتے تھے، اس لئے کہ یہ پتہ ہاضم ہوتا ہے، اور نقصان سے خالی ہے۔ میرے بڑے بھائی جناب ذکی کیفی مرحوم کے ذمے یہ کام سپرد تھا کہ تم کھانے کے بعد گھر سے پان لایا کرو، اسی وجہ سے حضرت والا نے ان کا نام ''پانی'' رکھ دیا تھا۔

پڑھنے والے کو تکلیف نہ ہو

جب بھائی صاحب مرحوم نے لکھنا سیکھا تو حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ تم پہلا خط حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھو، چنانچہ والد صاحب نے ان سے خط لکھوا کر حضرت کی خدمت میں بھیجا۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا جو جواب دیا، اس میں علم کا ایک باب کھول دیا، جواب میں حضرت نے فرمایا:

> ''تمہارا خط ملا، بڑا دل خوش ہوا کہ تم نے لکھنا سیکھ لیا، اب تم اپنے خط کو اور زیادہ اچھا بنانے کی کوشش کرو، اور نیت یہ کرو کہ پڑھنے والے کو تکلیف نہ ہو، دیکھو میں تمہیں ابھی سے ''صوفی'' بنارہا ہوں''

جو بچہ ابھی لکھنا سیکھ رہا ہے، ظاہر ہے کہ وہ ٹیڑھا سیدھا لکھے گا، اس وقت اس بچے سے یہ فرمارہے ہیں کہ خط کو درست بناؤ، تاکہ پڑھنے والے کو تکلیف نہ ہو، اور ساتھ میں یہ بھی فرمادیا کہ دیکھو! میں تمہیں ابھی سے ''صوفی'' بنارہا ہوں۔ کوئی یہ پوچھے کہ خط درست ہونے سے صوفی کا کیا تعلق؟ اس لئے ہمارے دماغ میں تو یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ جو شخص جتنا بڑا بے ڈھنگا، اتنا بڑا صوفی، جو جتنا غلیظ اور میلا کچیلا، وہ اتنا ہی بڑا صوفی، اور جس کا کوئی کام ڈھنگ کا نہ ہو، وہ اتنا ہی بڑا صوفی۔

مخلوق کی خدمت کے بغیر تصوف حاصل نہیں ہوسکتا

اس جواب کے ذریعے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بتادیا کہ درحقیقت صوفی وہ ہے جو اپنے ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی رضا کی نیت کرے، اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ کے بندوں کو تکلیف سے بچایا جائے، اور اللہ کے بندوں کو راحت پہنچائی جائے، اس لئے حضرت نے فرمایا کہ دیکھو! میں تمہیں ابھی سے صوفی بنارہا ہوں۔

آجکل لوگوں نے خانقاہوں میں رہنے، ریاضتیں کرنے، مجاہدے کرنے، مراقبات، کشف و کرامات کا نام ''تصوف'' رکھ دیا ہے، لیکن حضرت والا نے حقیقت واضح فرمادی کہ اسکا نام ''تصوف'' نہیں

تسبیح و سجادہ و دلق نیست
طریقت بجز خدمتِ خلق نیست

یعنی محض تسبیح پڑھ لینے، اور مصلّے پر بیٹھ جانے اور گدڑی پہن لینے کا نام تصوف نہیں، بلکہ مخلوق کی خدمت کے بغیر تصوف حاصل نہیں ہوسکتا۔ بہر حال! اصل بات یہ ہے کہ اپنی ذات سے دوسرے کو ادنیٰ تکلیف بھی نہ پہنچے۔

اگر میرے ساتھ یہ معاملہ ہوتا تو!

اس کا معیار جناب رسول اللہ ﷺ نے یہ بتادیا کہ جب بھی کسی کے ساتھ معاملہ کرو تو اس کو اپنی جگہ پر کھڑا کرو، اور اپنے آپ کو اس کی جگہ پر کھڑا کرو، اور دیکھو کہ اگر میرے ساتھ یہ معاملہ ہوتا تو مجھ پر کیا گزرتی، میں اس سے خوش ہوتا یا ناخوش ہوتا، مجھے اس سے راحت ملتی یا تکلیف ہوتی، یہ سوچ لو، اب اگر تمہیں اس معاملے سے تکلیف ہوتی تو پھر تم وہ معاملہ دوسرے کے ساتھ نہ کرو۔ یہ جو ہم نے دو پیمانے بنالیے ہیں کہ اپنے لئے کچھ اور دوسرے کے لئے کچھ اور، اس کا راستہ حضورِ اقدس ﷺ نے اس حدیث کے ذریعے بند فرمادیا کہ بس! ایک پیمانہ ہونا چاہئے، اپنے لئے بھی وہی پیمانہ اور دوسرے کے لئے بھی وہی پیمانہ۔

فرائض کی پرواہ نہیں، حقوق کا مطالبہ پہلے

ایک شخص کہیں ملازم ہے، یا مزدور ہے، اس کو یہ حدیث تو خوب یاد رہتی ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ مزدور کو اس کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو، یہ حدیث تو خوب یاد رہتی ہے، لیکن اس کا خیال نہیں کہ پسینہ بھی نکلا یا نہیں؟ جس کام کے لئے اسے ملازم رکھا تھا، اس نے وہ کام صحیح طور پر انجام دیا یا نہیں؟ اس کی کوئی پرواہ اور فکر نہیں۔ آج کل مختلف انجمنیں قائم ہیں، پوری دنیا میں ایسی انجمنیں بنی ہوئی ہیں، مثلاً ''انجمن تحفظ حقوقِ مزدوراں''، ''تحفظ حقوقِ ملازمین''، تحفظ حقوقِ نسواں'' وغیرہ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر ایک اپنے حق کی وصولی کا مطالبہ کر رہا ہے کہ مجھے میرا حق ملنا چاہئے، اور میرے ذمے جو دوسرے کا حق ہے، اس کا کوئی خیال نہیں۔ جو ملازم ہے، وہ یہ کہہ رہا ہے کہ مجھے میری پوری مزدوری ملنی چاہئے، لیکن میرے ذمے جو آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی ہے، وہ پورا وقت ملازمت میں دیتا ہوں یا نہیں؟ یا اس میں ڈنڈی مار جاتا ہوں، اس کی طرف بالکل دھیان نہیں۔ دفتر میں تاخیر سے پہنچ رہے ہیں، اور تاخیر سے پہنچنے کے بعد بھی اپنے فرائضِ منصبی ادا نہیں کر رہے ہیں، ملازمت کے اوقات کے دوران اپنے ذاتی کاموں میں مصروف ہیں، یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ اس لئے کہ جو کچھ اپنے لئے پسند کیا، وہ دوسروں کے لئے پسند نہیں کر رہے ہیں۔ اپنے لئے کچھ اور معیار ہے، دوسروں کے لئے کچھ اور معیار ہے۔ اگر ان سے کہہ دیا جائے کہ چونکہ اس وقت تم نے وقت پورا

نہیں دیا، اس لئے تمہاری تنخواہ میں کٹوتی کی جائے گی تو اب اس کے خلاف لڑائی اور جھگڑا اور جلسے اور جلوس شروع ہو جائیں گے کہ ملازمین کے حقوق پامال کیے جا رہے ہیں۔

ملازمت میں یہ طریقہ کار ہو

یہ سب اس لئے ہو رہا ہے کہ اپنے لئے اور معیار ہے، اور دوسرے کے لئے اور معیار ہے۔ اپنے فرائض کی طرف تو نگاہ نہیں ہے، بس اپنے حقوق کی طرف نگاہ جارہی ہے۔ یہ صرف سرکاری ملازمین کے لئے نہیں، بلکہ جو حضرات علماء مدارس میں پڑھا رہے ہیں، یا مدارس میں ملازم ہیں، ان میں سے کسی اللہ کے بندے کے دل میں شاید ہی یہ خیال آتا ہوگا کہ میری یہ تنخواہ حلال ہو رہی ہے یا نہیں؟ ہمارے یہاں دار العلوم کراچی میں تو یہ قانون ہے کہ تمام اساتذہ اور ملازمین اپنی آمد روفت کا وقت لکھ دیتے ہیں۔ اگر درس میں زیادہ تاخیر ہو تو اس کی تنخواہ خود بخود وضع ہو جاتی ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں تھانہ بھون میں جو مدرسہ تھا، وہاں اگرچہ اس قسم کا نظام نہیں تھا، لیکن استاذ خود مہینے کے آخر میں ایک درخواست لکھتا کہ اس ماہ کے دوران مجھے اتنی تاخیر ہوئی تھی، یا میرے اتنے ناغے ہوئے ہیں، اس لئے اتنی تنخواہ میری تنخواہ سے وضع کر لی جائے۔ آج ہر شخص اپنے حقوق کے مطالبے کے نعرے لگا رہا ہے، لیکن کسی کو یہ خیال نہیں آتا کہ میں فرائضِ منصبی میں کتنی کوتاہی کر رہا ہوں۔

تنخواہ گھٹانے کی درخواست

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہٗ، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ دار العلوم دیوبند کے پہلے طالب علم تھے، پھر وہاں کے استاذ ہوئے، پھر شیخ الحدیث ہوئے۔ جب بخاری شریف پڑھاتے ہوئے ایک مدت گزر گئی تو مجلس شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا کہ حضرت کی تنخواہ بڑھانی چاہئے، ایک مدت سے آپ پڑھا رہے ہیں۔ اس وقت آپ کی تنخواہ دس روپے ماہوار تھی، لہٰذا آپ کی تنخواہ پندرہ روپے ماہوار کی جاتی ہے۔ جب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو اطلاع پہنچی تو آپ نے باقاعدہ ایک درخواست مجلس شوریٰ کے نام لکھی، اور اس میں لکھا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ مجلس شوریٰ نے میری تنخواہ بڑھا دی ہے، لیکن مجھے اس کا کوئی جواز نظر نہیں آتا، اس لئے کہ پہلے تو میرے قویٰ مضبوط تھے، وقت بھی زیادہ دیتا تھا، اب تو میرے قویٰ بھی کمزور ہو رہے ہیں، اور وقت بھی زیادہ نہیں دے پاتا، اس لئے اب میری تنخواہ بڑھانے کے بجائے گھٹائی جائے۔ تنخواہ بڑھانے کی درخواست تو آپ نے دیکھی ہوگی، لیکن وہاں تنخواہ گھٹانے کی درخواست دی جارہی ہے۔

دو پیمانے بنا رکھے ہیں

جن کے دل میں اللہ کا خوف ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کی فکر ہوتی ہے، جو یہ جانتے ہیں کہ حقوق کے مطالبے سے پہلے اپنے فرائض کی ادائیگی کا دھیان رکھنا ہے، ان کا یہ مزاج ہوتا ہے۔ آج دنیا میں جھگڑے اس لئے ہو رہے ہیں کہ میں نے دو پیمانے مقرر کر رکھے ہیں، اگر میں نے دوسرے کو ملازم رکھا ہوا ہے تو میں یہ چاہوں گا کہ کس طرح اس کی کھال کھینچ لوں، اور اُجرت کم سے کم دوں، اور اگر میں ملازم ہوں تو میں یہ چاہوں گا کہ اُجرت مجھے زیادہ سے زیادہ مل جائے، اور کام کم سے کم کروں، اس لئے یہ سارے جھگڑے ہو رہے ہیں۔ اگر نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد پر عمل ہو جائے کہ اگر تم ملازم ہو تو یہ سوچو کہ اگر دوسرا شخص میرا ملازم ہوتا تو میں اس سے کیا چاہتا، اور اگر تم نے کسی کو ملازم رکھا ہوا ہے تو یہ سوچو کہ اگر میں ملازم ہوتا تو میں اپنے آجر سے کیا چاہتا، وہ ادا کرو۔

میاں بیوی کا باہمی تعلق

اسی طرح میاں بیوی کے جھگڑے ہیں، اس میں زیادہ دخل اس بات کا ہے کہ وہاں پر بھی دو پیمانے ہیں، وہاں پر اس حدیث پر عمل ضروری ہے کہ ان کے لئے بھی وہی پسند کرو، جو اپنے لئے پسند کرتے ہو، یعنی اگر تم شوہر ہو تو تم یہ دیکھو کہ میں اپنی بیوی سے کس قسم کے سلوک کی توقع رکھتا ہوں، اور اس کی کس بات سے مجھے تکلیف پہنچتی ہے؟ اور اس کی کس بات سے مجھے راحت پہنچتی ہے؟ پھر تم بھی اپنی بیوی کے ساتھ ایسا سلوک کرو، جو اس کو راحت پہنچانے والا ہو، تکلیف پہنچانے والا نہ ہو۔ اگر تم بیوی ہو تو تم یہ دیکھو کہ مجھے اپنے شوہر کی کس بات سے اور کس سلوک سے تکلیف پہنچتی ہے؟ اور کس بات سے اور کس سلوک سے راحت پہنچتی ہے؟ پھر بیوی اپنے شوہر کے ساتھ ایسا سلوک کرے جو اس کو راحت پہنچانے والا ہو۔

ساس بہو کے جھگڑے کی وجہ

ساس بہو کے جھگڑوں سے ہمارا پورا معاشرہ بھرا ہوا ہے، بیشمار گھرانے اس فساد کا شکار ہیں، یہ سب کیوں ہے؟ اس لئے کہ اس حدیث پر عمل نہیں ہو رہا ہے۔ جب تک ساس صاحبہ بہو تھیں، اس وقت تک وہ اپنی ساس سے کیسے سلوک کی توقع رکھتی تھیں، اور جب خود ساس بن گئیں ہیں تو اب اپنی بہو کے ساتھ کیسا معاملہ کر رہی ہیں، یہ دو پیمانے الگ الگ بنائے ہوئے ہیں کہ اپنے لئے پیمانہ اور ہے، اور دوسرے کے لئے پیمانہ اور ہے۔ اگر ایک پیمانہ ہو جائے تو یہ سارے جھگڑے ختم ہو جائیں۔

اس طریقے کو ختم کرو

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ○ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ○ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَو وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ﴾[1]

فرمایا کہ افسوس ہے ان لوگوں پر کہ جب اپنا حق لینے کا موقع آئے تو پورا پورا لیں، کوئی کسر نہ چھوڑیں، اور جب دوسرے کو دینے کا وقت آئے تو اس میں ڈنڈی مار جائیں۔ بہرحال نبی کریم ﷺ نے اس حدیث کے ذریعے ایسا معیار بیان فرمادیا کہ جس کے ذریعے ہم اپنے معاشرتی طرزِ عمل کا جائزہ لے سکتے ہیں کہ ہم سے کہاں غلطی ہو رہی ہے؟ بس جہاں غلطی ہو رہی ہے اس کو درست کرلو تو اللہ تعالیٰ اس کی برکات ایسی عطا فرمائیں گے کہ ہمارے دین و دنیا سنور جائیں گے۔

میری مخلوق سے محبت کرو

میرے شیخ حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے، تو میری مخلوق سے محبت کرو۔ تم مجھ سے کیا محبت کرو گے، کیونکہ تم نے نہ مجھے دیکھا ہے، نہ تمہارے اندر دیکھنے کی طاقت ہے، اس لئے تم مجھ سے کیا محبت کرو گے؟ میری محبت کا عنوان یہ ہے میری مخلوق سے محبت کرو، میرے بندوں سے محبت کرو۔

حضرت والا کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنی محبت کسی کے دل میں ڈالتے ہیں تو پھر اس کا معاملہ یہ ہو جاتا ہے کہ ہر مخلوقِ خدا سے اس کو محبت ہوتی ہے، اس کے دل میں کسی کے خلاف کینہ نہیں ہوتا، اس کے دل میں کسی کے خلاف بغض نہیں ہوتا، جیسے کسی نے کہا کہ۔

کفر است در طریقتِ ما کینہ داشتن
آئینِ ما ست سینہ چوں آئینہ داشتن

اب کسی کے خلاف نہ تو غصہ ہے، نہ کینہ ہے، نہ بغض ہے، نہ عداوت ہے، بلکہ ہر حال میں دوسرے کے حق میں خیر خواہی ہے۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا واقعہ

چنانچہ اپنے بزرگوں کو ہم نے ایسا پایا کہ ان سے تعلق رکھنے والے جتنے لوگ ہوتے تھے، ان

---

(۱) المطففین: ۱ - ۳

میں سے ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ ان بزرگ کو مجھ سے سب سے زیادہ محبت ہے، اور یہ درحقیقت نبی کریم ﷺ کی سنت چلی آرہی ہے، ہر صحابی یہ سمجھتا تھا کہ حضور ﷺ کو مجھ سے زیادہ محبت ہے، یہاں تک کہ اس کو یہ خیال ہوتا تھا کہ سب سے محبوب ہی میں ہوں۔ چنانچہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ جو بہت بعد میں مسلمان ہوئے، ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید میں حضور ﷺ کی نظر میں سب سے زیادہ محبوب ہوں، اب سابقین اولین میں حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما تھے، لیکن حضور ﷺ کی شفقت و محبت کا انداز دیکھ کر دل میں یہ خیال آیا کہ شاید میں زیادہ محبوب ہوں۔ اب حضورِ اقدس ﷺ سے پوچھ بیٹھے "یا رسول اللہ! آپ کو مجھ سے زیادہ محبت ہے یا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے زیادہ محبت ہے؟" حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا "ابوبکر سے"

اس وقت راز کھلا کہ ان کے مقابلے میں ابوبکر سے زیادہ محبت ہے۔ اب دل میں خیال آیا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تو بہت اونچی شخصیت ہیں، ان سے تو آپ کو بہت محبت ہوگی، اب دوسرے نمبر پر میں زیادہ محبوب ہوں گا، لہٰذا پھر سوال کر لیا "یا رسول اللہ! مجھ سے زیادہ محبت ہے یا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے زیادہ محبت ہے؟" حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا "عمر سے"

فرماتے ہیں کہ اب مزید سوال کرنے سے میں ڈر گیا کہ اب مزید سوال کروں گا تو پتہ نہیں کون سے نمبر پر جاؤں گا۔ بہرحال! ان کے دل میں خیال اس لئے آیا کہ حضورِ اقدس ﷺ کا طرزِ عمل ہر ایک صحابی کے ساتھ ایسا تھا کہ ہر ایک یہ سمجھتا تھا کہ حضور ﷺ کو مجھ سے زیادہ محبت ہے۔

حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ کا ہر ایک کے لئے دعا کرنا

ہم نے اپنے بزرگوں میں بھی یہی طرزِ عمل دیکھا، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو، حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ کو، حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ جتنے متعلقین ہیں، ہر ایک یہ سمجھتا تھا کہ حضرت کو مجھ سے زیادہ محبت ہے۔ ایسا کیوں تھا؟ اس لئے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت دل میں ڈال دی تو اپنی مخلوق کی ایسی محبت دل میں ڈال دی کہ ہر ایک کی خیر خواہی، ہر ایک سے محبت، ہر ایک کا خیال۔ حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ حال تھا کہ جب کبھی کسی ملنے جلنے والے سے ملاقات ہو جاتی تو فرماتے، ارے بھائی! ہم تمہارے لئے بہت دعا کرتے ہیں، اور روزانہ دعا کرتے ہیں۔ اب اگر تو یہ کریں تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ جب عمومی طور پر تمام مسلمانوں کے لئے دعا کرتے ہوں گے تو تم بھی ان کے اندر داخل ہو جاتے ہوگے۔ لیکن حضرت والا کی یہ مراد نہیں تھی کہ عمومی طور پر اس طرح دعا کرتا ہوں، بلکہ واقعۃً خصوصی طور پر نام لے کر ہر ایک کے لئے دعا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے پوچھ لیا کہ حضرت! آپ روزانہ ہر ایک کے لئے کس طرح دعا کرتے ہیں؟

حضرت ﷺ نے فرمایا "میں نے پانچ نمازوں کو تقسیم کر رکھا ہے، مثلاً فجر کی نماز کے لئے یہ طے کر رکھا ہے کہ اپنے جو بڑے ہیں، جیسے والدین، اساتذہ، مشائخ، ان سب کے لئے فجر کی نماز کے بعد دعا کروں گا، ظہر کی نماز کے لئے یہ طے کر رکھا ہے کہ اپنے برابر کے دوست و احباب ہیں، ہم سبق ہیں، ان کے لئے دعا کروں گا، اور عصر کی نماز کے بعد اپنے سے چھوٹوں کے لئے اور اپنے متعلقین کے لئے دعا کروں گا، مغرب کے بعد اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے لئے دعا کروں گا، اس طرح میں نے پانچ نمازوں کو اپنے ملنے جلنے والوں اور اہلِ خانہ کے لئے بانٹ رکھا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اپنے اپنے وقت پر ہر ایک کے لئے دعا ہو جاتی ہے"

الحمدللہ، یہ دعائیں کیوں ہو رہی ہیں؟ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کی بدولت اپنی مخلوق کی محبت دل میں ڈال دی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کے دل میں بھی یہ محبت پیدا فرما دے۔

بہر حال! یہ چوتھی نصیحت تھی جو حضورِ اقدس ﷺ نے فرمائی کہ دوسروں کے لئے بھی وہی پسند کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس نصیحت پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

پانچویں نصیحت

پانچویں نصیحت حضورِ اقدس ﷺ نے یہ فرمائی:

((لا تكثر الضحك، فإن كثرة الضحك تميت القلب))(۱)

"بہت زیادہ ہنسا مت کرو، اس لئے کہ کثرت سے ہنسا دل کی موت کا باعث ہوتا ہے، اس سے انسان کا دل مر جاتا ہے"

یہاں ہنسنے سے قہقہہ مار کر ہنسا مراد ہے۔ حضورِ اقدس ﷺ کی سنتوں میں یہ ہے کہ آپ قہقہہ مار کر نہیں ہنستے تھے، زیادہ تر تو تبسم فرماتے تھے، مسکراتے تھے، بعض روایتوں میں آتا ہے کہ بعض اوقات ہنسنے کے دوران آپ کا منہ کھل جاتا تھا، اور داڑھیں ظاہر ہو جاتی تھیں، لیکن قہقہہ مار کر ہنسنا کہیں ثابت نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی ہر وقت ہنسنے ہنسانے میں لگا رہے، اور مسخرہ بن جائے تو یہ پسندیدہ نہیں، البتہ حدود کے اندر رہتے ہوئے ہنسی مذاق بھی جائز ہے، اور حضورِ اقدس ﷺ نے ایسا مذاق کیا ہے۔ بہر حال! یہ اس حدیث کا حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اور اپنی رحمت سے ہمیں ان پانچوں نصیحتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

---

(۱) سنن الترمذي، كتاب الزهد عن رسول الله، باب من اتقى المحارم فهو أعبد الناس، رقم: ۲۲۲۷، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب الورع والتقوى، رقم: ٤٢٠٧، مسند أحمد، رقم: ۷۷٤۸۔

پڑوسی ☆

ابوحمزہ سکری رحمۃ اللہ علیہ حدیث کے ایک راوی گزرے ہیں۔ ''سُکّر'' عربی زبان میں چینی کو کہتے ہیں، اور ان کے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ انہیں ''سُکّری'' اس لئے کہا جاتا تھا کہ ان کی باتیں ان کا لہجہ اور ان کا اندازِ گفتگو بڑا دلکش اور شیریں تھا۔ جب وہ بات کرتے تو سننے والا اُن کی باتوں میں محو ہو جاتا تھا۔ وہ بغداد شہر کے ایک محلے میں رہتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد انہوں نے اپنا مکان بیچ کر کسی دوسرے محلے میں منتقل ہونے کا ارادہ کیا۔ خریدار سے معاملہ بھی تقریباً طے ہوگیا۔ اتنے میں ان کے پڑوسیوں اور محلّہ داروں کو پتہ چلا کہ وہ اس محلے سے منتقل ہو کر کہیں اور بسنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ چنانچہ محلّہ والوں کا ایک وفد ان کے پاس آیا، اور ان کی منت سماجت کی کہ وہ یہ محلّہ نہ چھوڑیں۔ جب ابوحمزہ سکری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا عذر بیان کیا تو تمام محلّہ والوں نے متفقہ طور پر انہیں یہ پیشکش کی کہ آپ کے مکان کی جو قیمت لگی ہے، ہم وہ قیمت آپ کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کرنے کو تیار ہیں، لیکن آپ ہمیں اپنے پڑوس سے محروم نہ کیجئے۔ جب انہوں نے محلّہ والوں کا یہ خلوص دیکھا تو منتقل ہونے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

ابوحمزہ سکری رحمۃ اللہ علیہ کی مقبولیت کی ایک وجہ ان کی سحر انگیز شخصیت بھی ہوگی، لیکن بڑی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے پڑوسی کے حقوق کے بارے میں اسلامی تعلیمات پر عمل کر کے ایک مثال قائم کی تھی۔ قرآن کریم نے پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک کی بار بار تاکید فرمائی ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بہت سے ارشادات میں پڑوسی کے حقوق کی تفصیلات بیان فرمائی ہیں، یہاں تک کہ ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرے پاس جبرئیل امین علیہ السلام آئے، اور مجھے پڑوسی کے حقوق کی اتنی تاکید کرتے رہے کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ شاید وہ پڑوسی کو ترکے میں وارث بھی قرار دیدیں گے۔ (۱)

☆ ذکر وفکر: ۲۵۵۔۲۵۹

(۱) صحيح البخارى، كتاب الأدب، باب الوصاة بالجار، رقم: ٥٥٥٥، صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب الوصية بالجار والإحسان اليه، رقم: ٤٧٥٦، سنن الترمذى، كتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ما جاء فى حق الجوار، رقم: ١٨٦٥، سنن أبى داؤد، كتاب الأدب، باب فى حق الجوار، رقم: ٤٤٨٤۔

قرآن و سنت کی ان تعلیمات کے سائے میں جو معاشرہ پروان چڑھا، اس میں پڑوسی کی حیثیت ایک قریبی رشتہ دار سے کم نہ تھی، ایک ساتھ رہنے والے نہ صرف ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک تھے، بلکہ ایک دوسرے کے لئے ایثار و قربانی کر کے خوشی محسوس کرتے تھے۔

۱۹۶۳ء میں جب میں سعودی عرب گیا تو وہاں کے ایک باشندے نے مجھے اپنا واقعہ خود سنایا کہ ایک مرتبہ میں کپڑا خریدنے کے لئے بازار گیا۔ ایک دکان میں داخل ہو کر بہت سے کپڑے دیکھے۔ دکاندار پوری خوش اخلاقی سے مجھے مختلف کپڑے دکھاتا رہا۔ بالآخر میں نے ایک کپڑا پسند کر لیا۔ دکاندار نے مجھے قیمت بتادی۔ میں نے دکاندار سے کہا کہ "مجھے یہ کپڑا اتنے گز کاٹ کر دیدو"۔ اس پر دکاندار ایک لمحے کے لئے رکا، اور اس نے مجھ سے کہا، آپ کو یہ کپڑا پسند ہے؟ میں نے کہا: جی ہاں۔ کہنے لگا: قیمت بھی آپ کی رائے میں مناسب ہے؟ میں نے کہا: جی ہاں۔ اس پر اس نے کہا کہ اب آپ میرے برابر والی دکان پر چلے جائیے، اور وہاں سے یہ کپڑا اسی قیمت پر لے لیجئے۔ میں بڑا حیران ہوا اور میں نے اس سے کہا کہ میں اس دکان پر کیوں جاؤں؟ میرا معاملہ تو آپ سے ہوا ہے۔ کہنے لگا: آپ کو اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں، آپ کو جو کپڑا چاہئے، وہ وہاں موجود ہے، اور آپ کو اسی قیمت میں مل جائے گا، جا کر وہاں سے لے لیجئے۔ میں نے کہا کہ پہلے مجھے وجہ بتائیے، کیا وہ آپ ہی کی دکان ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ اب میں بھی اڑ گیا، اور میں نے اصرار کیا کہ جب تک آپ مجھے وجہ نہیں بتائیں گے میں اس دکان پر نہیں جاؤں گا۔ آخر کار اس نے زچ ہو کر کہا کہ آپ خواہ مخواہ بات لمبی کر رہے ہیں، بات صرف اتنی ہے کہ میرے پاس صبح سے اب تک بہت سے گاہک آچکے ہیں، اور میری اتنی بکری ہو چکی ہے کہ میرے لئے آج کے دن کے حساب سے کافی ہو سکتی ہے، لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ میرا پڑوسی دکاندار صبح سے خالی بیٹھا ہے، اس کے پاس کوئی گاہک نہیں آیا، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس کی بھی کچھ بکری ہو جائے، آپ کے وہاں جانے سے اس کا بھلا ہو جائے گا، آپ کا اس میں کیا حرج ہے؟

یہ اس اسلامی معاشرے کی ایک بچی کھچی جھلک تھی جس میں مسرت اور کامیابی محض پیسوں کی گنتی کا نام نہیں تھا، بلکہ روح کے اس سکون اور قلب و ضمیر کے اس اطمینان کا نام تھا جو اپنے کسی بھائی بہن کا دکھ دور کر کے یا اس کے چہرے پر مسکراہٹ لا کر حاصل ہوتا ہے۔ جب قرآن کریم نے انصارِ مدینہ کی تعریف کرتے ہوئے یہ فرمایا تھا کہ چاہے وہ خود مفلسی کا شکار ہوں، مگر دوسروں کے ساتھ ایثار کا معاملہ کر کے انہیں اپنے اُوپر ترجیح دیتے ہیں، تو درحقیقت ان کی اسی صفت کی مثال دے کر مسلمانوں کو ان کی پیروی کی ترغیب دی تھی۔ یوں تو ایثار کا یہ معاملہ ہر شخص کے ساتھ قابلِ تعریف ہے، لیکن خاص طور پر پڑوسی اس کا زیادہ حقدار ہے اسی لئے قرآن و سنت نے اس کی زیادہ ترغیب دی ہے۔

جدید شہری زندگی نے جہاں ہماری بہت سی قدریں بدل ڈالی ہیں وہاں پڑوس کی اہمیت کا تصور بھی بری طرح دھندلا دیا ہے۔ اول تو کوٹھی بنگلوں کے مکین پڑوس کا مفہوم ہی بھولتے جارہے ہیں، بعض دفعہ مدتوں پاس پاس رہنے کے باوجود وہ ایک دوسرے سے ناواقف رہتے ہیں، اور اگر کہیں پڑوس کی اہمیت کا تصور موجود ہے تو عام طور سے اسے انہی پڑوسیوں کے ساتھ مخصوص کردیا گیا ہے جو رتبے یا معاشی حالت کے اعتبار سے اپنے برابر یا قریب قریب ہوں، چنانچہ کوٹھی بنگلے میں رہنے والا کسی دوسری کوٹھی کے مکین ہی کو اپنا پڑوسی سمجھتا ہے، اور اگر اس کے پاس کچھ لوگ جھونپڑیوں یا معمولی مکانات میں رہ رہے ہوں تو انہیں عام طور سے نہ پڑوسی سمجھا جاتا ہے، نہ پڑوسی جیسے حقوق دیئے جاتے ہیں۔ ایسا بہت کم دیکھا گیا ہے کہ کسی عالی شان بنگلے میں رہنے والا اپنے قریب کسی جھونپڑی والے کی خبر گیری، اس کی بیمار پرسی یا محض ملاقات کے لئے جاتا ہو، حالانکہ ایسے پڑوسی ایثار و محبت کے زیادہ مستحق ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ علمی اور دینی اعتبار سے تو بلند مقام کے حامل تھے ہی، اپنی خاندانی وجاہت کے اعتبار سے بھی ممتاز تھے، لیکن ان کا روزانہ معمول یہ تھا کہ وہ اپنے فرائض کی ادائیگی کے لئے دارالعلوم جانے سے پہلے اپنے قریب معمولی مکانات میں بسنے والی بیواؤں اور بے سہارا خواتین کے پاس جاتے، ہر ایک سے پوچھتے کہ انہیں بازار سے کیا سودا سلف منگانا ہے؟ اور بہت سی خواتین کے بتائے ہوئے سودے کی ایک فہرست لے کر خود بازار جاتے، ہر خاتون کا سودا خریدتے، اور ہر ایک کو پہنچاتے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ کوئی خاتون کہتی: مفتی صاحب! آپ یہ چیز غلط لے آئے، میں نے تو فلاں چیز منگائی تھی، یا اتنی تعداد میں منگائی تھی۔ مفتی صاحب خندہ پیشانی سے فرماتے: معاف کرنا بی بی مجھ سے غلطی ہوگئی، میں ابھی بدل کر وہ چیز لے آتا ہوں۔ اور اس طرح وہ نہ جانے کتنے ٹوٹے دلوں کی دعائیں سمیٹ کر اور ان کی خدمت کے سرور سے دل آباد کر کے اپنے دن کی مصروفیات کا آغاز کرتے تھے۔ آج تقریباً ہر شخص اسبابِ راحت کی فراوانی کے باوجود ایک انجانی سی بے چینی اور دل کی ایک بے نام سی کسک میں مبتلا ہے، اور بقول جناب نظر امروہوی۔

کوئی الجھن نہیں، لیکن کسی الجھن میں رہتا ہے
عجب دھڑکا سا ہر دم دل کی ہر دھڑکن میں رہتا ہے

اس انجانی بے چینی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے روپے پیسے کی گنتی ہی کو زندگی کا مقصد سمجھ لیا ہے، اور مال و دولت کی دوڑ سے آگے کچھ سوچنے کے لئے تیار نہیں، چنانچہ ہم روح کے اس اطمینان اور دل کے اس سرور سے محروم ہوتے جارہے ہیں جو اپنے کسی بھائی بہن کی خدمت کر کے اور

اس کے لئے کوئی قربانی دے کر حاصل ہوتا ہے، جو زندگی کو اپنے خالق و مالک کے تابع فرمان بنانے اور اس کے حکم کے آگے اپنی ناجائز خواہشات کو کچلنے کا نقد انعام ہوتا ہے۔ قلبی سکون کا یہ نقد انعام بسا اوقات کچے مکان اور دال روٹی کی معمولی معیشت میں بھی حاصل ہو جاتا ہے، اور اگر اس کی شرائط پوری نہ ہوں تو عالی شان کوٹھیوں اور چمکدار کاروں میں بھی حاصل نہیں ہوتا۔ اس صورت میں کوٹھی بنگلوں کی چمک دمک دل میں چھپی ہوئی بے چینیوں کا علاج نہیں کر سکتی۔

کوئی شک نہیں کہ آج کی شہری زندگی بہت مصروف ہوگئی ہے، لیکن یہ مصروفیت زیادہ تر روپے پیسے کی گنتی بڑھانے ہی کے لئے ہے، لہٰذا اگر سکونِ قلب بھی کوئی حقیقی نعمت ہے جسے حاصل کرنے کی فکر کی جائے تو انہی مصروفیتوں میں تھوڑا سا وقت اس کام کے لئے بھی نکالنا پڑے گا جس میں اپنے آس پاس بسنے والوں کی زندگی میں جھانک کر دیکھا جا سکے، اور ان کے دکھ دور کرنے کی کوئی امکانی سبیل تلاش کی جا سکے۔ چوبیس گھنٹے کی مصروفیات میں سے نکالے ہوئے یہ چند لمحات جو اس کام میں خرچ ہوں گے، انشاء اللہ وہ کام کر جائیں گے جو دن بھر کی بھاگ دوڑ سے حاصل ہونے والی روپے کی ریل پیل انجام نہیں دے سکتی۔

۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۶ھ
یکم اکتوبر ۱۹۹۵ء

پڑوسیوں کے حقوق ادا کیجئے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

"أَمَّا بَعْدُ!

فَقَدْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:((وَاَحْسِنْ إِلٰى جَارِكَ تَكُنْ مُسْلِمًا))(۱)

گزشتہ چار دن سے ایک حدیث کا بیان چل رہا ہے، جس میں نبی کریم سرورِ دو عالم ﷺ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو پانچ نصیحتیں فرمائیں، اور ساتھ میں یہ ہدایت فرمائی کہ یہ باتیں خود بھی یاد رکھنا، اور ان کو دوسروں تک بھی پہنچانا، خود بھی عمل کرنا، اور دوسروں کو بھی اس پر عمل کرنے کی ترغیب دینا۔ یہ پانچ نصیحتیں پانچ جملوں پر مشتمل ہیں۔ پہلا جملہ یہ تھا:

((إِتَّقِ الْمَحَارِمَ تَكُنْ أَعْبَدَ النَّاسِ))

"حرام چیزوں سے، ناجائز چیزوں سے اور گناہوں سے بچو، تو تم تمام لوگوں میں سب سے زیادہ عبادت گزار بن جاؤ گے"

دوسرا جملہ یہ تھا:

((وَارْضَ بِمَا قَسَمَ اللّٰهُ لَكَ تَكُنْ أَغْنَى النَّاسِ))

"اللہ جل شانہ نے تمہیں جو کچھ دیدیا ہے، اس پر راضی ہو جاؤ، تو تم تمام انسانوں میں سب سے زیادہ غنی ہو جاؤ گے"

ان دونوں جملوں کا بیان گذشتہ تین دنوں میں ہو گیا۔

پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ سلوک

تیسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا:

☆ اصلاحی خطبات (۱۶/۱۴۴-۱۶۴)، بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول الله، باب من اتقى المحارم فهو أعبد الناس، رقم: ۲۲۲۷، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب الورع والتقوى، رقم: ۴۲۰۷، مسند أحمد، رقم: ۷۷۴۸

((وَأَحْسِنْ إِلَى جَارِكَ تَكُنْ مُسْلِمًا))

''اپنے پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرو، تو تم مسلمان بن جاؤ گے''

اس جملے کے ذریعے حضورِ اقدس ﷺ نے بتادیا کہ گویا کہ مسلمان کی علامت یہ ہے کہ وہ اپنے پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے، اور اگر کوئی شخص مسلمان ہونے کا دعویدار تو ہو، لیکن اپنے پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک نہ کرے تو حقیقت میں وہ مسلمان نہیں، اس لئے آپ نے فرمایا کہ اپنے پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کرو، تو مسلمان بن جاؤ گے۔ اس جملے میں اس قدر وزنی الفاظ میں نبی کریم ﷺ نے پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید فرمائی، اور قرآن وحدیث پڑوسی کے حقوق اور پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید سے بھرے ہوئے ہیں۔

جبرئیل علیہ السلام کا مسلسل تاکید کرنا

ایک اور حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جبرئیل علیہ السلام آکر مجھے مسلسل پڑوسیوں کے حقوق کے بارے میں تاکید کرتے رہے، کرتے رہے، کرتے رہے، یہاں تک کہ مجھے یہ گمان ہوا کہ شاید کوئی حکم ایسا آنے والا ہے کہ پڑوسی بھی وارثوں میں شمار ہو جائے گا۔(۱)

یعنی جس طرح کسی کے مرنے پر اس کی میراث عزیز و اقارب اور رشتہ داروں میں تقسیم ہوتی ہے، شاید کوئی حکم ایسا آنے والا ہے کہ اب پڑوسی کو بھی میراث میں سے حصہ دیا جائے گا۔

پڑوسیوں کی تین قسمیں

قرآن کریم نے پڑوسیوں کی تین قسمیں بیان فرمائی ہیں، ایک "الجار ذی القربی"، دوسرے "الجار الجنب"، تیسرے "صاحب بالجنب"(۲) اور تینوں کے حقوق ادا کرنے اور تینوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی تاکید فرمائی۔ پہلی قسم ہے "الجاری ذی القربی" یعنی وہ پڑوسی

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب الوصیة بالجار، رقم: ٥٥٥٥، صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب الوصیة بالجار والإحسان إلیه، رقم: ٤٧٥٦، سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول الله صلی الله علیه وسلم، باب ماجاء فی حق الجوار، رقم: ١٨٦٥، سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب فی حق الجوار، رقم: ٤٤٨٤، سنن ابن ماجه، کتاب الأدب، باب حق الجوار، رقم: ٣٦٦٣، مسند أحمد، رقم: ٥٣٢٠

(۲) النساء: ٣٦

جس کے گھر کی دیوار آپ کے گھر کی دیوار سے ملی ہوئی ہو، دوسری قسم "الجار الجنب" یعنی وہ پڑوسی جس کی دیوار تو نہیں ملی ہوئی ہے، تھوڑا سا فاصلہ ہے، لیکن وہ بھی بالکل قریب ہے۔ دونوں الفاظ علیحدہ لاکر قرآن کریم نے یہ بتادیا کہ یہ مت سمجھنا کہ بس تمہارا پڑوسی وہی ہے جس کی دیوار سے دیوار ملی ہوئی ہے، بلکہ اگر تھوڑا فاصلہ ہو، لیکن تقریباً ایک ہی جگہ پر رہنے والے ہیں، صرف راستے اور دیواریں الگ ہیں تو وہ بھی تمہارا پڑوسی ہے، اس کا بھی خیال رکھو۔

تھوڑی دیر کا ساتھی

پڑوسی کی تیسری قسم یہ بیان فرمائی کہ "الصاحب بالجنب"، میں اس کا ترجمہ یہ کرتا ہوں "تھوڑی دیر کا ساتھی"، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کسی سواری میں مثلاً بس میں سفر کررہے ہیں، اب برابر والی سیٹ پر کوئی آدمی آکر بیٹھ گیا، وہ "صاحب بالجنب" کہلائے گا، یا آپ ریل گاڑی میں یا ہوائی جہاز میں سفر کررہے ہیں، برابر والی سیٹ پر دوسرا آدمی بیٹھا ہے، وہ "صاحب بالجنب" ہے، حالانکہ وہ شخص اجنبی ہے، اس سے پہلے کبھی اس کو نہیں دیکھا، نہ اس سے ملاقات ہوئی، اور نہ آئندہ ملاقات ہونے کی اُمید ہے، لیکن چونکہ وہ تھوڑی دیر کے لئے ہمارے ساتھ ہوگیا ہے، قرآن کریم نے فرمایا کہ اس کا بھی حق ہے، اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ یا آپ کہیں لائن میں لگے ہوئے ہیں، اس قطار میں آپ سے آگے ایک آدمی کھڑا ہے، آپ کے پیچھے ایک آدمی کھڑا ہے، یہ دونوں آپ کے "صاحب بالجنب" ہیں، اس کے بھی حقوق ہیں، اس کے ساتھ بھی حسن سلوک کا حکم ہے۔

اللہ کو وہ بندہ بڑا پسند ہے

قرآن کریم نے پڑوسیوں کی یہ تینوں قسمیں الگ الگ کرکے اس لئے بیان فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ کو وہ بندہ بڑا پسند ہے جو اپنے ساتھ رہنے والوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا ہو۔ اتنی بات تو ہر مسلمان جانتا اور مانتا ہے کہ پڑسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہئے، لیکن عملاً چند غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، جن کو دور کرنا ضروری ہے، اس لئے کہ عمل کے وقت نفس و شیطان انسان کو مختلف تاویلیں سمجھا دیتا ہے، اور ساتھ میں دل میں کچھ غلط فہمیاں پیدا کردیتا ہے، جس کے نتیجے میں اس حکم پر عمل کرنے سے محرومی ہوجاتی ہے۔

یہ نئی تہذیب ہے

جب تک مکانات تسلسل کے ساتھ ہوا کرتے تھے، اس وقت لوگ اپنے پڑوسیوں کا لحاظ

رکھتے تھے، اس کے ساتھ تعلقات ہوتے تھے، بعض اوقات خون کے رشتوں سے زیادہ قوی تعلق پڑوسیوں کے ساتھ ہو جاتا تھا۔ لیکن جب سے یہ کوٹھی، بنگلے بننے شروع ہوئے تو اس کے نتیجے میں یہ ہو رہا ہے کہ بسا اوقات رہتے رہتے سالہا سال گزر جاتے ہیں، لیکن یہ پتہ نہیں ہوتا کہ پڑوس میں کون رہ رہا ہے۔ اس نئی تہذیب نے پڑوسی ہونے کا مسئلہ ہی ختم کر دیا۔ ہم لوگ برنس روڈ پر ایک فلیٹ میں رہا کرتے تھے، اور جس دن اس فلیٹ میں جا کر آباد ہوئے تو آس پاس کے لوگ ملنے کے لئے آگئے، اور آپس میں ایسے تعلقات ہو گئے جیسے عزیزوں اور رشتہ داروں کے درمیان ہوتے ہیں۔ وہاں پانچ سال رہنے کے بعد لسبیلہ ہاؤس میں منتقل ہوئے تو وہاں پر ایک پلاٹ پر والد صاحب نے مکان بنوایا تھا، اس مکان کی چار دیواری تھی، اور چاروں طرف کوٹھی بنگلے والے تھے۔ اب ہفتوں گزر گئے، لیکن یہ پتہ نہیں چلا کہ داہنی طرف کے مکان میں کون رہتا ہے، بائیں طرف کے مکان میں کون رہتا ہے، آگے کون ہے، پیچھے کون ہے؟ نہ کسی سے ملاقات ہے، تو ایک دن والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بڑا اہتمام کر کے برابر والوں کے پاس جا کر ملاقات کی، تاکہ تعلقات قائم ہو جائیں۔ پھر فرمانے لگے کہ دیکھو! جب ہم فلیٹ میں رہنے گئے تھے تو سارے محلے کے لوگ ملاقات کے لئے جمع ہو گئے، اور انہوں نے ہمارا استقبال کیا، اور تعلق اور محبت کا اظہار کیا، اور یہاں یہ صورتِ حال ہے، علاقوں کے درمیان یہ فرق ہے۔ بہر حال کوٹھی بنگلوں میں یہی ہوتا ہے کہ سالہا سال رہنے کے باوجود پتہ نہیں چلتا کہ ہمارے پڑوس میں کون رہتا ہے۔

آگ لگنے کا واقعہ

میں ایک مرتبہ اسلام آباد میں ایک ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا ہوا تھا، وہ ایک بنگلہ تھا، رات کے تین بجے اس میں آگ لگ گئی، اور اللہ تعالیٰ نے خاص فضل فرمایا، اور ہم لوگوں کی جان بچالی۔ فائر بریگیڈ والے آئے، اور انہوں نے آگ بجھائی، لیکن میں نے دیکھا کہ صبح آٹھ نو بجے تک کاروائی ہوتی رہی، لیکن برابر کے بنگلے والوں کو کوئی خبر نہیں تھی، کسی کو کوئی توفیق نہیں ہوئی کہ یہاں ہمارے پڑوس میں آگ لگ گئی تھی تو پتہ کریں کہ ان کا کیا حال ہے، کوئی مرا، کوئی زخمی ہوا۔ ان کو آنے کی فرصت ہی نہیں تھی، کیونکہ جو مصیبت آئی وہ دوسروں پر آئی، ہمارے اُوپر نہیں آئی۔ آج ہمارے معاشرے میں یہ صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے کہ پڑوس کے ساتھ تعلقات اور حسنِ سلوک کی فضیلت جو قرآن و حدیث میں بیان فرمائی تھی، وہ ختم ہو چکی، اب تو نفسا نفسی کا عالم ہے، بس میں ہوں، میرا گھر ہے، میرا مکان ہے، میری فیملی ہے، اور بس آگے کسی اور کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں۔

جھونپڑی والا بھی پڑوسی ہے

دوسرے اگر کسی کو پڑوسی کے حقوق اور اس کے ساتھ حسن سلوک کا کچھ خیال بھی ہے تو پڑوسی اس کو سمجھا جاتا ہے جو مالی اعتبار سے میرا ہم پلہ ہو۔ اگر میرے برابر میں کوئی جھونپڑی ہے، اور اس میں کوئی شخص رہتا ہے تو وہ پڑوسی نہیں۔ پڑوسی وہ ہے کہ اگر میرا بنگلہ ہے تو اس کا بھی بنگلہ ہو، اگر وہ جھونپڑی والا ہے تو اس کو پڑوسی کے حقوق دینے کو تیار نہیں۔ اس کے بارے میں تو خیال ہی نہیں آتا کہ یہ میرا پڑوسی ہے۔ کیا اس وجہ سے وہ تمہارا پڑوسی نہیں کہ وہ بیچارہ غریب ہے؟ اس کا بنگلہ نہیں، بلکہ اس کی جھونپڑی ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ جب تم آپس میں پڑوسیوں کا اجتماع کرو گے، اور دعوت کرو گے تو صرف بنگلے والوں کی دعوت کرو گے، جھونپڑی والوں کو دعوت میں شامل نہیں کرو گے، لہٰذا دماغ میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ پڑوسی وہ ہے جو مال کے اعتبار سے، منصب کے اعتبار سے، عہدہ کے اعتبار سے، معاشی اعتبار سے میرا ہم پلہ ہو، ورنہ وہ پڑوسی نہیں۔ حالانکہ حقیقت میں پڑوسی وہ ہے جو تمہارے گھر کے پاس رہتا ہو۔ اگر وہ تمہارے گھر کی دیوار کے ساتھ رہتا ہے تو پہلی قسم کا پڑوسی ہے، اور اگر تھوڑے فاصلے پر رہتا ہے تو دوسری قسم کا پڑوسی ہے، دونوں میں سے ایک میں ضرور داخل ہے، اگرچہ وہ جھونپڑی میں رہتا ہے۔ بلکہ جھونپڑی والے پڑوسی کے حقوق زیادہ ہیں، اس لئے کہ اگر کسی دن اس کے گھر میں کھانے کو نہ ہو تو اس کا پڑوسی گناہگار ہوگا، بلکہ ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ مسلمان نہیں جس کے پڑوس میں کوئی آدمی بھوکا سو جائے۔

مفتی اعظم ہند رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بات کئی بار سنی کہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جن کے فتاویٰ کی دس جلدیں ''فتاویٰ دارالعلوم دیوبند'' کے نام سے چھپ چکی ہیں، دارالعلوم دیوبند کے ''مفتی اعظم'' فتویٰ میں میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ تھے، ان کے گھر کے قریب تین چار بیوہ خواتین رہا کرتی تھیں، ان کا معمول یہ تھا کہ جب دارالعلوم جانے کے لئے اپنے گھر سے نکلتے تو پہلے ان تمام بیوہ خواتین کے گھر جاتے، اور ان سے پوچھتے کہ بی بی! تمہیں بازار سے کچھ سودا منگوانا ہو تو بتادو، میں لا دیتا ہوں۔ اب کوئی خاتون کہتیں کہ اتنا ہرا دھنیہ، اتنا پودینہ، اتنی سبزی اور اتنے ٹماٹر لے آنا۔ تمام خواتین سے سودا پوچھتے، پھر بازار جاتے، بازار سے سودا خریدتے، ہر بیوہ کے گھر میں وہ سودا پہنچاتے، پھر دارالعلوم تشریف لے جاتے۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا کہ کوئی خاتون یہ کہتی کہ مولوی جی! تم غلط سودا لے آئے، میں نے تو فلاں چیز منگوائی تھی، آپ فلاں چیز لے آئے، یا

میں نے تو اتنی مقدار میں منگوائی تھی، آپ اتنی لے آئے۔ فرماتے: اچھا بی بی، کوئی بات نہیں، میں واپس بازار چلا جاتا ہوں، اور ابھی بدلوا کر لے آتا ہوں۔ چنانچہ دوبارہ بازار جاتے، وہ چیز بدلواتے، پھر لا کر اس بیوہ کے حوالے کرتے، پھر دار العلوم تشریف لے جاتے۔ روزانہ کا یہ معمول تھا، ان کا سب سے پہلا کام اپنے پڑوسیوں کی خبر گیری کرنا تھا۔

یہ کیسے لوگ تھے؟

وہ شخص جس کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے، وہ شخص جس کے فتاویٰ کو اتھارٹی تسلیم کر لیا گیا ہے، دنیا بھر سے لوگ اس کے پاس سوالات کرنے آرہے ہیں، نہ جانے کتنے لوگ ان کے ہاتھ پاؤں چومنے والے موجود ہیں۔ لیکن ان کا یہ حال ہے کہ فتویٰ کا کام شروع کرنے سے پہلے بیوہ خواتین کی خبر گیری کر رہے ہیں۔ یہ لوگ ویسے ہی بڑے نہیں بن گئے۔ میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کے ذریعے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور کی یادیں تازہ کر دیں، اور واقعہ بھی یہی ہے، جن علماء دیوبند کے ہم نام لیوا ہیں، یہ محض اس وجہ سے نہیں کہ بس ان سے عقیدت ہو گئی، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کا ایک ایک فرد سنتِ نبوی کا جیتا جاگتا پیکر تھا، اور یہ صرف نماز روزے میں نہیں، بلکہ زندگی کے ایک ایک شعبے میں سنتِ نبوی پر عامل تھا۔

ساری زندگی کچے مکان میں گزار دی

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ حضرت میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو دار العلوم دیوبند کے استاذِ حدیث تھے، ساتھ میں کتابوں کی تجارت بھی کرتے تھے، مالی اعتبار سے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق تھا، خوشحال تھے، لیکن مکان کچا تھا۔ جب بارش ہوتی تو ہر بارش کے موقع پر یہ ہوتا کہ کبھی اس مکان کی چھت ٹوٹ جاتی، کبھی اس کی دیواریں کمزور ہو جاتیں، کبھی برآمدہ گر جاتا، اور جب برسات کا موسم ختم ہوتا تو دوبارہ اس کی مرمت کرواتے۔ والد صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دن حضرت سے عرض کیا کہ حضرت! ہر سال برسات میں مکان میں ٹوٹ پھوٹ ہو جاتی ہے، آپ مشقت اور تکلیف اُٹھاتے ہیں، پھر دوبارہ مرمت کروانی پڑتی ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو وسعت دے رکھی ہے، آپ ایک مرتبہ اپنے مکان کو پکا کروالیں تو یہ بار بار کی تکلیف سے نجات مل جائے گی۔ چونکہ طبیعت میں ظرافت بھی تھی، اس لئے جواب میں فرمایا: واہ مولوی شفیع صاحب! آپ نے کیا بہترین مشورہ دیا ہے، ہم تو بڈھے ہو گئے، ساری عمر گزر گئی، اور اتنی بات ہماری عقل میں نہیں آئی، واہ، سبحان اللہ! کیا عقلمندی کی بات کہی، ماشاء اللہ۔ اتنی بار انہوں نے یہ جملے دہرائے کہ میں شرم سے پانی پانی ہو گیا، اور

بہت شرمندہ ہوا۔ والد صاحب نے کہا کہ حضرت! میرے سوال کرنے کا مقصد آپ سے یہ پوچھنا تھا کہ مکان پکا نہ بنانے میں کیا حکمت ہے؟ جب بہت زیادہ اصرار کیا تو حضرت نے فرمایا کہ اچھا میرے ساتھ آؤ۔ میرا ہاتھ پکڑا، اور گھر کے دروازے پر لے گئے، اور پوچھا:

"یہ گلی جو تمہیں یہاں سے نظر آرہی ہے، اس میں تمہیں کوئی پکا مکان نظر آرہا ہے؟ کسی کا مکان پکا نہیں، اب ساری گلی کے تمام پڑوسیوں کے مکان تو کچے ہوں، اور میرا مکان پکا ہو تو پکا مکان بنا کر میاں صاحب کیا اچھا لگے گا؟ اور میرے اندر اتنی استطاعت نہیں کہ ساری گلی والوں کے مکان پکے کرادوں، لہٰذا جیسے میرے پڑوسی ہیں، میں بھی ویسا ہی سہی"

اس طرح ساری زندگی کچے مکان میں گزاردی، صرف اس لئے کہ پڑوسیوں کے دل میں یہ حسرت نہ ہو کہ میاں صاحب کا مکان پکا ہے، اور ہمارا مکان کچا ہے، حالانکہ مکان پکا بنالینا کوئی گناہ نہیں تھا، نہ شریعت نے منع کیا تھا، نہ حرام قرار دیا تھا، لیکن پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کا ایک تقاضا یہ بھی تھا کہ ان کے دل میں یہ خیال اور یہ حسرت نہ ہو کہ میاں صاحب کا مکان پکا ہے، اور ہمارا مکان کچا ہے۔

تاکہ پڑوسیوں کو حسرت نہ ہو

میرے بڑے بھائی جناب ذکی کیفی مرحوم اپنا واقعہ سنایا کرتے تھے کہ میں ایک مرتبہ حضرت میاں صاحب کے پاس گیا، آموں کا موسم تھا، میاں صاحب نے آم پیش کیے کہ آم کھاؤ، اور اس زمانے میں آم چوس کر کھائے جاتے تھے، جب چھلکے اور گٹھلیاں جمع ہوگئیں تو میں نے پوچھا کہ ان کو باہر پھینک دوں؟ اور اُٹھا کر دروازے کی طرف چلا۔ حضرت نے پوچھا کہ کہاں چلے؟ میں نے کہا: حضرت باہر پھینکنے کے لئے جارہا ہوں۔ حضرت نے فرمایا: نہیں، اس کو باہر مت پھینکو۔ میں نے پوچھا: کیوں؟ انہوں نے فرمایا کہ جب باہر دروازے پر اتنے سارے چھلکے اور گٹھلیاں محلے کے بچوں کو نظر آئیں گی، ان میں سے بہت سے غریب ہیں، جو آم کھانے کی استطاعت نہیں رکھتے تو ہوسکتا ہے کہ اس کو دیکھ کر ان کے دل میں حسرت پیدا ہو، اور یہ حسرت پیدا ہونا اچھی بات نہیں، اس لئے ان کو باہر نہیں پھینکتا، بلکہ چھلکے بکریوں کو کھلا دیتا ہوں۔ یہ ہیں پڑوسیوں کے حقوق، جن کے بارے میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

((وَأَحْسِنْ إِلٰى جَارِكَ تَكُنْ مُسْلِمًا))

جس میں پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کو مسلمان ہونے کی علامت قرار دیا ہے۔

ساتھ کی دکان والا پڑوسی ہے

یہ پڑوسی صرف گھر کی رہائش میں نہیں ہوتا، بلکہ دکان کا بھی پڑوسی ہوتا ہے۔ اگر آپ کی دکان کے ساتھ دوسرے کی دکان ہے تو وہ بھی آپ کا پڑوسی ہے، اس کے بھی حقوق ہیں۔ لیکن آج کل کمپٹیشن اور مقابلے کا دور ہے، اس لئے برابر کی دکان والے کے ہم پر کیسے حقوق؟ بس ہم کسی طرح اس سے آگے بڑھ جائیں۔ لیکن شریعت کی نظر میں وہ پڑوسی ہے، اور پڑوسی ہونے کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کی بنیاد پر وہ تمہارے حسن سلوک کا حقدار ہے۔ جس معاشرے میں اسلامی تعلیمات کا چلن تھا، جو معاشرہ نبی کریم ﷺ نے قائم فرمایا تھا، وہاں دکان کے برابر والا پڑوسی بھی حقوق رکھتا تھا، اس کے ساتھ بھی حسن سلوک کا مظاہرہ غیر معمولی طریقے پر ہوتا تھا۔

سبق آموز واقعہ

آج سے تقریباً چالیس سال پہلے ۱۹۶۶ء کی بات ہے، مکہ مکرمہ میں عمرہ کے لئے میرا جانا ہوا۔ میرے بڑے بھائی جناب ولی رازی صاحب ساتھ تھے۔ اس وقت تک مکہ مرمہ میں قدامت کے آثار باقی تھے، اور ایسی جدت ابھی نہیں آئی تھی۔ ہم نے وہاں تقریباً دو مہینے قیام کیا۔ اس وقت جوانی تھی، ہر جگہ جانے اور پرانی اور قدیم جگہیں دیکھنے کا شوق تھا۔ ایک بازار میں ہم گئے تو ایک صاحب جو وہاں جا کر مقیم ہو گئے تھے، انہوں نے بتایا کہ یہاں تو عجیب منظر ہے کہ جیسے ہی اذان ہوئی تو اپنی دکان کو کھلا چھوڑ کر اور سامان پر بس کپڑا ڈال کر نماز کے لئے چلے گئے۔ کوئی چوری اور ڈاکے کا خطرہ نہیں ہے۔ ایک صاحب کہنے لگے کہ میں نے اس سے زیادہ عجیب حالت دیکھی کہ میں ایک مرتبہ اسی بازار میں ایک دکان والے کے پاس کپڑا خریدنے گیا۔ میں نے ایک کپڑا دیکھ کر اسے پسند کرلیا۔ دام پوچھے تو دام بھی مناسب تھے۔ میں نے کہا کہ اتنا کپڑا پھاڑ دو۔ دکاندار نے پوچھا کہ آپ کو یہ کپڑا پسند ہے؟ میں نے کہا: ہاں۔ دام بھی ٹھیک ہیں؟ میں نے کہا: ٹھیک ہیں۔ پھر دکاندار نے کہا کہ ایسا کریں کہ یہی کپڑا سامنے والی دکان سے لے لیں۔ میں نے کہا کہ وہاں سے کیوں لوں؟ سودا تو آپ سے ہوا ہے۔ دکاندار نے کہا کہ اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں، آپ کو یہی کپڑا اسی دام میں وہاں سے مل جائے گا، وہاں سے لے لو۔ میں نے کہا: کیا وہ آپ کی دکان ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں، میری دکان نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ میرا سودا تو آپ سے ہوا ہے، میں تو آپ ہی سے لوں گا، اور میں نے کہا کہ جب تک آپ وجہ نہیں بتائیں گے اس وقت تک نہیں لوں گا۔ دکاندار نے کہا کہ بات دراصل یہ ہے کہ میرے پاس صبح سے لے کر اب تک آٹھ دس گاہک آچکے ہیں، اور سامنے والی دکان

میں صبح سے لے کر اب تک کوئی گاہک نہیں آیا، اس لئے میں نے چاہا کہ اس کی بھی بکری ہو جائے، اس لئے تمہیں اس کے پاس بھیج رہا ہوں۔ یہ ہے مسلمان معاشرے کی ایک جھلک جو اس وقت تک باقی تھی۔

آج طلبِ دنیا کی دوڑ لگی ہوئی ہے

یہ جو آج مصیبت ہمارے اندر آگئی ہے کہ بس مجھے مل جائے، دوسرے کو ملے یا نہ ملے، بلکہ دوسرے سے چھین کر کھا جاؤں، دوسرے سے لوٹ کر کھا جاؤں، یہ آفت طلبِ دنیا کی دوڑ کی وجہ سے آگئی ہے۔ اب دیکھئے اوپر والے واقعے میں دکان کے پڑوسی کا خیال ہے، اس کے ساتھ حسن سلوک ہو رہا ہے۔ وہ مسلمان جس کے دل میں اللہ کا خوف ہو، جس کے دل میں اللہ کے رسول کی عظمت اور محبت ہو، وہی یہ سلوک کر سکتا ہے، دوسرا شخص یہ عمل نہیں کر سکتا، اس لئے کہ تاجر تو یہ کہتا ہے کہ میں تو یہاں نفع کھانے بیٹھا ہوں، میں اپنی دکان کی بکری کرنے کے لئے بیٹھا ہوں، دوسروں کی دکان کی بکری کرنے کے لئے نہیں بیٹھا ہوں۔ لیکن جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہو، اور رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد پر ایمان رکھتا ہو کہ اپنے پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کرو تو تم مسلمان ہو جاؤ گے، وہی شخص اپنے پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کر سکتا ہے، دوسرا نہیں کر سکتا۔

برصغیر میں اسلام کی ابتداء کس طرح ہوئی؟

ہم اپنی برصغیر کی تاریخ اُٹھا کر دیکھیں تو یہ نظر آئے گا کہ اس علاقے میں اسلام کی جو روشنی آئی، اور یہاں اللہ تعالیٰ نے اسلام کا جو نور پھیلایا، درحقیقت حضورِ اقدس ﷺ کے اس ارشاد پر عمل کا نتیجہ تھا۔ یہاں پر ابتداء میں کوئی اسلامی لشکر اس علاقے کو فتح کرنے کے لئے نہیں آیا تھا، اور یہاں کوئی تبلیغی جماعت نہیں آئی تھی، جس نے تبلیغ کر کے لوگوں کو مسلمان بنایا ہو، بلکہ یہاں پر سب سے پہلے مالابار کے علاقے میں بعض تابعین، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ صحابہ بھی مالابار کے ساحل پر اُترے، اور وہاں پر انہوں نے اپنی تجارت شروع کی، اور اس تجارت میں انہوں نے جس سچائی کا، اور جس امانت داری کا، دیانت داری کا اور انسان دوستی کا ثبوت دیا تو اس سے لوگوں کے دل ان کی طرف کھنچنا شروع ہو گئے، اور لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات آئی کہ جو دین ان کو یہ باتیں بتا رہا ہے، اس دین کو ہمیں بھی قبول کرنا چاہئے، چنانچہ ان تاجروں کو دیکھ دیکھ کر لوگ مسلمان ہوئے، اور اس طرح سب سے پہلے اسلام مالابار میں آیا، پھر مالابار سے پورے برصغیر میں اسلام پھیلا۔ تو حضورِ اقدس ﷺ یہ جو فرما رہے ہیں کہ پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کرو تو تم مسلمان بن جاؤ گے، یعنی

تمہارے مسلمان ہونے کا ایک مظاہرہ دنیا کے سامنے آئے گا، تو اللہ تعالیٰ ان کو اسلام لانے کی توفیق عطا فرمائیں گے۔

دیوار پر شہتیر رکھنے کی اجازت

بہر حال! پہلی قسم کا پڑوسی وہ ہے جس کی دیوار سے دیوار ملی ہوئی ہو، اور دوسری قسم کا پڑوسی وہ ہے جو ذرا فاصلے پر ہو، لیکن قریب ہی ہو، دونوں کے حقوق ہیں۔ ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تمہارا پڑوسی اپنا شہتیر تمہاری دیور پر رکھنا چاہے تو اس کو منع مت کرو۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ یہ حدیث لوگوں کو سنا رہے تھے تو لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی کہ دیوار ہماری ہے، ہماری ملکیت ہے تو کیا یہ ہمارے اوپر فرض ہے کہ ہم پڑوسی کو اس کے اوپر شہتیر رکھنے سے منع نہ کریں۔ ان کی حیرانگی کو دیکھ کر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم! یہ حضورِ اقدس ﷺ کا ارشاد ہے، چاہے تمہیں کتنا برا لگے، لیکن میں اس ارشاد کو تمہارے کندھوں کے درمیان پھینک کر رہوں گا۔ (۱)

مطلب یہ تھا کہ میں تمہیں یہ ارشاد سنا کر رہوں گا۔ حالانکہ اپنی دیوار پر پڑوسی کے شہتیر رکھنے کی اجازت دینا فرض و واجب نہیں، لیکن رسول اللہ ﷺ نے یہ ترغیب دی کہ اگر تم مسلمان ہو تو تمہیں یہ کام کرنا چاہئے۔

پڑوسی کے حقوق میں غیر مسلم بھی داخل ہے

ایک بات اور سمجھ لیں کہ پڑوسی کے حقوق میں مسلم اور غیر مسلم سب برابر ہیں، یعنی پڑوسی ہونے کی حیثیت سے اگر غیر مسلم آپ کے مکان کے برابر میں رہتا ہے تو اس کا بھی یہی حق ہے کہ اس کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے، لہٰذا بعض اوقات یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ تو کافر ہے، اس کے ساتھ حسن سلوک کیوں کریں؟ یہ بات درست نہیں۔ اس لئے کہ پڑوسی ہونے کے ناطے اس کے ساتھ حسن سلوک کرنا تمہارے لئے باعثِ اجر و ثواب ہے، اور اگر پڑوسی ہونے کی بنیاد پر تم نے اس کے ساتھ حسن سلوک کیا، اور اس کو ہدیہ تحفہ بھیج دیا، اس کی کوئی مدد اور تعاون کر دیا تو یہ سب اللہ جل شانہ کی رضا کے مطابق ہے، اور کیا بعید کہ تمہارے حسن سلوک کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اس کے دل میں

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب المظالم والغضب، باب لا یمنع جار جاره أن یغرز خشبه فی جداره، رقم: ۲۲۸۳، صحیح مسلم، کتاب المساقاة، باب غرز الخشب فی جدار الجار، رقم: ۳۰۱۹، سنن الترمذی، کتاب الأحکام عن رسول اللہ، باب ما جاء فی الرجل یضع علی حائط جاره خشبا، رقم: ۱۲۷۳، سنن أبی داؤد، کتاب الأقضیة، باب من القضاء، رقم: ۳۱۵۰

ایمان ڈال دے۔ نہ جانے کتنے غیر مسلم تھے، مسلمانوں کے پڑوس ہونے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کو ایمان کی توفیق عطا فرمادی۔ لہٰذا پڑوسی چاہے مسلمان ہو، یا غیر مسلم ہو، غریب ہو، یا امیر ہو، یا فاسق و فاجر ہو، وہ بھی اپنے فسق فجور کی وجہ سے پڑوسی ہونے کے حقوق سے محروم نہیں۔ ہاں! حسبِ موقع، مناسب وقت پر اس کو نیک باتوں کی تلقین کرتے رہو۔

تھوڑی دیر کا ساتھی

پڑوسی کی تیسری قسم ہے "صاحب بالجنب" یعنی تھوڑی دیر کا ساتھی، جیسے بس میں، جہاز میں، ریل گاڑی میں آپ کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے والا صاحب بالجنب ہے، یا کسی مجلس میں، مسجد میں، درسگاہ میں، کلاس میں، جلسہ گاہ میں تمہارے قریب بیٹھنے والے یہ سب صاحب بالجنب ہیں۔ ہم ذرا اپنا جائزہ لے کر دیکھیں کہ ہم اسلامی تعلیمات سے کتنی دور چلے گئے ہیں۔ ریل میں سفر کرتے وقت اور جہاز میں سفر کرتے وقت آپ کو یہ نظر آئے گا کہ ہر جگہ خود غرضی کا رجحان ہے۔ مجھے اچھی جگہ مل جائے، چاہے دوسرے کو ملے یا نہ ملے، مجھے راحت مل جائے، دوسرے کو راحت ملے یا نہ ملے، عام طور پر یہ مزاج بن گیا ہے۔ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ جو شخص صاحب بالجنب ہے، وہ تمہارا ساتھی ہے، چاہے تھوڑی دیر کے لئے ساتھی بنا ہو، لیکن اس ساتھی کا بھی تمہارے اوپر حق ہے۔

اہلِ مغرب کی ایک اچھی صفت

آج ہم لوگ اہل مغرب کو برا بھلا تو بہت کہتے رہتے ہیں، وہ ہیں بھی اسی لائق کہ ان کو ایسا کہا جائے، لیکن کچھ صفات ایسی ہیں، جو ان لوگوں نے مسلمانوں والی اپنالی ہیں۔ یہ دنیا دارالعمل اور دارالاسباب ہے۔ جو شخص بھی کوئی سبب اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں اچھا نتیجہ دیں گے۔ چنانچہ اہل مغرب کا ایک مزاج ہے کہ کسی ایک کام کے لئے اگر تین آدمی کسی ایک جگہ جمع ہو جائیں گے تو فوراً قطار اور لائن بنالیں گے۔ مثلاً اگر ٹکٹ خریدنا ہے، یا بس میں، یا ریل میں، یا جہاز میں سوار ہونا ہے، تو لائن بنا کر سوار ہوں گے۔ اگر تین آدمی جمع ہو گئے، تو خود بخود لائن بنالیں گے، اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کریں گے، یہ وہاں کا عام مزاج ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں کبھی ان کے درمیان لڑائی جھگڑا نہیں ہوتا، نہ کبھی چھینا جھپٹی ہوتی ہے، نہ دھینگا مشتی ہوتی ہے، سب کام آرام سے ہو جاتے ہیں، پوری قوم کا یہ مزاج بن گیا ہے۔

ہماری ’’خودغرضی‘‘ کا واقعہ

میں اپنا واقعہ بتاتا ہوں، ایک مرتبہ مجھے پی آئی اے کے طیارے میں نیویارک سے کراچی آنا تھا، جس مرحلے تک گوروں کی حکمرانی تھی وہاں تو ہر جگہ لائن لگی ہوئی تھی، لائنوں سے گزرتے ہوئے سب کام ہوگئے، لیکن جب بس میں بیٹھنے کا موقع آیا تو وہ چونکہ ہمارے پاکستانی بھائیوں کے انتظام میں تھا، بارش ہورہی تھی، اور جہاز لیٹ ہوگیا تھا، اس لئے بسوں کے ذریعے ہوٹل جانا تھا۔ اب بس میں بیٹھنے کے لئے جو دھکم پیل ہوئی کہ الامان الحفیظ۔ کمزور آدمی کا تو بس میں داخل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہر آدمی یہ چاہتا تھا کہ میں دوسروں کو پیچھے دھکیل کر پہلے بس میں سوار ہوجاؤں۔ میں نے دل میں کہا کہ وہ کافر تھے، اور یہ ماشاء اللہ مسلمان ہیں۔ یہ ہے ’’خودغرضی‘‘ کہ مجھے پہلے موقع مل جائے، میں سوار ہوجاؤں، میرا کام ہوجائے، میں آگے بڑھ جاؤں، دوسروں کو پیچھے چھوڑ دوں۔ یہ سب اس لئے ہورہا ہے کہ ہم نے ان باتوں کو دین سے خارج کردیا ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دین صرف نفلیں پڑھنے اور تسبیح پڑھنے کا نام ہے۔

مصافحہ کرنے پر ایک واقعہ

اور دیکھئے! مصافحہ کرنا کوئی فرض واجب نہیں، زیادہ سے زیادہ سنت ہے، اس مصافحہ کے لئے کسی مسلمان کو تکلیف دینا، نقصان پہنچانا، دھکے دینا حرام ہے۔ ایک حرام کام کرکے ہم سنت پر عمل کرنا چاہتے ہیں۔ ایک مرتبہ صوبہ سرحد کے ایک علاقے میں جانا ہوا۔ وہاں کی مسجد میں اجتماع ہوا، اور میرا بیان ہوا۔ دروازے اس مسجد کے چھوٹے تھے، دونوں طرف کھڑکیاں تھیں، برآمدہ بھی تھا، صحن بھی تھا۔ لوگ دور دور سے بیان سننے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ مسجد کا ہال، برآمدہ اور صحن سب لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ جب بیان ختم ہوا، اور مصافحے کی نوبت آئی، میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ برآمدے اور صحن کے لوگ کھڑکیوں کے ذریعے اندر آنے کی کوشش کررہے تھے، اور اس کے نتیجے میں مسجد کی کھڑکیاں ٹوٹ گئیں۔ مقصد ان کا صرف یہ تھا کہ مصافحہ کرنیکا موقع نہ نکل جائے۔ دماغ میں یہ بات تو بیٹھی ہوئی تھی کہ مصافحہ کرنا سنت ہے، اور مصافحہ کرنے کی فضیلت دل و دماغ میں تھی، لیکن یہ ذہن سے نکل گیا کہ مسجد میں دھکم پیل کرنا، اور دوسروں کو اذیت دینا حرام ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہماری قوم کی صحیح تربیت نہیں ہوئی، اس کے نتیجے میں یہ فساد پھیلا ہوا ہے۔

حجرِ اسود پر دھکم پیل

حجر اسود پر جا کر دیکھیں، کیا ہو رہا ہے، سارے علماء اور فقہاء یہ مسئلہ لکھ لکھ کر چلے گئے کہ حجر اسود کو بوسہ دینا بڑی فضیلت کی چیز ہے، لہٰذا کسی شخص کو تکلیف پہنچائے بغیر بوسہ دے سکتے ہو تو دیدو، ورنہ بوسہ دینا کوئی ضروری نہیں، فرض و واجب نہیں۔ مگر آج وہاں دھکم پیل ہو رہی ہے، دوسروں کو تکلیف دی جا رہی ہے، اور اس فضیلت کو حاصل کرنے کے لئے گناہ کا ارتکاب کیا جا رہا ہے۔ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ اس لئے کہ آج دین کے تصور میں یہ باتیں داخل ہی نہیں کہ دوسروں کو تکلیف دینا کوئی گناہ کا کام اور حرام ہے۔ بہر حال! اگر ہم سب مل کر ایک کام کے لئے گئے ہیں تو ہم سب ایک دوسرے کے لئے "صاحب بالجنب" ہیں، ہر ایک کے دوسرے پر حقوق ہیں۔ اگر لائن بنالو گے تو سب کو موقع مل جائے گا، مگر اس طرف کسی کا دھیان ہی نہیں۔

ایک سنہری بات

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ ایک سنہری بات فرمایا کرتے تھے، جو دل پر نقش کرنے کے قابل ہے، فرمایا کرتے تھے کہ باطل میں تو اُبھرنے کا دم ہی نہیں، قرآن کریم نے فرمادیا:

﴿إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا﴾(۱)

باطل تو مٹنے کے لئے اور دبنے کے لئے آیا ہے، وہ کبھی اُبھر نہیں سکتا۔ اور اگر تم کسی باطل قوم کو دیکھو کہ وہ دنیا میں اُبھر رہی ہے، ترقی کر رہی ہے، تو سمجھ لو کہ کوئی حق چیز اس کے ساتھ لگ گئی ہے، اس حق چیز نے اس کو اُبھار دیا ہے، ورنہ باطل میں اُبھرنے کی طاقت نہیں تھی۔ آج ہم امریکہ کو، برطانیہ کو اور مغربی طاقتوں کو جتنا برا بھلا کہتے رہیں، ان پر لعنتیں بھیجتے رہیں، لیکن ان کی ترقی ان کی فحاشی اور عریانی کی وجہ سے نہیں، ان کے غلط عقائد کی وجہ سے نہیں، بلکہ ان کی ترقی ان صفات کی وجہ سے ہے جو درحقیقت اسلام کی بتائی ہوئی صفات تھیں، انہوں نے ان صفات کو اختیار کر لیا۔ مثلاً محنت، جفاکشی، دیانت داری، تجارت میں امانت داری، اور انسانوں کے حقوق کا خیال رکھنا، یہ سب باتیں وہ ہیں جس نے ان کو دنیا میں ترقی دیدی۔ آخرت میں تو ان کا کوئی حصہ نہیں۔ لیکن دنیا میں اللہ تعالیٰ ہر ایک کے ساتھ یہ معاملہ فرماتے ہیں کہ جو شخص جیسا سبب اختیار کرے گا ویسا اس کو دنیا میں پھل مل جائے گا۔

---

(۱) بنی اسرائیل: ۸۱، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: "اور یقیناً باطل ایسی ہی چیز ہے جو مٹنے والی ہے"

اسلام میں پورے داخل ہو جاؤ

بات دراصل یہ ہے کہ ہم نے دین کو خانوں میں بانٹ رکھا ہے، ایک قوم نے ایک خانے کو لے لیا، اور اس کو دین سمجھ لیا، اور اس خانے سے باہر کی بات اس کے نزدیک دین نہیں۔ حالانکہ قرآن کریم کا کہنا یہ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً﴾(۱)

''اے ایمان والو! پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ''

یہ نہیں کہ رمضان المبارک میں تو خوب نفلیں بھی پڑھیں، اعتکاف بھی کیا، رات کو جاگ بھی لیا، تلاوت بھی کر لی، جب رمضان ختم ہوا اور مسجد سے باہر نکلے تو قصائی بن گئے، لوگوں کے ساتھ معاملات کرنے میں، معاشرت میں خیانت کرنے لگے۔ آج کی دنیا کرپشن سے بھری ہوئی ہے، اس کے نتیجے میں ہم پر عذاب نہیں آئے گا تو کیا آئے گا؟ اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے، آمین۔ بہرحال! اس حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے فرما رہے ہیں کہ تم خود بھی ان باتوں کو سنو، اور دوسروں تک پہنچاؤ، اگر تم مسلمان بننا چاہتے ہو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

(۱) البقرة: ۲۰۸

تھوڑی دیر کا ساتھی ☆

زندگی میں انسان کو قدم قدم پر دوسروں سے واسطہ پیش آتا ہے، بعض تعلقات دائمی نوعیت کے ہوتے ہیں، جیسے رشتہ دار، بعض دائمی نہ سہی لیکن لمبی مدت کے لئے ہوتے ہیں جیسے پڑوسی، اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ صرف چند گھنٹوں یا اس سے بھی کم مدت کے لئے کسی کا ساتھ ہو جاتا ہے، جیسے ہم کسی بس، ریل یا ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہوئے کچھ دیر کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔

قرآن کریم نے نہایت باریک بینی سے ان تینوں قسم کے تعلقات کے کچھ حقوق رکھے ہیں، اوران حقوق کی نگہداشت کی تاکید فرمائی ہے۔ پہلی دو قسموں یعنی رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے حقوق کو لوگ پھر بھی کچھ نہ کچھ اہمیت دیتے ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ بدسلوکی کے نتیجے میں انسان بدنام ہو جاتا ہے، اور چونکہ یہ تعلقات دیرپا قسم کے ہیں اس لئے یہ بدنامی بھی دیرپا ہو جاتی ہے، لیکن تیسری قسم یعنی وہ لوگ جو مختصر وقفے کے لئے ساتھ ہو گئے ہوں بہت کم انسان ان کے حقوق کا خیال رکھنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ایسے لوگ عموماً اجنبی ہوتے ہیں، اور تھوڑی دیر کے بعد جب جدا ہوتے ہیں تو بعض اوقات تمام عمر ان سے کوئی واسطہ پیش نہیں آتا، اس لئے ان کے ساتھ اگر کوئی بداخلاقی یا بدسلوکی ہو جائے تو اس کی وجہ سے کسی دیرپا بدنامی کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ لوگ عموماً یہ سوچتے ہیں کہ اگر تھوڑی دیر کے لئے اس شخص پر میرے بارے میں کوئی غلط تأثر قائم ہو بھی گیا تو کیا ہوا؟ بعد میں تو کبھی اس سے ملنا نہیں ہے، اس لئے اس تأثر سے میری زندگی پر کوئی برا اثر نہیں پڑے گا۔ چنانچہ بسوں، ریلوں دوسری عوامی سواریوں، اور اب تو ہوائی جہازوں میں بھی جو دھکا پیل اور نفسی نفسی کا جو عالم نظر آتا ہے، کہ ہر شخص دوسرے کو کہنی مار کر آگے بڑھنے کی فکر میں رہتا ہے، وہ درحقیقت اسی ذہنیت کا شاخسانہ ہے۔

اسی لئے قرآن کریم نے جہاں رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کی ترغیب دی،

☆ ذکر و فکر، ص: ۲۶۰ تا ۲۶۵

وہاں تھوڑی دیر کے ساتھیوں کے حقوق ادا کرنے کو بطور خاص ذکر فرمایا۔ تھوڑی دیر کے ساتھی کے لئے قرآن کریم نے "الصاحب بالجنب" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ (۱)

اس کا اردو ترجمہ "ہم پہلو" کے لفظ سے کیا جاسکتا ہے، اور اس سے مراد وہ شخص ہے جو مختصر مدت کے لئے کسی کے ساتھ ہو گیا ہو، خواہ کسی سفر میں، یا کسی عمومی مجلس میں، بس یا ریل میں سفر کرتے ہوئے جو شخص ہمارے قریب بیٹھا ہے، وہ ہمارا "صاحب بالجنب" ہے۔ کسی دعوت جلسے یا اجتماع عام میں جو شخص ہمارے پہلو میں ہے، وہ ہمارا "صاحب بالجنب" ہے، اور قرآن کریم نے خاص طور پر اس کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید اس لئے فرمائی ہے کہ انسان کی شرافت اور خوش اخلاقی کا اصل امتحان ایسے ہی مواقع پر ہوتا ہے۔ بڑے بڑے تعلیم یافتہ، بظاہر مہذب اور شائستہ لوگوں کو دیکھا کہ اپنے روزمرہ کے حالات میں وہ بظاہر بڑے خوش اخلاق اور شائستہ نظر آتے ہیں، لیکن جب کبھی سفر کی نوبت آئی تو ان کی ساری تہذیب اور خوش اخلاقی دھری کی دھری رہ گئی، اور انہوں نے اپنے ہم سفروں کے ساتھ پرلے درجے کی خود غرضی اور سنگدلی کا برتاؤ شروع کر دیا۔

اسی لئے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ کسی شخص کی نیکی کی حتمی گواہی اس وقت دو جب یا تو تمہارا اس سے روپے پیسے کا کوئی لین دین ہو چکا ہو جس میں تم نے اسے کھرا پایا ہو، یا اس کے ساتھ تم نے کوئی سفر کیا ہو، اور اس سفر میں تم نے اسے واقعی خوش اخلاق دیکھا ہو۔

بات دراصل یہ ہے کہ خوش اخلاقی کا جو برتاؤ صرف بدنامی کے خوف سے کیا جائے، وہ خوش اخلاقی ہی کہاں ہے؟ وہ تو ایک دکھاوا ہے، چنانچہ جب بدنامی کا خوف ٹلے گا، انسان کی بداخلاق اصلیت ظاہر ہو جائے گی۔ خوش اخلاقی تو ایک اندرونی صفت کا نام ہے جو نیک نامی اور بدنامی سے بے نیاز ہو کر کوئی اچھا عمل اس لئے کرتی ہے کہ وہ اچھا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا سبب ہے۔ جب یہ صفت کسی شخص کو حاصل ہو جائے تو اس کا رویہ ہر جگہ اس صفت کے مطابق ہوتا ہے، یہاں تک کہ اس جگہ بھی جہاں اسے کوئی دیکھ نہ رہا ہو، وہ اپنی پاکیزہ فطرت کے تحت وہی طرزِ عمل اختیار کرتا ہے جو اسے کرنا چاہئے، اور یہ حقیقت اس کے سامنے رہتی ہے کہ کوئی اور دیکھے یا نہ دیکھے، وہ ضرور دیکھ رہا ہے جس کے دیکھنے پر جنت اور جہنم کے فیصلے ہوتے ہیں۔

اسلام نے "صاحب بالجنب" یعنی تھوڑی دیر کے ساتھی کے حقوق کی جس باریک بینی سے دیکھ بھال کی ہے، اس کا اندازہ چند مثالوں سے لگائیے:

(۱) جمعہ کے دن جب مسجد میں لوگ خطبے اور نماز کے لئے جمع ہوں تو نو وارد کے لئے حکم یہ ہے کہ وہ اجتماع کے آخری حصے میں جہاں جگہ ملے بیٹھ جائے، لوگوں کی گردنیں پھلانگ کر آگے

---

(۱) النساء: ۳۶

بڑھنے کی کوشش کو سختی سے منع فرمایا گیا ہے، آنحضرت ﷺ نے اس عمل پر سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا۔

(۲) جمعہ کے دن نہا دھو کر، اچھے کپڑے پہن کر اور خوشبو لگا کر مسجد میں جانے کی ترغیب دی گئی ہے، تاکہ اس بڑے اجتماع میں ہر شخص دوسرے کے لئے تکلیف کے بجائے فرحت اور راحت کا سبب بنے۔

(۳) فقہاء کرام رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ جو شخص کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہو جس سے کسی پاس والے کو تکلیف ہو سکتی ہو، یا گھن آ سکتی ہو، اس کے لئے جماعت کی نماز معاف ہے، اور اسے اپنے گھر ہی میں نماز پڑھنے پر انشاء اللہ مسجد کی جماعت کا ثواب ملے گا۔

(۴) جب چند افراد ساتھ بیٹھ کر کوئی چیز کھا رہے ہوں تو حکم یہ ہے کہ دوسروں کا خیال رکھ کر کھاؤ۔ حدیث میں ہے کہ جب دوسرے لوگ ایک ایک کھجور لے کر کھا رہے ہوں تو تم دو دو کھجوریں مت لو۔ اس میں یہ اصول بتا دیا گیا ہے کہ صرف اپنی اپنی فکر کرنا اور جو ہاتھ لگے لے اڑنا ایک مؤمن کا شیوہ نہیں، یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ کچھ اور لوگ بھی تمہارے ساتھ کھانے میں شریک ہیں، تمہارا حصہ پوری طرح ناپ تول کر نہ سہی، لیکن دوسروں کے ساتھ کسی توازن ہی میں ہونا چاہئے۔ (آج کل بوفے قسم کی دعوتوں میں بعض مرتبہ جو چھینا جھپٹی نظر آتی ہے، اور جس طرح بعض لوگ یکبارگی ضرورت سے زیادہ چیزیں اپنے برتن میں انڈیل لیتے ہیں وہ ان احکام کی صریح خلاف ورزی ہے)

یہ چند مثالیں میں نے صرف یہ بتانے کے لئے دی ہیں کہ اسلامی تعلیمات میں "صاحب بالجنب" یا تھوڑی دیر کے ساتھی کی کتنی اہمیت ہے، اس اہمیت کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے معاشرے کے چند جزوی مسائل پر ایک نظر ڈال لیجئے۔

جہاں بہت سے لوگوں کو باری باری کوئی کام انجام دینا ہو، وہاں فطری طریقہ یہی ہے کہ آنے والوں کی ترتیب سے ایک قطار بنالی جائے، اور ہر شخص نمبروار اپنا کام انجام دیتا رہے۔ اس طرح سب کا فائدہ ہے، اور سب کا کام آسانی سے ہو جاتا ہے۔ ایسے موقع پر (کسی معقول عذر کے بغیر) لائن توڑ کر آگے بڑھنے کی کوشش کرنا یا اس کے لئے دھینگا مشتی کرنا دوسروں کی شدید حق تلفی ہے، جو بداخلاقی اور ناشائستگی ہونے کے علاوہ گناہ بھی ہے۔

افسوس ہے کہ آج غیر مسلم قومیں اس بات کا لحاظ رکھتی ہیں، بلکہ ان کا مزاج ہی یہ بن چکا ہے کہ جہاں دو آدمی جمع ہوں گے فوراً آگے پیچھے ہو کر قطار بنالیں گے، لیکن ہم جو "صاحب بالجنب" کے بارے میں قرآن و سنت کی مذکورہ ہدایات کی روشنی رکھتے ہیں لائن توڑ کر آگے بڑھنے کو بہادری اور

جی داری کا ایک ہنر سمجھتے ہیں، اور یہ خیال تو شاید ہی کسی کو آتا ہو کہ میں کسی گناہ کا ارتکاب کر رہا ہوں۔

بس یا ریل میں ہر شخص نشست کا اتنا حصہ استعمال کرنے کا حقدار ہے جتنا ایک مسافر کیلئے گاڑی والوں کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے، اس میں ہمارے یہاں دو طرح کی شدید بے اعتدالیاں ہوتی ہیں۔

پہلی بے اعتدالی تو یہ ہے کہ جن گاڑیوں میں بکنگ نہیں ہوتی، ان میں جو شخص پہلے پہنچ گیا وہ بیک وقت کئی کئی نشستوں کی جگہ گھیر کر اس پر قبضہ جمالیتا ہے اور دوسرے مسافر کھڑے کھڑے سفر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اب یہ کتنی بے انصافی کی بات ہے کہ آپ ایک ٹکٹ لے کر آرام سے لیٹے ہیں، اور دوسرا شخص اتنی ہی رقم کا ٹکٹ لے کر بیٹھنے سے بھی محروم ہے۔ میں نے اپنے بعض بزرگ علماء کے بارے میں تو یہاں تک سنا ہے کہ اگر گاڑی بالکل خالی پڑی ہوتی، اور دوسرے مسافر نہ ہوتے تب بھی وہ اپنی نشست سے زیادہ جگہ استعمال نہیں کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ میں نے ایک نشست کا کرایہ دیا ہے، میں ایک ہی نشست کے استعمال کا حقدار ہوں، اس سے زیادہ کا نہیں۔ یقیناً یہ احتیاط و تقویٰ کا اعلیٰ مقام ہے، لیکن چونکہ گاڑی والوں کی طرف سے ایسے مواقع پر خالی جگہوں کے استعمال کی عموماً اجازت ہوتی ہے، اس لئے اس کو ناجائز نہیں کہا جاسکتا، مگر جہاں دوسرے مسافر کھڑے ہونے پر مجبور ہوں، وہاں زائد جگہ گھیرنے کا کوئی جواز نہیں۔

دوسری بے اعتدالی اس کے برعکس یہ ہوتی ہے کہ جو سیٹ چار آدمیوں کے بیٹھنے کے لئے مخصوص ہے اس میں پانچواں آدمی زبردستی اپنے آپ کو ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے، اور پہلے سے بیٹھے ہوئے آدمیوں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ سمٹ کر اسے ضرور جگہ دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ پہلے سے جائز اور بجا طور پر اپنی جگہ بیٹھے ہوئے تھے، وہ تنگی اور دشواری کے ساتھ اپنا سفر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ایسے میں اگر وہ لوگ خود ایثار سے کام لیں، اور نو وارد کو جگہ دیدیں تو بیشک یہ ان کی عالی ظرفی ہے، اور باعثِ ثواب ہے، لیکن کسی نو وارد کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ انہیں اس عالی ظرفی پر مجبور کرے۔

چونکہ ہم نے دین کو صرف نماز روزے ہی کی حد تک محدود کرلیا ہے اس لئے اس قسم کی حرکتیں کرتے وقت یہ خیال بھی دل میں نہیں آتا کہ ہم کسی گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں، حالانکہ جس عمل سے بھی کسی دوسرے کی حق تلفی ہوتی ہو، یا اسے بیجا تکلیف پہنچتی ہو، وہ حرام ہے، ایسا حرام کہ اس کا گناہ صرف توبہ سے بھی معاف نہیں ہوتا جب تک خود وہ شخص معاف نہ کرے جس کی حق تلفی کی گئی ہے۔

دیکھنے میں یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں لیکن درحقیقت انہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے افراد اور قوموں کا مزاج بگڑتا ہے، اور جب کسی معاشرے کا مزاج بگڑ جائے تو وہی کچھ ہوتا ہے جس کا رونا آج ہم سب رو رہے ہیں۔ پھر فائدہ کسی کا نہیں ہوتا، نقصان سب کا ہوتا ہے۔ راحت کسی کو نصیب نہیں ہوتی، تکلیف میں سب مبتلا رہتے ہیں۔

اس کے برعکس اگر ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں یہ سوچ لیں کہ جس شخص کے ساتھ ہمیں کچھ دیر کی رفاقت میسر آئی ہے، اس کو آرام پہنچانے کی خاطر اگر ہم خود تھوڑی سی تکلیف اُٹھالیں تو یہ تکلیف تو زیادہ سے زیادہ چند گھنٹوں کی ہے، جو بہت جلد ختم ہو جائے گی، لیکن ہمارے ایثار کا نقش ہمارے ساتھی کے دل سے جلدی نہیں مٹے گا، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوگا، اور ہماری یہ تھوڑی سی محنت انشاء اللہ وہاں جا کر کیش ہوگی، جہاں روپے پیسے کا کیش بیکار ہو چکا ہوگا، تو رفتہ رفتہ ہمارا معاشرے کا مزاج بھی بدل سکتا ہے، اور ہم ایک دوسرے کے لئے سراپا رحمت بن سکتے ہیں۔

۱۲/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۶ھ
۸/ اکتوبر ۱۹۹۵ء
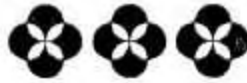
ہر خبر کی تحقیق ضروری ہے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ،

﴿يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا إِنْ جَآءَ كُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوْا أَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ﴾(۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! سورۂ حجرات کی تفسیر کا بیان کئی جمعوں سے چل رہا ہے، جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہماری معاشرتی زندگی سے متعلق بڑی اہم ہدایات عطا فرمائی ہیں، اسی سورۃ کی ایک آیت ابھی میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی، اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ اے ایمان والو! اگر کوئی گناہ گار تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تم ذرا ہوشیاری سے کام لو، یعنی ہر شخص کی ہر بات پر اعتماد کر کے کوئی کاروائی نہ کرو، ہوشیاری سے کام لینے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تحقیق کرو کہ یہ خبر واقعی سچی ہے یا نہیں؟ اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو ہوسکتا ہے کہ نادانی میں کچھ لوگوں کو تم نقصان پہنچادو، اور بعد میں تمہیں اپنے فعل پر ندامت اور شرمساری ہو کہ ہم نے یہ کیا کردیا۔ یہ آیت کریمہ کا ترجمہ ہے، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کو یہ ہدایت دی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات پر بھروسہ کر کے کوئی کاروائی نہ کیا کرے، بلکہ جو خبر ملے جب تک اس خبر کی پوری تحقیق نہ ہوجائے، اور جب تک وہ خبر صحیح ثابت نہ ہوجائے اس وقت تک اس خبر کی بنیاد پر نہ کوئی بات کہنا جائز ہے اور نہ اس کی بنیاد پر کوئی کاروائی کرنا جائز ہے۔

آیت کا شانِ نزول

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیتِ کریمہ ایک خاص واقعہ کے پسِ منظر میں نازل ہوئی تھی، جس کو اصطلاح میں ''شانِ نزول'' کہا جاتا ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ عرب میں ایک قبیلہ ''بنو مصطلق'' کے نام سے آباد تھا۔ بنو مصطلق کے سردار حارث بن ضرار جن کی بیٹی جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا

☆ اصلاحی خطبات (۱۶/ ۲۶۸۔۲۸۴)، بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) الحجرات: ٦

اُمہات المؤمنین میں سے ہیں، وہ خود اپنا واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے مجھے اسلام کی دعوت دی، اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا۔ میں نے اسلام قبول کرلیا، اور زکوٰۃ ادا کرنے کا اقرار کرلیا، اور میں نے عرض کیا کہ میں اپنی قوم میں واپس جا کر ان کو بھی اسلام کی اور ادائے زکوٰۃ کی دعوت دوں گا۔ جو لوگ میری بات مان لیں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے، ان کی زکوٰۃ جمع کرلوں گا، آپ فلاں مہینے کی فلاں تاریخ تک اپنا کوئی قاصد بھیج دیں تاکہ زکوٰۃ کی جو رقم میرے پاس جمع ہو جائے، وہ ان کے سپرد کردوں۔

قاصد کے استقبال کے لئے بستی سے باہر نکلنا

حسبِ وعدہ جب حضرت حارث بن ضرار رضی اللہ عنہ نے ایمان لانے والوں کی زکوٰۃ جمع کرلی، اور وہ مہینہ اور وہ تاریخ جو قاصد بھیجنے کے لئے طے ہوئی تھی گزر گئی، اور آپ کا کوئی قاصد نہ پہنچا تو حضرت حارث رضی اللہ عنہ کو یہ خطرہ پیدا ہوا کہ شاید حضورِ اقدس ﷺ ہم سے کسی بات پر ناراض ہیں، ورنہ یہ ممکن نہیں تھا کہ آپ وعدے کے مطابق اپنا آدمی نہ بھیجتے۔ حضرت حارث رضی اللہ عنہ نے اس خطرہ کا ذکر اسلام قبول کرنے والوں کے سرداروں سے کیا، اور ارادہ کیا کہ یہ سب حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں۔ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ قبیلہ ''بنو مصطلق'' کے لوگوں کو یہ معلوم تھا کہ فلاں تاریخ کو حضور ﷺ کا قاصد آئے گا، اس لئے اس تاریخ کو یہ حضرات تعظیماً بستی سے باہر نکلے کہ قاصد کا استقبال کریں۔

حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کا واپس جانا

دوسری طرف یہ واقعہ ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے مقررہ تاریخ پر حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو اپنا قاصد بنا کر زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے بھیج دیا تھا، مگر حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو راستے میں یہ خیال آیا کہ اس قبیلے کے لوگوں سے میری پرانی دشمنی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ مجھے قتل کر ڈالیں۔ چونکہ وہ لوگ ان کے استقبال کے لئے بستی سے باہر بھی نکلے تھے، اس لئے حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو اور زیادہ یقین ہو گیا کہ یہ لوگ شاید پرانی دشمنی کی وجہ سے مجھے قتل کرنے آئے ہیں، چنانچہ آپ راستے ہی سے واپس ہو گئے، اور حضورِ اقدس ﷺ سے جا کر کہا کہ ان لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا ہے، اور میرے قتل کا ارادہ کیا، اس لئے میں واپس چلا آیا۔

تحقیق کرنے پر حقیقت واضح ہوئی

حضورِ اقدس ﷺ کو یہ سن کر غصہ آیا، اور آپ نے مجاہدین کا ایک لشکر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں روانہ کیا۔ ادھر سے مجاہدین کا لشکر روانہ ہوا، ادھر حضرت حارث بن ضرار رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضری کے لئے روانہ ہوئے۔ جب آمنا سامنا ہوا تو حضرت حارث رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ آپ لوگ ہمارے اوپر کیوں چڑھائی کرنے آئے ہو۔ اس لئے کہ حضورِ اقدس ﷺ سے ہماری بات یہ ہوئی تھی کہ تم میں سے کوئی شخص زکوۃ وصول کرنے کے لئے آئے گا۔ لشکر والوں نے جواب دیا کہ زکوۃ وصول کرنے کے لئے ایک شخص آیا تھا، لیکن آپ لوگوں نے اس پر حملہ کرنے کے لئے لشکر اکٹھا کرلیا۔ بنو المصطلق کے لوگوں نے جواب دیا کہ ہمارے پاس کوئی آدمی نہیں آیا، اور نہ ہم نے لشکر اکٹھا کیا، بلکہ ہم لوگ اس خیال میں تھے کہ حضورِ اقدس ﷺ کا قاصد آنے والا ہے، اس لئے ہم لوگ روزانہ استقبال کرنے کے ارادے سے باہر نکل کر جمع ہوجاتے تھے۔ تب حقیقتِ حال کھلی، اور پھر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے واپس آکر حضورِ اقدس ﷺ کو سارا واقعہ سنایا کہ یہ غلط فہمی ہوئی تھی، جس کی وجہ سے یہ سارا قصہ ہوا۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (۱)

سنی سنائی بات پر یقین نہیں کرنا چاہئے

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ اے ایمان والو! جب تمہارے پاس کوئی غیر ذمہ دار آدمی کوئی خبر لے کر آئے تو پہلے اس کی تحقیق کرو، تحقیق کے بغیر اس خبر کی بنیاد پر کوئی کاروائی نہ کرو۔ اس واقعہ میں ساری غلط فہمی جو پیدا ہوئی، اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو کسی نے آکر بتادیا ہوگا کہ یہ لوگ تم سے لڑنے کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں، اس لئے وہ راستے ہی سے واپس آگئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس میں ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کو یہ ہدایت دیدی کہ ایسا نہ ہو کہ جو بات کسی سے سن لی، بس اس پر یقین کرلیا، اور اس بات کو آگے چلتا کردیا، اور اس خبر کی بنیاد پر کوئی کاروائی شروع کردی، ایسا کرنا حرام ہے۔

افواہ پھیلانا حرام ہے

اس کو آج کل کی اصطلاح میں ''افواہ سازی'' کہتے ہیں، یعنی افواہیں پھیلانا۔ افسوس یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں یہ برائی اس طرح پھیل گئی ہے کہ ''الامان الحفیظ''۔ کسی بات کو آگے نقل

---

(۱) تفسیر ابن کثیر (٤/ ٢٦٥-٢٦٦)

کرنے میں، بیان کرنے میں احتیاط اور تحقیق کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہا۔ بس کوئی اُڑتی ہوئی بات کان میں پڑ گئی، اس کو فوراً آگے چلتا کر دیا۔ خاص طور پر اگر کسی سے مخالفت ہو، کسی سے دشمنی ہو، کسی سے سیاسی یا مذہبی مخالفت ہو، یا ذاتی مخالفت ہو تو اگر اس کے بارے میں ذرا سی بھی کہیں سے کان میں کوئی بھنک پڑ جائے گی، تو اس پر یقین کر کے لوگوں کے اندر اس کو پھیلانا شروع کر دیں گے۔

آج کل کی سیاست

آج کل سیاست کے میدان میں جو گندگی ہے، اس گندی سیاست میں یہ صورتِ حال ہو رہی ہے کہ اگر سیاست میں ہمارا کوئی مد مقابل ہے تو اس کے بارے میں افواہ گھڑنا اور اس کو بغیر تحقیق کے آگے چلتا کر دینا، اس کا آج کل عام رواج ہو رہا ہے۔ مثلاً یہ کہ فلاں شخص نے اتنے لاکھ روپے لے کر اپنا ضمیر بیچا ہے، بغیر تحقیق کے الزام عائد کر دیا۔ یاد رکھئے! کوئی شخص کتنا ہی برا کیوں نہ ہو، لیکن اس پر جھوٹا الزام عائد کرنے کا کوئی جواز نہیں، شرعاً ایسا کرنا حرام ہے۔

حجاج بن یوسف کی غیبت جائز نہیں

ایک مجلس میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما تشریف فرما تھے، کسی شخص نے اس مجلس میں حجاج بن یوسف کی برائی شروع کر دی۔ حجاج بن یوسف ایک ظالم حکمران کے طور پر مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے سینکڑوں بڑے بڑے علماء کو قتل کیا۔ کسی شخص نے اس مجلس میں حجاج بن یوسف پر الزام عائد کیا کہ اس نے یہ کیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ سوچ سمجھ کر بات کرو، یہ مت سمجھنا کہ اگر حجاج بن یوسف ظالم و جابر ہے تو اس کی غیبت کرنا حلال ہو گیا، یا اس پر بہتان باندھنا حلال ہو گیا۔ اگر اللہ تعالیٰ حجاج بن یوسف سے سینکڑوں انسانوں کے خون کا بدلہ لے گا جو اس کی گردن پر ہیں تو تم سے بھی اس کا بدلہ لے گا کہ تم نے اس کے بارے میں جھوٹی بات کہی۔ یہ مت سمجھنا کہ اگر وہ ظالم ہے تو جو چاہو اس کے بارے میں جھوٹ بولتے رہو، اس پر جو چاہو الزام تراشی کرتے رہو، تمہارے لئے یہ حلال نہیں۔

سنی ہوئی بات آگے پھیلانا جھوٹ میں داخل ہے

بہر حال! کسی بھی شخص کے بارے میں کوئی بات بغیر تحقیق کے کہہ دینا یہ اتنی بڑی بیماری ہے جس سے پورے معاشرے میں بگاڑ اور فساد پھیلتا ہے، دشمنیاں جنم لیتی ہیں، عداوتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے قرآن کریم یہ کہہ رہا ہے کہ جب بھی تمہیں کوئی خبر ملے تو پہلے اس خبر کی تحقیق کر لو۔ ایک

حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ))(۱)

یعنی انسان کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ جو بات سنے اس کو آگے بیان کرنا شروع کر دے۔ لہٰذا جو آدمی ہر سنی سنائی بات کو بغیر تحقیق کے آگے بیان کرنے لگے تو وہ بھی جھوٹا ہے، اس کو جھوٹ بولنے کا گناہ ہوگا۔ جب تک تحقیق نہ کرلو، بات کو آگے بیان نہ کرو۔

پہلے تحقیق کرو، پھر زبان سے نکالو

افسوس یہ ہے کہ آج ہمارا معاشرہ اس گناہ کے اندر ڈوبا ہوا ہے۔ ایک شخص کی بات آگے نقل کرنے میں کوئی احتیاط نہیں، بلکہ اپنی طرف سے اس میں نمک مرچ لگا کے اضافہ کر کے اس کو آگے بڑھا دیا۔ دوسرے شخص نے جب سنا تو اس نے اپنی طرف سے اور اضافہ کر کے آگے چلتا کر دیا۔ بات ذرا سی تھی، مگر وہ پھیلتے پھیلتے کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ اس کے نتیجے میں دشمنیاں، عداوتیں، لڑائیاں، قتل و غارت گری اور نفرتیں پھیل رہی ہیں۔ بہر حال! قرآن کریم ہمیں یہ سبق دے رہا ہے کہ یہ زبان جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں دی ہے، یہ اس لئے نہیں دی کہ اس کے ذریعہ تم جھوٹی افواہیں پھیلاؤ، اس لئے نہیں دی کہ اس کے ذریعہ تم لوگوں پر الزام اور بہتان عائد کیا کرو، بلکہ تمہارا فرض ہے کہ جب تک کسی بات کی مکمل تحقیق نہ ہو جائے، اس کو زبان سے نہ نکالو۔ افسوس ہے کہ آج ہم لوگ باری تعالیٰ کے اس حکم کو فراموش کیے ہوئے ہیں، اور اس کے نتیجے میں ہم طرح طرح کی مصیبتوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں اس برائی سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔

افواہوں پر کان نہ دھریں

انسانوں کے کانوں میں مختلف اوقات میں مختلف باتیں پڑتی رہتی ہیں، کسی نے آکر کوئی خبر دیدی، کسی نے کوئی خبر سنا دی، کسی نے کچھ کہہ دیا، اگر آدمی ہر بات کو سچ سمجھ کر اس پر کاروائی کرنا شروع کر دے تو سوائے فتنے کے اور کچھ حاصل نہیں ہوگا، چنانچہ ایک اور موقع پر ایسا ہوا تھا کہ منافقین مختلف قسم کی افواہیں پھیلاتے رہتے تھے، چنانچہ مسلمان سادہ لوحی میں ان کی باتوں کو سچ سمجھ کر کوئی کاروائی شروع کر دیتے تھے، اس پر قرآن کریم کی ایک اور آیت نازل ہوئی، جس میں فرمایا:

---

(۱) صحیح مسلم، المقدمة، باب النهی عن الحدیث بکل ما سمع، رقم: ٦، سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب فی التشدید فی الکذب، رقم: ٤٣٤٠۔

﴿وَإِذَا جَآءَ هُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوْا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ إِلَى الرَّسُوْلِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهُ مِنْهُمْ﴾(۱)

یعنی منافقین کا کام یہ ہے کہ ذرا سی کوئی افواہ کان میں پڑی، چاہے وہ حالتِ امن ہو، یا حالتِ جنگ ہو، بس فوراً اس کی نشر و اشاعت شروع کر دیتے ہیں، اور اپنی طرف سے اس میں نمک مرچ لگا کر اس کو روانہ کر دیتے ہیں، جس سے فتنہ پھیلتا ہے۔ مسلمانوں کو یہ ہدایت کی گئی کہ جب اس قسم کی کوئی خبر آپ تک پہنچے تو اس پر بھروسہ کرنے کے بجائے اللہ کے رسول ﷺ کو اور دوسرے ذمہ دار افراد کو بتاؤ کہ یہ خبر پھیل رہی ہے، اس میں کون سی بات سچ ہے، اور کون سی بات غلط ہے، اس کی تحقیق کریں، اور تحقیق کے بعد کوئی فیصلہ کریں، نہ یہ کہ خود سے اس پر کاروائی شروع کر دیں۔ یہ ایک عظیم ہدایت ہے جو قرآن کریم نے عطا فرمائی ہے۔

جس سے شکایت پہنچی ہو اس سے پوچھ لیں

افسوس یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں اس ہدایت کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں فتنے پھیلے ہوئے ہیں، لڑائیاں ہیں، جھگڑے ہیں، عداوتیں ہیں، بغض اور کینہ ہے، ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی ہے۔ اگر غور کریں تو پتہ چلے گا کہ ان سب کی بنیاد غلط افواہیں ہوتی ہیں۔ خاندان والوں میں یا ملنے جلنے والوں میں سے کسی نے یہ کہہ دیا کہ تمہارے بارے میں فلاں شخص یہ کہہ رہا تھا۔ اب آپ نے اس کی بات سن کر یقین کر لیا کہ اچھا فلاں شخص نے میرے بارے میں یہ کہا ہے۔ اب اس کی بنیاد پر اس کی طرف سے دل میں دشمنی، بغض، کینہ پیدا ہو گیا کہ وہ تو میرے بارے میں یہ کہہ رہا تھا۔ حالانکہ ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ اگر کسی بھائی کی طرف سے شکایت کی کوئی بات پہنچی ہے تو براہِ راست اس سے جا کر پوچھ لے کہ میں نے سنا ہے کہ آپ نے میرے بارے میں یہ بات فرمائی تھی، کیا یہ بات صحیح ہے یا غلط ہے؟ اب صحیح بات کھل کر سامنے آ جائے گی۔

باتوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا

آج کل کے حالات ایسے ہیں کہ لوگ ایک کی بات دوسرے تک پہنچانے میں بالکل احتیاط

(۱) النساء: ۸۳، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اور جب ان کو کوئی بھی خبر پہنچتی ہے، چاہے وہ امن کی ہو یا خوف پیدا کرنے والی، تو یہ لوگ اسے (تحقیق کے بغیر) پھیلانا شروع کر دیتے ہیں۔ اور اگر یہ اس (خبر) کو رسول کے پاس یا اصحابِ اختیار کے پاس لے جاتے تو ان میں سے جو لوگ اس کی کھوج نکالنے والے ہیں وہ اس کی حقیقت معلوم کر لیتے''

سے کام نہیں لیتے۔ اگر ذرا سی بات ہو تو اس کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ اپنی طرف سے اس کے اندر اضافہ اور مبالغہ کر دیتے ہیں۔ میں ایک مثال دیتا ہوں۔ ایک صاحب نے مجھ سے مسئلہ پوچھا کہ ٹیپ ریکارڈر پر قرآن کریم کی تلاوت سننے سے ثواب ملتا ہے یا نہیں؟ میں نے جواب دیا: چونکہ قرآن کریم کے الفاظ پڑھے جا رہے ہیں تو انشاء اللہ، اللہ کی رحمت سے اس کو سننے سے بھی ثواب ملے گا، البتہ براہِ راست پڑھنے اور سننے سے زیادہ ثواب ملے گا۔ اب اس شخص نے جا کر کسی اور کو بتایا ہوگا، دوسرے نے تیسرے کو بتایا ہوگا، تیسرے شخص نے چوتھے کو بتایا ہوگا، یہاں تک نوبت پہنچی کہ ایک دن میرے پاس ایک صاحب کا خط آیا، اس میں لکھا تھا کہ یہاں ہمارے محلّہ میں ایک صاحب تقریر میں یہ بات کہہ رہے ہیں کہ مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے یہ فرمایا ہے کہ ٹیپ ریکارڈر پر تلاوت سننا ایسا ہے جیسے ٹیپ ریکارڈر پر گانا سننا۔ اب آپ اندازہ لگائیں کہ بات کیا تھی، اور ہوتے ہوتے کہاں تک پہنچی، اور پھر برملا تقریر کے اندر یہ بات میری طرف منسوب کر دی کہ میں نے ایسا کہا ہے۔ میں نے جواب میں لکھا کہ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ میں نے یہ بات کہی ہے۔

تُلی ہوئی بات زبان سے نکلے

بہر حال! لوگوں میں بات نقل کرنے میں احتیاط ختم ہو چکی ہے، جبکہ مسلمان کا کام یہ ہے کہ جو بات اس کی زبان سے نکلے وہ ترازو میں تُلی ہوئی ہو، نہ ایک لفظ زیادہ ہو، نہ ایک لفظ کم ہو۔ خاص طور پر اگر آپ دوسرے کی کوئی بات نقل کر رہے ہوں تو اس میں تو اور زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے، اس لئے کہ اگر آپ اس کے اندر اپنی طرف سے کوئی بات بڑھائیں گے تو دوسرے پر بہتان ہوگا، جس میں دوہرا گناہ ہے۔

حضرات محدثین رحمۃ اللہ علیہم کی احتیاط

قرآن کریم یہ کہہ رہا ہے کہ جب تم نے کسی شخص سے کوئی بات سنی ہو، اور حالات ایسے ہیں کہ لوگ بات نقل کرنے میں احتیاط نہیں کر رہے ہیں تو ایسے حالات میں تو بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے، یہ نہ ہو کہ جو بات سنی اس کو آگے چلتا کر دیا۔ حضرات محدثین جنہوں نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث محفوظ کر کے ہم تک پہنچائی ہیں، انہوں نے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات نقل کرنے میں اتنی احتیاط کی ہے کہ اگر ذرا سا بھی الفاظ میں فرق ہو جائے تو روایت نہیں کرتے تھے، بلکہ یہ فرماتے تھے کہ اتنی بات ہمیں یاد ہے، اتنی بات ہمیں یاد نہیں، حالانکہ معنی ایک ہی ہیں، لیکن پھر بھی فرماتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ لفظ کہا تھا، یا یہ لفظ کہا تھا۔

ایک محدث رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

آپ نے سنا ہوگا کہ محدثین رحمہم اللہ جب کوئی حدیث روایت کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ "حَدَّثَنَا فُلَانٌ" یعنی ہمیں فلاں نے یہ حدیث سنائی۔ ایک مرتبہ ایک محدث رحمۃ اللہ جب حدیث بیان کررہے تھے تو "حَدَّثَنَا فُلَانٌ" کے بجائے "ثَنَا فُلَانٌ" کہہ رہے تھے۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت یہ "ثَنَا فُلَانٌ" کا کوئی مطلب اور معنی نہیں ہے، آپ "حَدَّثَنَا فُلَانٌ" کیوں نہیں کہتے؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں جب استاد کے درس میں پہنچا تو اس وقت میں نے استاد کی زبان سے "ثَنَا فُلَانٌ" کا لفظ سنا تھا، شروع کا لفظ "حَدَّ" میں نہیں سن سکا تھا، اس لئے میں "ثَنَا فُلَانٌ" کے الفاظ سے حدیث سنا رہا ہوں۔ حالانکہ یہ بات بالکل یقینی تھی کہ استاد نے "حَدَّثَنَا" ہی کہا تھا، صرف "ثَنَا" نہیں کہا تھا، لیکن چونکہ اپنے کانوں سے صرف "ثَنَا" سنا تھا، "حَدَّ" کا لفظ نہیں سنا تھا، اس لئے جب روایت کرتے تو "حَدَّثَنَا" نہیں کہتے، تاکہ جھوٹ نہ ہو جائے، بس جتنا سنا، اتنا ہی آگے بیان کروں گا۔ اس احتیاط کے ساتھ حضرات محدثین نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ احادیث ہم تک پہنچائی ہیں۔

حدیث کے بارے میں ہمارا حال

آج ہمارا یہ حال ہے کہ نہ صرف عام باتوں میں بلکہ حدیث کی روایت میں بھی احتیاط نہیں کرتے۔ حدیث کے الفاظ کچھ تھے، لیکن لوگ یہ کہہ کر بیان کردیتے ہیں کہ ہم نے یہ سنا ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا، حالانکہ اس حدیث کا کہیں سراغ نہیں ملتا، اور تحقیق کے بغیر آگے بیان کردیتے ہیں۔

حکومت پر بہتان لگانا

آج سیاسی پارٹیوں میں اور مذہبی فرقہ واریوں میں یہ بات عام ہوگئی ہے کہ ایک دوسرے پر بہتان لگانے میں کوئی باک اور ڈر محسوس نہیں کرتے۔ بس ذراسی کوئی بات سنی اور آگے چلتی کردی۔ اگر حکومت سے ناراضگی ہے، اور حکومت کے خلاف چونکہ طبیعت میں اشتعال ہے، لہٰذا اس کے خلاف جو خبر آئے، اس کو آگے پھیلا دو، اس کی تحقیق کی ضرورت نہیں کہ وہ صحیح ہے، یا غلط ہے۔

یاد رکھئے! حکمرانوں کے اندر ہزاروں برائیاں موجود ہوں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم اس پر بہتان لگانا شروع کردو۔ افسوس یہ ہے کہ یہی معاملہ آج حکومت عوام کے ساتھ کررہی ہے۔ حکومت کے ایک بڑے ذمہ دار حکمران، جو پورے ملک کے ذمہ دار ہیں، ان کو لوگوں پر بہتان لگانے میں کوئی

باک محسوس نہیں ہوتی۔

دینی مدارس کے خلاف دہشت گرد ہونے کا پروپیگنڈا

آج پروپیگنڈا ایک مستقل فن اور ہنر بن چکا ہے۔ جرمنی کا ایک سیاسی فلسفی گزرا ہے، اس نے یہ فلسفہ پیش کیا تھا کہ جھوٹ کو اتنی شدت سے پھیلاؤ کہ دنیا اس کو سچ سمجھنے لگے۔ آج دنیا میں سارے پروپیگنڈے کا ہنر اس فلسفے کے گرد گھوم رہا ہے۔ جس پر جو چاہو بہتان لگا کر اس کے بارے میں پروپیگنڈا شروع کردو۔ آج دنیا میں یہ پروپیگنڈا شروع ہوگیا ہے کہ یہ دینی مدارس دہشت گرد ہیں، اور ان میں طلباء کو دہشت گردی کی تربیت دی جاتی ہے، یہاں سے دہشت گرد پیدا ہوتے ہیں۔ آج اس پروپیگنڈے کو تین سال ہوچکے ہیں، اور عوام نہیں، بلکہ حکومت کے ذمہ دار لوگ برملا یہ کہتے ہیں کہ مدارس کے اندر دہشت گردی ہورہی ہے۔ مدارس کے حضرات نے ان سے کئی مرتبہ کہا کہ خدا کے لئے مدارس کے اندر آکر دیکھو، تمہارے پاس ہتھیاروں کو پکڑنے کے حساس ترین آلات موجود ہیں، اور دہشت گردی کے سراغ رسانی کے حساس ترین آلات موجود ہیں، وہ سب استعمال کرکے دیکھو کہ کسی مدرسے میں دہشت گردی کا سراغ ملتا ہے! اگر کسی مدرسے میں سراغ ملے تو ہماری طرف سے کھلی چھوٹ ہے کہ اس کے خلاف کاروائی کریں، اور ہم بھی تمہارے ساتھ اس کے خلاف کاروائی کرنے میں تعاون کریں گے۔ مگر یہ رٹ لگی ہوئی ہے کہ یہ مدارس دہشت گرد ہیں، اور پروپیگنڈے کی بنیاد پر سارے دینی مدارس کو جہاں اللہ اور اللہ کے رسول کے کلام کی تعلیم ہورہی ہے، ان کو دہشت گرد قرار دیدینا، اور مغرب کے پروپیگنڈے کو آگے بڑھانا کہاں کا انصاف اور کہاں کی دیانت ہے؟

دینی مدارس کا معائنہ کرلو

تعلیمی اداروں میں بھی جرائم پیشہ لوگ گھس آتے ہیں، کیا یونیورسٹیوں اور کالجوں میں جرائم پیشہ لوگ نہیں ہوتے؟ ایسی صورت میں ان جرائم پیشہ افراد کے خلاف کاروائی کی جاتی ہے، یہ تو نہیں کہا جاتا کہ ساری یونیورسٹیاں دہشت گرد ہیں، اور سارے کالجز جرائم پیشہ ہیں۔ لیکن چونکہ مغرب کی طرف سے یہ پروپیگنڈا اس اصول کی بنیاد پر ہورہا ہے کہ جھوٹ اس شدت سے پھیلاؤ کہ دنیا اس کو سچ جاننے لگے، آج دینی مدارس اور دہشت گردی کو اس طرح ملادیا گیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے مرادف ہوگئے۔ قرآن کریم کا کہنا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ناواقفیت میں کسی قوم کو خواہ مخواہ نقصان پہنچادو، بعد میں تمہیں شرمندہ ہونا پڑے، اس لئے پہلے تحقیق کرلو۔ تحقیق کرنے کے تمام آلات اور وسائل تمہیں مہیا ہیں، آکر دیکھ لو۔ اور دینی مدارس پر الزام لگانے والے وہ ہیں جنہوں نے آج تک

دینی مدارس کی شکل نہیں دیکھی، آ کر دیکھا نہیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے، وہاں کیا پڑھایا جا رہا ہے؟ کس طرح تعلیم دی جا رہی ہے، لیکن مدارس کے خلاف پروپیگنڈا جاری ہے، اور جو بند ہونے کا نام نہیں لیتا۔

غلط مفروضے قائم کر کے بہتان لگانا

لندن والوں نے کہہ دیا کہ یہاں جو دھماکے ہوئے ہیں، اس میں ایسا شخص ملوث ہے، جس نے یہاں کے مدارس میں کچھ دن قیام کیا تھا۔ ارے بھائی وہ شخص وہیں پلا بڑھا، اور وہیں پر برطانیہ میں کسی دینی مدرسے میں نہیں بلکہ برطانیہ کے ماڈرن تعلیمی ادارے میں تعلیم حاصل کی، اگر مان بھی لیا جائے کہ وہ چند روز کے لئے پاکستان آیا تھا، تو کیا پاکستان آنے سے یہ لازم ہو گیا کہ اس نے ضرور دینی مدارس میں تعلیم حاصل کی ہوگی، اور اس نے یہاں ضرور دہشت گردی کی تربیت پائی ہوگی۔ اس بنیاد پر مفروضے قائم کر لینا، اور اس بنیاد پر یہ نادرشاہی حکم نافذ ہو گیا کہ جتنے غیر ملکی طلباء دینی مدارس میں پڑھتے ہیں، ان کو ملک سے رخصت کر دیا جائے۔

پہلے خبر کی تحقیق کر لو

میرے بھائیو! یہ ہمارے معاشرے کا ایک ایسا مسئلہ ہے کہ عوام ہو، یا حکومت ہو، سیاسی جماعتیں ہو، یا مذہبی فرقہ واریت ہو، سب اس میں مبتلا ہیں کہ ذرا افواہ کی کوئی بات کان میں پڑی، اس پر نہ صرف یہ کہ یقین کر لیا، بلکہ اس کو آگے پھیلایا، اور اس کی بنیاد پر کارروائی شروع کر دی، اور اس کے نتیجے میں ظلم و ستم کی انتہاء کر دی گئی۔ جبکہ قرآن کریم نے اس آیت میں یہ پیغام دیا ہے کہ اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی غیر ذمہ دار شخص کوئی خبر لے کر آتا ہے تو پہلے اس کی تحقیق کر لو، ایسا نہ ہو کہ تم ناواقفیت سے کچھ لوگوں کو نقصان پہنچا دو، بعد میں تم لوگوں کو ندامت اور شرمندگی اُٹھانی پڑے۔ اگر ہم قرآن کریم کے اس حکم کو پلے باندھ لیں، اور زندگی کے ہر گوشے میں اس کو استعمال کریں تو یقیناً ہمارے معاشرے کے نوے فیصد جھگڑے ختم ہو جائیں۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں قرآن کریم کی اس ہدایت کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے، اور اس پر عمل کرنے کی بھی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

حق کی بنیاد پر دوسرے کا ساتھ دو ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِن بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْءَ إِلَى أَمْرِ اللّٰهِ فَإِن فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝﴾(۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! ابھی میں نے آپ حضرات کے سامنے سورۃ حجرات کی دو آیتیں تلاوت کیں۔ سورۃ حجرات کی تفسیر کا سلسلہ پچھلے چند ماہ سے چل رہا ہے۔ درمیان میں وقتی مسائل کی وجہ سے یہ سلسلہ منقطع ہوگیا تھا۔ دو آتیں میں نے تلاوت کیں، پہلے ان کا ترجمہ عرض کرتا ہوں، اس کے بعد اس کی تھوڑی سی تشریح عرض کروں گا۔ اللہ تعالیٰ اپنی رضا کے مطابق بیان کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اگر مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان لڑائی ہوجائے تو دوسرے مسلمانوں کو یہ حکم ہے کہ وہ ان کے درمیان صلح کرائیں۔ یعنی ایسی صورت میں جب مسلمانوں کے دو گروہ باہم ٹکرا گئے ہوں، اور ان کے درمیان لڑائی شروع ہوگئی ہو تو پہلا کام جو دوسرے مسلمانوں کے ذمہ ضروری ہوتا ہے، وہ یہ کہ ان دونوں گروہوں کے درمیان بیچ بچاؤ کرا کر صلح کرائے، اور حتی الامکان ان کو لڑائی سے بچانے کی کوشش کرے۔ اگر اس طرح کام چل جائے تو بہت اچھا ہے، مقصود حاصل ہے۔

ورنہ مظلوم کا ساتھ دو

آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْءَ إِلَى أَمْرِ اللّٰهِ﴾(۲)

☆ اصلاحی خطبات (۱٦/ ۳۰۸ تا ۳۱۸)، بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) الحجرات: ۹-۱۰ (۲) الحجرات: ۹

یعنی اگر کہنے سننے سے لڑائی بند نہ ہو، اور صلح کی کوئی صورت نظر نہ آرہی ہو تو پھر اس وقت یہ دیکھو کہ ان میں سے کون مظلوم ہے اور کون ظالم ہے؟ کون زیادتی کر رہا ہے اور کون زیادتی کا شکار ہو رہا ہے؟ اگر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان میں سے ایک گروہ زیادتی کر رہا ہے، اور ظلم کا ارتکاب کر رہا ہے تو ایسی صورت میں تمہارا فرض ہے کہ مظلوم کا ساتھ دو، اور ظالم کے خلاف تم بھی قتال کرو، اور اس سے لڑائی کرو۔ یعنی جب صلح کی کوشش کارگر نہ ہو تو ہر مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ ظالم کا ہاتھ پکڑے، اور مظلوم کا ساتھ دے، اور اس وقت تک ظالم سے لڑتے رہو جب تک وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ کر نہ آجائے۔

نسل یا زبان کی بنیاد پر ساتھ مت دو

یہاں پر دو باتیں احادیث کی روشنی میں سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن کریم نے سارا دارومدار اس پر رکھا ہے کہ یہ دیکھو کہ کون برحق ہے، اور کون ناحق ہے، اور کون ظالم ہے، کون مظلوم ہے۔ اس بنیاد پر کسی کا ساتھ مت دو کہ یہ میرا ہم وطن ہے، یا میرا ہم زبان ہے، یا میری جماعت سے تعلق رکھتا ہے، اس بنیاد پر ساتھ مت دو، بلکہ ساتھ دینا ہو، یا لڑائی کرنی ہو، یہ دونوں اس بنیاد پر ہونے چاہئیں کہ کون ظالم ہے، اور کون مظلوم ہے۔ زمانۂ جاہلیت سے ذہنوں میں جو تصور چلا آتا ہے، اور افسوس یہ ہے کہ وہ آج بھی مسلمانوں کے درمیان موجود ہے، وہ یہ کہ جو شخص میرے قبیلے کا ہے، وہ میرا ہے، جو میری زبان بولتا ہے، وہ میرا ہے، مجھے ہر قیمت پر اس کا ساتھ دینا ہے، یہ دیکھے بغیر کہ ظالم ہے، یا مظلوم ہے، وہ حق پر ہے، یا ناحق ہے، یہ تصور جاہلیت کا تصور ہے، جس کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا کہ میں نے آج اس تصور کو اپنے پاؤں کے نیچے روند دیا ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ آج بھی ہماری صفوں میں یہ صورتِ حال موجود ہے کہ لوگوں نے اپنی زبان کے اعتبار سے، اپنی نسل کے اعتبار سے، اور اپنے وطن کے اعتبار سے گروہ بنائے ہوئے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں ہر قیمت پر اس کا ساتھ دینا ہے۔

ایسے معاہدے کی اجازت نہیں

ایک حدیث میں جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:

((لَا حِلْفَ فِي الْإِسْلَامِ))[1]

یعنی زمانہ جاہلیت میں مختلف قبائل کے درمیان جو معاہدے ہوتے تھے کہ ہم ہر قیمت پر تمہارا

(۱) صحیح البخاری، کتاب الحوالات، باب قول اللہ تعالی والذین عاقدت أیمانکم فآتوهم، رقم: ۲۱۳۰، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب مؤاخاة النبی بین أصحابه، رقم: ٤٥٩٣، سنن أبی داؤد، کتاب الفرائض، باب فی الحلف، رقم: ۲۵۳٦، مسند أحمد، رقم: ۱۵٦۷۔

ساتھ دیں گے، اسلام میں ایسے معاہدوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ ایک مؤمن کا کام یہ ہے کہ وہ حق اور ناحق کو دیکھے، اور ظالم اور مظلوم کو پہچانے۔ اگر تم دیکھو کہ مسلمان ظلم کر رہا ہے تو تمہارا فرض ہے کہ اس ظلم سے اس کا ہاتھ روکنے کی کوشش کرو۔

ظالم کو ظلم سے روکو

ایک طرف تو یہ اصول بیان فرمایا کہ ظالم کا ساتھ مت دو، بلکہ مظلوم کا ساتھ دو، چاہے وہ ظالم تمہارے قبیلے کا ہو، تمہارے وطن کا ہو، تمہاری زبان بولنے والا ہو۔ لیکن یہ اصول بیان کرنے کے بعد ایک دن حضور ﷺ نے یہ عجیب جملہ ارشاد فرمایا:

((أُنْصُرْ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُوْمًا))(۱)

اپنے بھائی کی مدد کرو، اگر ظالم ہو تب بھی مدد کرو، اگر مظلوم ہو تب بھی مدد کرو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہ سن کر بڑے حیران ہوئے، اور سوال کیا کہ یا رسول اللہ! مظلوم کی مدد کرنا تو سمجھ میں آتا ہے کہ مظلوم کی مدد کریں، لیکن ظالم کی مدد کا کیا مطلب ہے؟ حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روکو۔

چونکہ وہ ظلم کرنے کی وجہ سے جہنم کی طرف جا رہا ہے، اپنی آخرت برباد کر رہا ہے، اللہ تعالیٰ کا غضب اپنے سر لے رہا ہے۔ اب اس کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روکو، اور اس کو یہ بتاؤ کہ تم جس راستے کی طرف جا رہے ہو، یہ ظلم کا راستہ ہے، اور دوزخ کا راستہ ہے، اس سے بچو۔ اصل مدد یہی ہے کہ انسان کو جہنم میں جانے سے روکا جائے، اللہ کے عذاب اور غضب سے روکا جائے۔

دونوں کے درمیان صلح کرادو

اس آیت کریمہ نے جو اصول بیان فرمایا، وہ یہ ہے کہ انسان یہ دیکھے کہ کون ظالم ہے، اور کون مظلوم ہے، اور اگر ظالم اپنے ظلم سے باز نہیں آتا تو تمہارا فرض ہے کہ اس سے لڑو، یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ آگے فرمایا کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف لوٹ آئے، یعنی تمہاری بات مان کر ظلم چھوڑ دے تو اس صورت میں ان دونوں فریقوں کے درمیان صلح کراؤ۔ جب

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب المظالم والغضب، باب أعن أخاك ظالمًا أو مظلومًا، رقم: ۲۲۶۳، صحیح مسلم، کتاب البر واصلة والآداب، باب نصر الأخ ظالمًا أو مظلومًا، رقم: ٤٦٨١، سنن الترمذی، کتاب الفتن عن رسول الله، باب ما جاء فی النهی عن سب الریاح، رقم: ۲۱۸۱، مسند أحمد، رقم: ۱۱۵۱۱

ظالم نے ہتھیار تو ڈال دیئے اور ظلم سے تو باز آ گیا، لیکن دونوں فریقوں کے دلوں میں ابھی تک کدورت باقی ہے، اس کدورت کو دور کرنے کے لئے انصاف کے ساتھ ان کے درمیان مصالحت کرادو۔ اس لئے کہ جب دو فریقوں میں لڑائی ہوتی ہے، اور دونوں ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار ہو جاتے ہیں تو اگرچہ مجموعی طور پر ایک گروہ برحق ہوتا ہے، اور دوسرا ناحق ہوتا ہے، لیکن لڑائی کے وقت دونوں کی طرف سے کچھ نہ کچھ زیادتیاں ہو جاتی ہیں، اس لئے کہ مثل مشہور ہے کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ جو شخص مظلوم ہے اس کی طرف سے بھی کوئی نہ کوئی غلطی ضرور ہوئی ہوگی، جس کی وجہ سے لڑائی تک نوبت پہنچ گئی۔ لہٰذا جب ظالم اپنے ظلم سے باز آ گیا تو اب ہر ایک فریق کو انصاف کے ساتھ اس کی غلطی بتانے کی کوشش کرو کہ تمہارا یہ موقف درست تھا، لیکن فلاں بات غلط تھی، آئندہ کے لئے فلاں بات سے پرہیز کرنا، اس لئے آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ صلح کرانے میں انصاف سے کام لو، بیشک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ یہ اصول تو پہلی آیت میں بیان فرما دیا۔

اسلامی اخوت کی بنیاد ایمان پر ہے

اس کے بعد اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس سے بڑا اصول بیان فرمایا:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾

سارے مؤمن آپس میں بھائی بھائی ہیں، جو شخص بھی اللہ پر اور اللہ کے رسول محمد ﷺ پر ایمان رکھتا ہے، اللہ کی کتابوں پر، اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے، وہ تمہارا بھائی ہے۔ اس کے ذریعے یہ اصول بتا دیا کہ اسلام میں جو اخوت اور بھائی چارہ ہے، وہ درحقیقت ایمان اور عقیدے کی بنیاد پر ہے، رنگ، نسل، وطن، قبیلے اور برادری کی بنیاد پر نہیں۔ حضورِ اقدس ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر یہ اعلان فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کی نخوتیں اور فخر و غرور کے سامان سب ختم کر دیئے" اور فرمایا:

((لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ وَلَا لِأَبْيَضَ عَلٰى أَسْوَدَ إِلَّا بِالتَّقْوٰى))[۱]

کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فوقیت نہیں ہے، نہ کسی گورے کو کسی کالے پر فوقیت حاصل ہے، اگر کسی کو فضیلت ہے تو وہ صرف تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔

جو زیادہ متقی ہے، وہ افضل ہے، چاہے وہ ایک معمولی خاندان سے تعلق رکھتا ہو، اور جو متقی نہیں ہے، وہ دوسروں کے مقابلے میں کمتر ہے، چاہے بظاہر دیکھنے میں اس کی شان و شوکت زیادہ نظر آتی ہو۔ یہ اصول بیان فرما دیا۔

---

(۱) مسند أحمد بن حنبل، رقم: ۲۲۳۹۱

مسلمان کو بے یار ومددگار مت چھوڑو

جب یہ اصول بیان فرمادیا کہ سارے مسلمان بھائی بھائی ہیں، تو اس اصول کا نتیجہ خود حضور ﷺ نے بیان فرمایا:

((إِنَّ الْمُسْلِمَ أَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يُسْلِمُهُ))(۱)

یعنی ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، لہٰذا ایک مسلمان نہ تو دوسرے مسلمان بھائی پر ظلم کرے گا، اور نہ اس کو بے یار ومددگار چھوڑے گا، یعنی اگر اس پر ظلم اور زیادتی ہو رہی ہو گی تو مسلمان کا یہ کام نہیں کہ وہ اس کو ظالم کے رحم وکرم پر چھوڑ دے، بلکہ تمہارا فرض ہے کہ اس کا ساتھ دو، اس کی مدد کرو۔ یہ محض اخلاقی ہدایت نہیں، بلکہ تمہارا دینی فریضہ ہے کہ جب تک تمہاری استطاعت میں ہے، اس کو ظلم سے بچاؤ۔

دولت مند معاشرے کا حال

آج ہمارے معاشرے میں یہ منظر نظر آتا ہے کہ جو غریب قسم کے لوگ ہیں، وہ تو ایک دوسرے کی مدد کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، لیکن دولت مند معاشرے میں یہ منظر نظر آتا ہے کہ کسی کو اس کی پرواہ ہی نہیں ہے کہ میرے پڑوسی کا کیا حال بن رہا ہے، اس کے اوپر کیا گزر رہی ہے، بلکہ ہر شخص اپنے حال میں مگن ہے۔ ایک مرتبہ میں نے خود یہ منظر دیکھا کہ ایک کار نے ایک آدمی کو ٹکر ماردی، وہ شخص سڑک پر گر گیا، اور وہ کار والا مارتا ہوا نکل گیا۔ اس کار والے نے یہ نہیں سوچا کہ یہ مجھ سے زیادتی ہوئی ہے تو میرا فرض بنتا ہے کہ میں اس کو کچھ طبی امداد پہنچاؤں۔ نبی کریم ﷺ فرمار ہے ہیں کہ ایک مؤمن کا یہ کام نہیں کہ وہ دوسرے مؤمن کو بے یار ومددگار چھوڑ کر اس طرح چلا جائے، بلکہ جہاں موقع ہو، اور جتنی استطاعت ہو، وہ دوسرے مؤمن کی مدد کرے۔

بہر حال! اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ" یعنی سارے مؤمن آپس میں بھائی بھائی ہیں، چاہے وہ تمہاری زبان نہ بولتا ہو، چاہے وہ تمہاری نسل سے تعلق نہ رکھتا ہو، لیکن اگر وہ مؤمن ہے تو تمہارا بھائی ہے۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب المظالم والغضب، باب لا یظلم المسلم المسلم ولا یسلمه، رقم: ۲۲٦۲، صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب تحریم ظلم المسلم...... الخ، رقم: ٤٦٥٠، سنن الترمذی، کتاب الحدود عن رسول الله، باب ما جاء فی الستر علی المسلم، رقم: ١٣٤٦، سنن أبی داود، کتاب الأدب، باب المؤاخاة، رقم: ٤٢٤٨، مسند أحمد، رقم: ٥١٠٣

کلمہ ”لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ“ کا رشتہ

اللہ تعالیٰ نے یہ ”لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ“ کا رشتہ ایسا مضبوط بنایا ہے کہ یہ کسی زبان کا محتاج نہیں۔ مجھے وہ منظر کبھی نہیں بھولتا کہ آج سے تقریباً پندرہ بیس سال پہلے میرا چین جانا ہوا، اور اس زمانے میں چین کے اندر باہر کے لوگوں کے آنے کا سلسلہ نیا نیا شروع ہوا تھا، اب بھی وہاں بہت بڑی تعداد میں مسلمان آباد ہیں۔ مسلمانوں کے ایک علاقے میں میرا جانے کا اتفاق ہوا، اس وقت وہاں برف باری ہو رہی تھی، اور درجہ حرارت منفی ۱۶ ڈگری تھا، فجر کے وقت ہمیں ایک علاقے سے گزرنا تھا، جہاں مسلمانوں کی آبادی تھی، اس علاقے کے مسلمانوں کو یہ اطلاع ملی تھی کہ پاکستان کے مسلمانوں کا ایک وفد آرہا ہے، چنانچہ وہ لوگ کئی گھنٹے پہلے سے پہاڑی کے درمیان برف باری کے اندر صرف باہر کے مسلمانوں کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے کھڑے ہوگئے۔ جب ہمارا قافلہ ان کے قریب سے گزرا تو ان کی زبان پر صرف ایک نعرہ تھا ”السلام علیکم“ اور سلام کرتے ہی ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، اس لئے کہ زندگی میں پہلی مرتبہ انہوں نے اپنے وطن سے باہر کے کسی مسلمان کی شکل دیکھی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ نہ ہم ان کی زبان جانتے ہیں، نہ ان سے بات کر سکتے ہیں، نہ یہ ہماری بات سمجھیں گے، اور نہ ہم ان کی بات سمجھیں گے، خاندانی اعتبار سے، نسلی اعتبار سے، زبان کے اعتبار سے ان کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں تھا، لیکن دل میں محبت کے دریا صرف اس لئے موجزن تھے کہ ”لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ“ پڑھنے والے تھے، ”إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ إِخْوَةٌ“ کا منظر اللہ تعالیٰ نے وہاں دکھادیا۔

قرآنی تعلیمات سے دوری کا نتیجہ

اگر دماغ میں یہ بات بیٹھ جائے کہ ہر مسلمان ہمارا بھائی ہے تو نہ جانے کتنے جھگڑے، کتنے فساد، کتنے قتل و قتال ختم ہو جائیں۔ افسوس یہ ہے کہ آج یہ سبق ہم لوگ بھولتے جا رہے ہیں۔ آج مسلمان مسلمان کا گلا کاٹ رہا ہے۔ آج مسلمان، مسلمان کے خلاف صف آرا ہے۔ آج مسلمان مسلمان کو قتل کرنے کی فکر میں ہے۔ مذہب کے نام پر، دین کے نام پر، عبادت کے نام پر یہ سب کام ہو رہے ہیں۔ عبادت گاہیں تک محفوظ نہیں رہیں، ان پر بھی حملے کیے جا رہے ہیں۔ یہ سارا فساد اس بات کا ہے کہ آج ہم قرآن کریم کی تعلیمات سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

مسلمان کو قتل کرنے کی سزا

آج ہم نے معمول کی چند عبادات کا نام دین رکھ لیا، لیکن دین کی وسیع تعلیمات جو قرآن کریم ہمیں بتلا رہا ہے، ان سے نہ صرف ہم غافل ہیں، بلکہ ان کو دین کا حصہ سمجھنے کے لئے بھی تیار نہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا:

﴿مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَآءُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا﴾(۱)

یعنی جو شخص کسی مؤمن کو جان بوجھ کر قتل کرے، اس کی سزا جہنم ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا﴾(۲)

یعنی اگر کوئی شخص کسی ایک آدمی کو قتل کردے، بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو، یا اس نے زمین میں فساد پھیلایا ہو، تو وہ شخص ایسا ہے جیسے اس نے سارے انسانوں کو قتل کردیا۔ جس دین میں ایسی ہدایات موجود ہیں، اس دین کے نام لیوا، اور اس دین کے پیروکار ایک دوسرے کے قتل و قتال میں ملوث ہوں، یہ اتنا بڑا وبال ہے جو ہمارے اوپر مسلط ہوگیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں اس سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

اس وقت کسی کا ساتھ مت دو

ایک آخری بات اسی سلسلے میں یہ عرض کرنی ہے کہ ان آیاتِ کریمہ میں یہ جو حکم دیا گیا ہے کہ ظالم کا ساتھ نہ دو، بلکہ مظلوم کا ساتھ دو، یہ حکم اس وقت ہے جبکہ واضح طور پر پتہ چل جائے کہ یہ شخص حق پر ہے، دوسرا ناحق ہے، اس وقت تو فرض بنتا ہے کہ حق والے کا ساتھ دیا جائے، لیکن بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ جہاں حق واضح نہیں ہوتا، مثلاً دو گروہ آپس میں لڑ رہے ہیں، اور یہ پتہ نہیں چل رہا ہے کہ کون حق پر ہے، اور کون باطل پر ہے، ایسی صورت کے بارے میں خود نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ دو فریق آپس میں لڑ رہے ہوں گے، اور دونوں مسلمان کہلائیں گے، اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگا کہ کون حق پر ہے، اور کون باطل پر ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ لوگ اندھے جھنڈے کے تحت لڑ رہے ہوں گے۔ ایسے وقت کے لئے آپ نے یہ ہدایت دی:

---

(۱) النساء: ۹۳

(۲) المائدہ: ۳۲

((فاعتزل تلك الفرق كلها))[1]

تم اس وقت ان سب سے کنارہ کشی اختیار کرلو، اور کسی کا ساتھ نہ دو، نہ کسی کی حمایت کرو، نہ کسی کی مخالفت کرو، بس خاموش ہوکر اپنے کام سے کام رکھو۔ اس لئے کہ اگر تم کسی کا ساتھ دو گے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی مظلوم پر تمہاری طرف سے ظلم ہوجائے۔ بہر حال! حضورِ اقدس ﷺ نے ایسی صورت میں علیحدہ رہنے کا حکم دیا ہے، اور ایسی صورت کو ''فتنہ'' سے تعبیر کیا ہے۔

فتنہ کے وقت اپنے گھر میں بیٹھ جاؤ

''فتنہ'' اسی کا نام ہے کہ انسان پر حق واضح نہ ہو، یہ پتہ نہ ہو کہ کون حق پر ہے اور کون باطل ہے۔ اگر حق واضح ہوجائے تو وہ فتنہ نہیں، لیکن اگر حق واضح نہیں ہو رہا ہے تو وہ ''فتنہ'' ہے، اور فتنہ سے حضورِ اقدس ﷺ نے الگ رہنے کا حکم دیا ہے، بلکہ یہاں تک آپ نے فرمایا کہ ''اپنے گھر میں چپ چاپ بیٹھ جاؤ، اور باہر نکل کر لڑنے والے گروہوں کو دیکھو تک نہیں'' اس لئے کہ فتنہ ایسی چیز ہے کہ اگر تم اس کی طرف دیکھو گے تو وہ فتنہ تمہیں اُچک لے گا، اس لئے اس سے دور رہو۔ ہمارے یہاں بہت سی لڑائیاں، بہت سے جھگڑے، خاص طور پر سیاسی نوعیت کے جھگڑے ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں عام طور پر یہ صورتِ حال پیدا ہوجاتی ہے۔ ایسی صورت میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد یہی ہے کہ آدمی اس سے کنارکش رہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو ان احکام اور تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

(۱) صحيح البخاری، كتاب المناقب، باب علامات النبوة فی الإسلام، رقم: ۳۳۳۸، صحيح مسلم، كتاب الامارة، باب وجوب ملازمة جماعة المسلمين عند ظهور الفتن، رقم: ۳٤۳٤، سنن ابن ماجه، كتاب الفتن، باب العزلة، رقم: ۳۹٦۹

حقوق العباد سے توبہ کا طریقہ ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ، وَعَلٰى آلِهِ وَاَصْحَابِهِ اَجْمَعِيْنَ اَمَّا بَعْدُ!

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''اعمالِ صالحہ یا توبہ سے گناہ معاف ہوجاتے ہیں مگر حقوق معاف نہیں ہوتے، پس جس قدر ہوسکے ادا کرے اور سب کے ادا کا عزم رکھے۔ اگر کچھ باقی رہ گئے اور مر گیا تو اللہ تعالیٰ سے اُمید ہے کہ اس کو بری الذمہ کردیں گے یعنی اللہ تعالیٰ مظلوم کو خوش کر کے ظالم کی مغفرت فرمادیں گے''(۱)

گناہِ صغیرہ سے معافی کا طریقہ

اس ملفوظ میں حضرت والا نے پہلی بات تو یہ بیان فرمائی کہ اعمالِ صالحہ یعنی نیک اعمال سے گناہ معاف ہوتے ہیں اور توبہ سے بھی گناہ معاف ہوتے ہیں۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ نیک اعمال سے صرف گناہِ صغیرہ معاف ہوتے ہیں اور توبہ سے کبیرہ گناہ بھی معاف ہوجاتے ہیں۔ گناہِ صغیرہ کا معاملہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نیکیوں کی بدولت خود بخود ان کو معاف فرماتے رہتے ہیں، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ جب آدمی وضو کرتا ہے تو وضو کے دوران جب وہ ہاتھ دھوتا ہے تو ہاتھ سے کیے ہوئے گناہ معاف ہوجاتے ہیں، جب چہرہ دھوتا ہے تو آنکھوں کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں، جب پاؤں دھوتا ہے تو پاؤں سے چل کر جس گناہ کی طرف گیا تھا، وہ گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ لیکن ان احادیث میں گناہوں سے مراد صغیرہ گناہ ہیں جو اللہ تعالیٰ اس طرح معاف فرماتے رہتے ہیں۔

عبادات سے گناہِ صغیرہ معاف ہوجاتے ہیں

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب آدمی نماز کے لئے مسجد کی طرف چلتا ہے تو ہر ہر قدم پر

☆ اصلاحی مجالس (۶/۵۲ تا ۷۰)، بعد از نمازِ ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دارالعلوم کراچی۔

(۱) انفاسِ عیسیٰ، ص: ۱۹۸

اللہ تعالیٰ گناہ معاف فرماتے ہیں۔ اس سے بھی مراد صغیرہ گناہ ہیں۔ اسی طرح نماز پڑھنے سے بھی صغیرہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ ایک صحابی حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! مجھ سے بڑی سخت غلطی ہوگئی ہے، پھر ایک گناہِ صغیرہ کو بیان کیا کہ مجھ سے یہ گناہ ہو گیا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس سے فرمایا کہ کیا تم نے اس گناہ کے بعد ہمارے ساتھ مسجد میں نماز نہیں پڑھی؟ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! نماز تو پڑھی ہے۔ فرمایا کہ بس تمہارا وہ گناہ اس نماز پڑھنے سے معاف ہو گیا۔ پھر آپ ﷺ نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾(۱)

''نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں''(۲)

جب انسان کوئی نیکی کرتا ہے تو اس کے صغیرہ گناہ معاف ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کا یہ خودکار نظام بنا دیا ہے کہ صغیرہ گناہ خود بخود معاف ہوتے چلے جاتے ہیں، مگر یہ سب صغیرہ گناہوں کے بارے میں ہے۔

گناہِ کبیرہ کے لئے توبہ ضروری ہے

کبیرہ گناہ کے بارے میں قانون یہ ہے کہ وہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے، یوں اللہ تعالیٰ کسی پر اپنا فضل فرما دیں اور بغیر توبہ کے معاف فرما دیں تو ان کو کون روکنے والا ہے لیکن قانون اور اصول یہ ہے کہ کبیرہ گناہ بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے۔ اس ملفوظ میں حضرت والا نے یہ جو فرمایا کہ اعمالِ صالحہ یا توبہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ اعمالِ صالحہ سے صغیرہ گناہ اور توبہ سے کبیرہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

حقوق العباد اور بعض حقوق اللہ محض توبہ سے معاف نہیں ہوتے

آگے فرمایا کہ ''مگر حقوق معاف نہیں ہوتے''، حقوق سے ایک تو حقوق العباد مراد ہیں اور

(۱) هود: ۱۱٤

(۲) صحيح البخاری، كتاب مواقيت الصلاة، باب الصلاة كفارة، رقم: ٤٩٥، صحيح مسلم، كتاب التوبة، باب إن الحسنات يذهبن السيئات، رقم: ٤٩٦٣، سنن الترمذی، كتاب تفسير القرآن عن رسول الله، باب ومن سورة هود، رقم: ٣٠٣٧، سنن ابن ماجه، كتاب اقامة الصلاة وسنة فيها، باب ما جاء فی أن الصلاة كفارة، رقم: ١٣٨٨

دوسرے وہ حقوق اللہ مراد ہیں جن کی تلافی ممکن ہو، مثلاً نمازیں چھوٹ گئی ہیں اور آدمی تندرست ہے، ان نمازوں کی قضا کرسکتا ہے، لہٰذا نمازیں معاف نہیں ہوں گی۔ یا مثلاً زکوۃ واجب ہوئی اور اب تک زکوۃ ادا نہیں کی تو وہ زکوۃ معاف نہیں ہوگی۔ حج واجب ہوگیا تھا، ادا نہیں کیا تو وہ حج معاف نہیں ہوگا۔ روزے واجب ہوگئے تھے ادا نہیں کیے، وہ معاف نہیں ہوں گے۔ بہرحال! توبہ کے ذریعہ وہ حقوق اللہ جن کی تلافی ممکن ہے وہ معاف نہیں ہوتے اور توبہ کے ذریعہ حقوق العباد معاف نہیں ہوتے جب تک صاحبِ حق معاف نہ کرے یا اس کا حق ادا نہ کردیا جائے۔

تمام سابقہ حقوقِ واجبہ کی ادائیگی شروع کردیں

حضرت والا فرما رہے ہیں کہ اگر آدمی توبہ کرلینے کے بعد یہ سمجھ لے کہ بس، میرا مقصد حاصل ہوگیا، اب مجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، یہ خیال بالکل غلط اور دھوکہ ہے، بلکہ توبہ کرلینے کے بعد یہ دیکھو کہ کیا کیا حقوق میرے ذمے واجب ہیں، چاہے وہ اللہ تعالیٰ کے حقوق ہوں یا بندوں کے حقوق ہوں، توبہ کرلینے کے بعد ان حقوق کو ادا کرنے کی فکر شروع کرو۔ جس کا طریقہ میں نے توبہ کا بیان شروع کرتے وقت عرض کیا تھا کہ آدمی ایک کاپی بنالے اور اس کاپی کے اندر یہ لکھے کہ میرے ذمے فلاں فلاں حقوق ہیں، میرے ذمے اتنی نمازیں باقی ہیں، اتنے روزے باقی ہیں، اتنی زکوۃ باقی ہے، فلاں فلاں لوگوں کے قرضے باقی ہیں، آج سے میں ان کی ادائیگی شروع کررہا ہوں، اگر مکمل ادائیگی سے پہلے میرا انتقال ہوجائے تو میرے ترکہ سے ان عبادات کا فدیہ اور میرے اوپر لازم قرضہ ادا کردیا جائے۔

اگر تمام حقوق کی ادائیگی سے پہلے موت آگئی

اب اگر اس شخص نے ان نمازوں کو ادا کرنا شروع کردیا، روزوں کو اور زکوۃ کو ادا کرنا شروع کردیا، لوگوں کے جو حقوق واجب تھے ان کی ادائیگی کی فکر شروع کردی اور کوشش شروع کردی تو اس شخص کے بارے میں حضرت والا فرما رہے ہیں کہ اگر وہ شخص اس کوشش کے دوران مرگیا یعنی ابھی ساری عباداتِ سابقہ ادا نہیں ہوئی تھیں ابھی تمام حقوق کی ادائیگی کی تکمیل نہیں ہوئی تھی کہ اس سے پہلے ہی اس کا انتقال ہوگیا، تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرمادیں گے اور معاف کرنے کا طریقہ یہ ہوگا کہ جن بندوں کے حقوق اس کے ذمے واجب تھے، ان بندوں سے فرمائیں گے کہ یہ میرا بندہ ہے، اس نے حقوق ادا کرنے شروع کردیئے تھے اور اپنی طرف سے پوری کوشش کی تھی لیکن اس کی عمر ختم ہوگئی تھی جس کی وجہ سے پورے حقوق ادا نہیں کرسکا، لیکن چونکہ اس نے

اخلاص کے ساتھ ادائیگی شروع کردی تھی، اس لئے اب ہم اور بڑی نعمتیں دے کر تمہیں راضی کردیتے ہیں، لہٰذا اس کے حقوق معاف کردو۔

حقوق کی معافی کا راستہ

حضرت والا نے یہاں اس ملفوظ میں یہ بات اختصار کے ساتھ بیان فرمائی ہے، لیکن ایک وعظ میں حضرت والا نے یہ بات تفصیل سے بیان فرمائی ہے، چنانچہ آپ نے وہاں پر یہ بیان فرمایا کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حقوق العباد کی معافی کا کوئی راستہ نہیں جب تک ان حقوق کو یا تو ادا نہ کردیا جائے یا صاحبِ حق سے معاف نہ کرالیا جائے۔ اس غلط فہمی کے نتیجے میں بعض اوقات لوگوں میں مایوسی پیدا ہوجاتی ہے کہ میرے ذمے اتنے سارے لوگوں کے حقوق واجب ہیں، اگر آج سے میں نے ان حقوق کو ادا کرنا شروع بھی کردیا تو بھی ساری عمر کھپا دوں گا، تب بھی تمام حقوق ادا نہیں کرسکوں گا، اور جب دل میں مایوسی پیدا ہوجاتی ہے تو پھر جو کچھ تھوڑے بہت حقوق ادا کرسکتا تھا، اس سے بھی رک جاتا ہے۔

مایوس ہونا ٹھیک نہیں

اس لئے ہمارے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا مذاق تو یہ تھا کہ۔

سوئے نو امیدی مرو امید ہاست
سوئے تاریکی مرو خورشید ہاست

یعنی نا اُمیدی اور ظلمت و تاریکی کا کوئی راستہ نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اُمید کے راستے رکھے ہیں۔ اس لئے یہ خیال غلط ہے کہ حقوق العباد کی معافی کا کوئی راستہ نہیں، کیونکہ جب اللہ کا ایک بندہ حقوق العباد ادا کرنے کے لئے آمادہ ہوگیا اور حقوق ادا کرنے شروع کردیئے، اپنی سی کوشش صرف کردی، اس دوران اس کا انتقال ہوگیا تو اللہ تعالیٰ اصحابِ حقوق کو راضی فرمادیں گے۔

سو انسانوں کے قاتل کا واقعہ

اس بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مشہور واقعہ سے استدلال فرمایا جو حدیث شریف میں آتا ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اُمت میں ایک قاتل تھا۔ اس شخص نے ننانوے آدمیوں کو قتل کردیا۔ ننانوے آدمیوں کو قتل کرنے کے بعد اس کے دل میں خدا کا خوف پیدا ہوا کہ یا اللہ! میں نے یہ کیا کردیا۔ ایک انسان کی جان لینا ایسا ہے جیسے پورے عالمِ انسانیت کی جان لے لینا

اور قتلِ نفس کی جو سزا قرآن کریم نے بیان کی ہے، دوسرے کسی گناہ کے لئے ایسی سزا بیان نہیں فرمائی۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا﴾(۱)

یعنی جو شخص جان بوجھ کر کسی مؤمن کو قتل کرے، تو اس کی سزا جہنم ہے اور وہ ہمیشہ اس میں رہے گا اور اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب اور اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوگی اور اس کیلئے اللہ تعالیٰ نے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ یہ الفاظ کفر کے علاوہ اور قتلِ نفس کے علاوہ کسی اور گناہ کے لئے بیان نہیں فرمائے۔

سو کا عدد پورا کر دیا

بہر حال! ننانوے آدمیوں کو قتل کرنے کے بعد اس کو فکر ہوئی کہ اب میں کیا کروں، چنانچہ وہ ایک عیسائی پادری کے پاس چلا گیا اور اس سے جا کر کہا کہ میں نے ننانوے قتل کیے ہیں، میری نجات کا کوئی راستہ بتاؤ۔ پادری نے کہا کہ تیری نجات کا کوئی راستہ نہیں، کیونکہ ایک آدمی کو قتل کرنا بہت بڑا گناہ ہے، تو نے تو ننانوے انسانوں کو قتل کر دیا، لہٰذا تیری نجات کا تو کوئی راستہ نہیں، تو تو جہنمی ہے۔ اس شخص کو بڑا غصہ آیا کہ میں تو نجات کا راستہ پوچھنے آیا اور یہ کہتا ہے کہ کوئی راستہ نہیں۔ اس نے سوچا کہ ننانوے قتل تو کر دیئے ہیں، ایک اور سہی تا کہ سو کا عدد پورا ہو جائے۔ چنانچہ اس نے اس پادری کو بھی قتل کر دیا۔

پھر کسی اور راہب کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ میں نے سو انسانوں کو قتل کر دیا ہے، میری نجات کا کوئی راستہ بتاؤ۔ اس راہب نے کہا کہ تم توبہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو اور ایسا کرو کہ فلاں بستی کے لوگ بہت نیک ہیں، تم اس بستی میں جا کر رہو۔ اس راہب کا مقصد یہ تھا کہ جب یہ شخص اس بستی میں رہے گا تو نیک لوگوں کی صحبت حاصل ہوگی، اس کے ذریعہ اس کے حالات درست ہو جائیں گے اور جو گناہ اس نے کیے ہیں، اس کی تلافی کی کوشش کرے گا، چنانچہ یہ شخص اس بستی کی طرف چل پڑا۔

رحمت اور عذاب کے فرشتوں میں جھگڑا

ابھی راستے میں یہ تھا کہ اس کی موت آ گئی اور اس کا انتقال ہو گیا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اس کے بارے میں ملائکہ رحمت اور ملائکہ عذاب کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ ملائکہ عذاب نے کہا کہ

(۱) النساء: ۹۳

یہ شخص سوقتل کر کے آیا ہے، لہٰذا یہ ہمارا آدمی ہے، اس کو ہم جہنم میں لے جائیں گے۔ ملائکہ رحمت نے کہا کہ یہ شخص توبہ کر کے نیک بننے کے لئے چل پڑا تھا، لہٰذا یہ ہمارا آدمی ہے، ہم اس کو جنت میں لے جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا فیصلہ

جب یہ دونوں جھگڑنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ جہاں سے یہ شخص چلا تھا، اس کی پیمائش کرو اور جس بستی کی طرف جا رہا تھا، اس کی پیمائش کرو اور یہ دیکھو کہ موت کے وقت کونسی جگہ سے قریب تھا؟ جس بستی سے روانہ ہوا، اس سے قریب تھا یا جس بستی کی طرف جا رہا تھا، اس سے قریب تھا؟ پھر جس بستی سے یہ شخص قریب ہو، اسی کا معاملہ کرو۔

چنانچہ دونوں طرف کے راستوں کی پیمائش کی گئی تو وہ جس بستی کی طرف جا رہا تھا، اس طرف ایک گز زیادہ قریب تھا، گویا کہ آدھے راستے سے ایک گز آگے بڑھ گیا تھا، اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ اس شخص کو رحمت والے فرشتوں کے حوالے کر دیا جائے۔ (۱)

اس واقعہ سے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا استدلال

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ سے استدلال فرمایا کہ اس شخص نے جو سوقتل کیے تھے، وہ حقوق العباد سے متعلق تھے، لیکن چونکہ وہ شخص حقوق العباد کی ادائیگی کا عزم کر کے چل پڑا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس شخص کی توبہ قبول فرمالی اور اس کو بخش دیا۔ اور جہاں تک تعلق ہے ان بندوں کا جن کو قتل کیا تھا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان مقتولین کے درجات بلند کر کے ان کو راضی کر دیں گے۔

پیمائش کرانے کی کیا ضرورت تھی؟

اس واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو یہ جو حکم فرمایا کہ دونوں طرف کے راستوں کی پیمائش کرو اور دیکھو کہ کونسی بستی زیادہ قریب ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس کو بخشنے کا ارادہ کر ہی لیا تھا تو پیمائش کرانے کی کیا ضرورت تھی؟ فرض کرو کہ اگر اس شخص کی موت ایک دو گز پہلے آجاتی تب بھی تو اس نے توبہ کا ارادہ کر ہی لیا تھا اور اپنی سی کوشش شروع کر دی تھی، لہٰذا پیمائش کرانے اور

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب أحادیث الأنبیاء، باب حدیث الغار، رقم: ۳۲۱۱، صحیح مسلم، کتاب التوبة، باب قبول توبة القاتل وان کثر قتله، رقم: ۴۹۶۷، سنن ابن ماجه، کتاب الدیات، باب هل لقاتل مؤمن توبة، رقم: ۲۶۱۲، مسند أحمد، رقم: ۱۰۷۲۷۔

قریب اور دور ہونے کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ اشکال میرے ذہن میں بہت عرصے سے تھا اور میں اس تلاش میں تھا کہ اس کا جواب کہیں مل جائے۔

حقوق العباد کی ادائیگی کے لئے قدم بڑھانا شرط ہے

بعد میں اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اس کا یہ جواب ڈالا کہ اللہ تعالیٰ کے پیمائش کرانے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ پیمائش کرانے کے بعد فیصلہ فرمائیں گے، بلکہ اس کی معافی کا فیصلہ تو پہلے ہی فرما چکے تھے، اس پر نوازش ہو چکی تھی، لیکن بندوں کو یہ بتانے کے لئے پیمائش کی گئی کہ یہ معافی کا معاملہ اس وقت ہوتا ہے جب آدمی اصلاح کے راستے پر معتد بہ راستہ چل پڑا ہو، یہ نہیں کہ کسی نے اپنی اصلاح کا اور تبدیلی لانے کا چھوٹا موٹا ارادہ کر لیا، پھر سستی کے عالم میں پڑا رہا، اس کے ساتھ معافی کا معاملہ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اس واقعہ کے ذریعہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اصلاح کا ارادہ کرنے کے بعد معتد بہ قدم اُٹھنے چاہئیں، معتد بہ راستہ قطع ہونا چاہئے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی رحمت آئے گی۔ یہ نہ ہو کہ کسی کے وعظ و تقریر میں نصیحت کی بات سن لی اور ارادہ کر لیا کہ اس نصیحت پر ضرور عمل کریں گے، لیکن کیا کچھ نہیں، تو ایسے ارادے کا کوئی اعتبار نہیں۔ لہٰذا بندوں پر یہ بات ظاہر کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ اس زمین کی پیمائش کرو اور یہ دیکھو کہ اس نے معتد بہ راستہ قطع کر لیا تھا یا نہیں؟ جب پیمائش کے بعد پتہ چل گیا کہ اس شخص نے معتد بہ راستہ طے کر لیا تھا، تب اس کی معافی کا فیصلہ فرمایا۔

خلاصہ

خلاصہ یہ کہ گناہِ صغیرہ کی معافی کا راستہ اللہ تعالیٰ نے اعمالِ صالحہ کو بنا دیا ہے اور وہ گناہِ کبیرہ جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے اور جن کی تلافی ممکن نہیں، ان کی معافی کے لئے توبہ ہے اور وہ گناہِ کبیرہ جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے یا ان حقوق اللہ سے ہے جن کی تلافی ممکن ہے، ان کی معافی کا راستہ یہ ہے کہ اہتمام کر کے ان کی ادائیگی شروع کر دے اور ساتھ میں وصیت بھی کر دے کہ اگر میں ان کو مکمل نہ کر سکا تو میرے ترکہ میں سے ان عبادات کا فدیہ اور قرضہ ادا کر دیا جائے۔ جب یہ سب کر لیا تو بندے نے اپنے حصے کا کام کر لیا، اب اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید ہے کہ اس کا بیڑہ پار کر دیں گے۔

گناہ کا تقاضا گناہ نہیں

آگے ایک ملفوظ میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا:

''امورِ طبعیہ پر مؤاخذہ نہیں بلکہ ان کے مقتضاء پر عمل کرنے سے مؤاخذہ ہوتا ہے،

وہ بھی اس وقت جبکہ عمداً اس پر عمل کیا جائے، اور اگر طبعی ناگواری سے مغلوب ہوکر
کسی وقت کوئی کلمہ بیجا زبان سے نکل جائے اور بعد میں اس سے معذرت کرلی
جائے تو حق تعالیٰ اس کو معاف فرمائیں گے۔ (۱)

اس ملفوظ میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بہت اہم اصول بیان فرمایا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ گناہوں کا صدور یا تو طبعی داعیہ اور محرکات کے ذریعہ ہوتا ہے یا نسان کے اندر جو اخلاق رذیلہ ہوتے ہیں وہ انسان کو گناہ پر آمادہ کرتے ہیں۔ اب بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف گناہ کے داعیے اور تقاضے کا دل میں پیدا ہوجانا ہی گناہ ہے۔ حضرت والا اس غلط فہمی کو دور فرمارہے ہیں کہ محض تقاضا کا دل میں پیدا ہوجانا گناہ نہیں جب تک انسان اس تقاضے پر عمل نہ کرے۔

غصہ کا علاج سب سے مقدم

مثلاً غصہ کرنا بُرا ہے اور یہ ان چیزوں میں سے ہے کہ تصوف اور طریقت میں سب سے پہلے اس کا علاج کیا جاتا ہے۔ یہ غصہ انسان کے باطن کو بالکل تباہ کرنے والا ہے۔ اس لئے جب کوئی اللہ کا بندہ اپنی اصلاح کے لئے کسی شیخ کے پاس جاتا ہے تو پہلے قدم کے طور پر اس کے غصے کی اصلاح کی جاتی ہے تاکہ اس کا غصہ قابو میں آجائے۔

غصہ اور شہوت کے تقاضے پر عمل کرنا گناہ ہے

اب بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ غصے کا دل میں پیدا ہونا ہی گناہ ہے۔ حضرت والا فرمارہے ہیں کہ محض غصہ کا دل میں پیدا ہوجانا گناہ نہیں بلکہ گناہ اس وقت ہوگا جب اس غصہ کے تقاضے پر عمل کرکے کسی کے ساتھ زیادتی کروگے۔ اسی طرح شہوت ہے، شہوت کے خیال کا دل میں خودبخود پیدا ہوجانا گناہ نہیں، لیکن اگر اس خیال کو جان بوجھ کر پیدا کرے گا یا اس خیال کو جان بوجھ کر باقی رکھے گا یا اس شہوت کے تقاضے پر کوئی ایسا عمل کرگزرے گا جو شرعاً ناجائز ہے تو گناہگار ہوگا، مثلاً شہوت کا خیال آنے کے نتیجے میں نگاہ غلط جگہ پر ڈال دی تو اب وہ گناہگار ہوگا۔ سارے امراضِ باطنہ اور رذائل کا یہی معاملہ ہے۔

حسد کے تقاضے پر عمل کا گناہ ہے

مثلاً ''حسد'' ہے، آپ کے دل میں کسی شخص کی طرف سے حسد ہے، اب اس کے بارے میں

(۱) انفاسِ عیسیٰ، ص: ۱۹۸

کسی اچھائی کی خبر سن کر آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ کیوں آگے بڑھ گیا؟ اس کے پاس پیسے کیوں زیادہ آگئے؟ اس کے پاس دولت کیوں زیادہ ہوگئی؟ اس کی شہرت کیوں زیادہ ہوگئی؟ لوگ اس کو کیوں زیادہ ماننے لگے؟ وغیرہ۔ صرف دل میں اس خیال کا پیدا ہو جانا یہ گناہ نہیں، کیونکہ یہ خیال غیر اختیاری طور پر دل میں پیدا ہوا ہے۔ یہ خیال اس وقت گناہ بنے گا جب تم اس خیال کے آنے کے نتیجے میں اس شخص کے ساتھ کوئی بدسلوکی کرو گے۔ مثلاً آپ کے دل میں یہ خیال آیا کہ فلاں شخص مجھ سے آگے بڑھ گیا، یہ تو بہت بُرا ہوا۔ اب تم نے سوچا کہ کوئی ایسا کام کرو کہ اس کے آگے بڑھنے میں رکاوٹ پیدا ہو جائے، مثلاً اس کی چغلی کرو، لوگوں کے سامنے اس کی بُرائی بیان کرو، اس کی غیبت کرو، تو ان کاموں کے کرنے کے نتیجے میں وہ حسد گناہ بن جائے گا، محض دل میں خیال آجانے سے گناہ نہیں بنتا۔

حسد کے دو علاج

البتہ "حسد" کے بارے میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس شخص کے دل میں دوسرے کی بُرائی کا خیال آرہا ہو، اس کو فوراً دو کام کرنے چاہئیں، ورنہ وہ حسد کے نتیجے میں گناہ کے اندر مبتلا ہو جائے گا۔ ایک کام یہ کرے کہ اس خیال کو دل میں بُرا سمجھے کہ میرے دل میں یہ جو خیال آرہا ہے، یہ بہت بُرا خیال ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرے کہ یا اللہ! یہ بُرا خیال میرے دل سے نکال دیجئے۔ دوسرا کام یہ کرے کہ جس شخص کی طرف سے یہ بُرا خیال آرہا ہے، اس کے حق میں دعائے خیر کرے۔ مثلاً آپ کے دل میں اس بات کا دکھ ہو رہا ہے کہ فلاں شخص مجھ سے آگے کیوں نکل گیا، اس کے لئے یہ دعا کرے کہ یا اللہ! اس کو اور ترقی عطا فرما۔ جب تم یہ دعا کرو گے تو دل پر آرے چل جائیں گے، لیکن یہ آرے چلانے مقصود ہیں تاکہ اس بیماری کا علاج ہو۔ اگر اس کی دولت کی وجہ سے اس پر حسد ہو رہا تھا تو اس کے لئے یہ دعا کرو کہ یا اللہ! اس کو اور دولت عطا فرما۔ اگر اس کے منصب کی وجہ سے حسد ہو رہا تھا تو یہ دعا کرو کہ یا اللہ! اس کو اور بڑا منصب عطا فرما، اس کو اور زیادہ ترقی عطا فرما۔ لہٰذا جس چیز کی وجہ سے حسد ہو رہا تھا، اس کی زیادتی کی دعا کرے۔ جب حسد پیدا ہو تو فوراً یہ دو کام کرے ورنہ یہ حسد کسی نہ کسی وقت آدمی کو تباہ کر دے گا۔

بہرحال! جتنے بھی بُرے اخلاق ہیں، ان سب کا اصول حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ملفوظ میں بیان فرمایا کہ "محض امور طبعیہ پر مؤاخذہ نہیں، بلکہ ان کے مقتضاء پر عمل کرنے سے مؤاخذہ ہوتا ہے"۔ پھر فرمایا کہ "وہ بھی اس وقت جب کہ عمداً اس پر عمل کیا جائے۔"

طبعی ناگواری سے مغلوب ہو کر زبان سے نکلنے والے کلمات

آگے بڑی چھوٹ والی بات ارشاد فرمادی کہ ''اگر طبعی ناگواری سے مغلوب ہو کر کسی وقت کوئی کلمہ بیجا زبان سے نکل جائے اور بعد میں اس سے معذرت کرلی جائے تو حق تعالیٰ اس کو معاف فرمادیں گے۔'' یعنی ویسے تو غصہ قابو میں آگیا ہے اور کسی شخص کی صحبت کے نتیجے میں اور اس کے آگے رگڑے کھانے کے نتیجے میں طبیعت میں ایک اعتدال پیدا ہونے لگا اور غصہ قابو میں آنے لگا، لیکن پھر بھی کسی کسی وقت وہ غصہ بے قابو ہو جاتا ہے، جیسے کسی بات پر ناگوری پیدا ہوئی، اس کے نتیجے میں ایک دم سے بھڑک اُٹھا اور اس کی وجہ سے زبان سے کوئی نازیبا کلمہ نکل گیا تو ایسا ہو جاتا ہے۔ اس کے بارے میں یہ نہ سمجھے کہ یہ کوئی غیر معمولی اور ناقابلِ اصلاح بات ہوگئی۔ البتہ جب ایسا ہو جائے تو جس کے ساتھ اس قسم کا معاملہ ہوا تھا، اس سے معذرت کرلے لیکن یہ نہ سمجھے کہ اب میرا غصہ قابلِ اصلاح نہیں بلکہ اپنے غصہ کی اصلاح کی فکر کرے۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کو غصہ نہ کرنے کی نصیحت

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صحابی حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے نصیحت فرمایئے اور مختصر نصیحت فرمایئے۔ ایک تو نصیحت کی درخواست کی اور ساتھ مختصر نصیحت کی درخواست کی۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو برا نہیں مانا کہ تم نصیحت بھی طلب کرتے ہو اور ساتھ میں شرطیں بھی لگاتے ہو اور نہ اس پر ناگواری کا اظہار فرمایا بلکہ آپ نے اس کی اس فرمائش کی تعمیل فرمائی۔ اس سے پتہ چلا کہ اگر کوئی شخص مختصر نصیحت طلب کرے تو اس کو مختصر نصیحت کر دو۔ اس لئے کہ اس کے پاس وقت کم ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ ایک منٹ میں مجھے کوئی دین کی بات حاصل ہو جائے، اس کی اس فرمائش کو پورا کر دو۔ اس لئے کہ دین کی باتیں ایسی بھی ہیں جو ایک منٹ یا دو منٹ میں بھی ہو سکتی ہیں۔ بہر حال! ان صحابی کی فرمائش پر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نصیحت فرمائی:

((لَا تَغْضَبْ))

''غصہ مت کرنا''(۱)

اس سے پتہ چلا کہ غصہ ان چیزوں میں سے ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک اس کی اتنی اہمیت تھی کہ مختصر نصیحت کے وقت آپ نے اسی کا انتخاب فرمایا۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب الحذر من الغضب، رقم: ۵۶۵۱، سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ما جاء في كثرة الغضب، رقم: ۱۹۴۳، مسند أحمد، رقم: ۸۳۸۹

ابتداءً بالکل غصہ کرنا چھوڑ دو

اسی لئے ہمارے حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے طریق میں غصہ ان چیزوں میں سے ہے جس کا سب سے پہلے علاج کیا جاتا ہے۔ جب کوئی شخص کسی شیخ کی خدمت میں اپنی اصلاح کے لئے جاتا ہے تو شروع میں اس سے یہ کہا جاتا ہے کہ تم غصہ بالکل مت کرو، نہ غصہ کے صحیح محل پر غصہ کرو اور نہ ہی بے محل غصہ کرو، جہاں غصہ کرنیکا حق ہے وہاں بھی غصہ نہ کرو تا کہ تمہاری طبیعت اعتدال پر آجائے۔ لیکن اس کے باوجود کسی وقت غیر اختیاری طور پر منہ سے نازیبا کلمات نکل جائیں تو جس کے خلاف وہ کلمات نکلے ہیں، اس سے معافی مانگ لو، معذرت کرلو کہ بھائی! میرے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے، غلطی ہوگئی، معاف کردو۔ جب یہ کرلو گے تو انشاءاللہ آئندہ کے لئے راستہ کھل جائے گا۔

معافی مانگنے سے شرم مت کرو

معافی مانگ لینے میں کوئی ذلت نہیں ہے، بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جان جائے مگر ناک نہ جائے، کسی طرح ناک نیچی نہ کرنی پڑے۔ یہ تصور اور خیال بہت خراب ہے، کیونکہ تکبر پر مبنی ہے، اس لئے جب کبھی ایسا ہو جائے، معافی مانگ لو، معافی مانگنے میں کیا رکھا ہے، اگر دنیا میں معافی مانگ لی تو یہاں معافی ہو جائے گی، اگر خدانخواستہ یہاں معاف نہیں کرایا اور آخرت میں جا کر حساب کتاب دینا پڑا تو اس کا بڑا خطرناک انجام ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو بھی ان باتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ یہاں پر توبہ کا بیان ختم ہوگیا، اب آگے دوسرا باب شروع ہو رہا ہے، جس کا عنوان ہے ''تعلق مع اللہ'' انشاءاللہ کل اس کو شروع کریں گے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

مسلمان پر مسلمان کے حقوق ☆

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

صحیح مسلم کی ایک حدیث ہے:

"عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((إِنَّ الْمُسْلِمَ أَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يَظْلِمُهٗ وَلَا يَخْذُلُهٗ وَلَا يَحْقِرُهٗ، اَلتَّقْوٰى هٰهُنَا، وَيُشِيْرُ إِلٰى صَدْرِهٖ ثَلَاثَ مِرَارٍ((بِحَسْبِ امْرِئٍ مِنَ الشَّرِّ أَنْ يَحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ، كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ دَمُهٗ وَمَالُهٗ وَعِرْضُهٗ))(۱)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، اس پر واجب ہے کہ وہ اس پر کوئی ظلم و زیادتی نہ کرے، اور اسے (جب مدد کی ضرورت ہو تو) بے یار و مددگار نہ چھوڑے، نہ اسے حقیر جانے اور نہ اس کے ساتھ حقارت کا برتاؤ کرے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ اپنے سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تقویٰ یہاں ہوتا ہے، (یعنی ہوسکتا ہے کہ تم کسی شخص کو اس کے ظاہری حال سے معمولی آدمی سمجھو، لیکن وہ اپنے دل کے تقوے کی وجہ سے وہ اللہ کے نزدیک محترم ہو، اس لئے کبھی مسلمان کو حقیر نہ سمجھو) آدمی کے برا ہونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے اور اس کے ساتھ حقارت سے پیش آئے، مسلمان کی ہر چیز دوسرے مسلمان کے لئے قابلِ احترام ہے، اس کا خون بھی، اس کا مال بھی، اور اس کی آبرو بھی''

☆ نشری تقریریں، ص: ۸۵۔۸۸

(۱) صحیح البخاری، کتاب المظالم والغضب، باب لا یظلم المسلم المسلم ولا یسلمه، رقم: ۲۲۶۲، صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب تحریم ظلم المسلم...... الخ، رقم: ۴۶۵۰، سنن الترمذی، کتاب الحدود عن رسول اللّٰه، باب ما جاء فی الستر علی المسلم، رقم: ۱۳۴۶، سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب المؤاخاة، رقم: ۴۲۴۸، مسند أحمد، رقم: ۵۱۰۳

اس حدیث میں سرکارِ دو عالم ﷺ نے ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان کا بھائی قرار دے کر اس کے کچھ معاشرتی حقوق بیان فرمائے ہیں۔ ان میں سے سب سے پہلا حق یہ ہے کہ اس پر کسی قسم کا ظلم نہ کیا جائے۔ اس میں ہر قسم کا ظلم داخل ہے خواہ جسمانی ہو یا مالی، زبانی ہو یا نفسیاتی، یعنی جس طرح کسی مسلمان کو ناحق جسمانی اذیت پہنچانا یا مالی نقصان میں مبتلا کرنا حرام ہے، اسی طرح اسے زبان سے برا کہنا یا بھرے مجمع میں کسی اور طرح شرمندہ و رسوا کرنا بھی ناجائز ہے، اور یہ کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں۔

دوسرا حق سرکارِ دو عالم ﷺ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ جب کسی مسلمان کو مدد کی ضرورت ہو تو دوسرے مسلمان پر واجب ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق اسکی مدد کرے، اور اسے بے یار و مددگار نہ چھوڑے بشرطیکہ وہ حق پر ہو اور مظلوم ہو، گویا جس طرح اپنے دوسرے بھائی پر ظلم کرنا حرام ہے، اسی طرح یہ بات بھی کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں کہ وہ ظلم ہوتا ہوا دیکھے، اور مدد کی قدرت کے باوجود مظلوم کی مدد نہ کرے، چنانچہ ایک اور حدیث میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَخْذُلُ امْرَأً مُسْلِمًا فِيْ مَوْضِعٍ تُنْتَهَكُ فِيْهِ حُرْمَتُهُ وَيُنْتَقَصُ فِيْهِ مِنْ عِرْضِهِ إِلَّا خَذَلَهُ اللّٰهُ فِيْ مَوْضِعٍ يُحِبُّ نُصْرَتَهُ))(۱)

''جو کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو کسی ایسی جگہ بے یار و مددگار چھوڑ دے جہاں اس کی بے حرمتی ہو رہی ہو، اور اس کی آبرو پر حملہ کیا جا رہا ہو، تو اللہ تعالیٰ اس شخص کو ایسی جگہ بے یار و مددگار چھوڑ دے گا جہاں وہ اپنے لئے مدد چاہتا ہو''

تیسرا حق آنحضرت ﷺ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ کوئی مسلمان کسی دوسرے کو نہ حقیر سمجھے اور نہ اس کے ساتھ حقارت کا برتاؤ کرے۔ کسی شخص کو غربت، ناداری یا کمزوری کی وجہ سے حقیر سمجھنا تو انتہائی گھٹیا حرکت ہے ہی، لیکن یہاں آنحضرت ﷺ نے جس چیز کی طرف اشارہ فرمایا ہے وہ یہ کہ اگر کسی شخص کو دینی اعتبار سے معمولی حالت میں دیکھ رہے ہو اس شخص کو حقیر سمجھنا اس وقت بھی جائز نہیں، اور اس کی وجہ آپ نے یہ بیان فرمائی کہ ''تقویٰ'' دل میں ہوتا ہے، لہٰذا یہ عین ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنی ظاہری حالت کی وجہ سے معمولی نظر آتا ہو، لیکن اس کا دل تقویٰ کی دولت سے مالا مال ہو، بلکہ دوسری احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی گناہگار شخص کو بھی حقیر سمجھنا جائز نہیں، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے توبہ کی توفیق عطا فرمائے، اور وہ اپنے گناہوں سے نجات پا کر تم سے کہیں آگے نکل جائے۔ گناہ کے کاموں کو برا اور حقیر سمجھنا برحق ہے، لیکن ان کی وجہ سے کسی مسلمان کو حقیر سمجھنا خود بہت

(۱) سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب من رد عن مسلم غيبة، رقم: ٤٢٤٠، مسند أحمد بن حنبل، رقم: ١٥٧٧٣، جمع الفوائد (٢ / ٥٥)

بڑا گناہ ہے۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اگر انسان میں کچھ اور برائی نہ ہو تو یہی برائی کچھ کم نہیں کہ وہ دوسرے مسلمانوں کو حقیر سمجھے۔

آخر میں آپ ﷺ نے ایک اصولی ہدایت یہ عطا فرمادی کہ مسلمان کی ہر چیز دوسرے مسلمان کے لئے قابلِ احترام ہے، اس کی جان بھی، اس کا مال بھی، اور اس کی آبرو بھی، اور ایک دوسری حدیث میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ ایک مسلمان کی حرمت کعبہ معظمہ کی حرمت سے بھی بڑھ کر ہے،[1]

لہٰذا جو شخص اپنے کسی مسلمان بھائی کی جان، مال یا آبرو پر حملہ کرتا ہے تو اس کا گناہ اس شخص سے بھی زیادہ ہے جو (معاذ اللہ) کعبہ معظمہ کو ڈھانے کے لئے کعبے پر چڑھائی کر رہا ہو۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو بھائیوں کی طرح رہنے اور ایک دوسرے کے حقوق پہنچاننے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب الفتن، باب حرمة دم المؤمن وماله، رقم: ۳۹۲۲

مؤمن ایک آئینہ ہے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

"عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ:
((اَلْمُؤْمِنُ مِرْآةُ الْمُؤْمِنِ))(۱)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک مؤمن دوسرے مؤمن کے لئے آئینہ ہے''

یہ حدیث اگرچہ بہت مختصر ہے اور صرف تین الفاظ پر مشتمل ہے، لیکن اس حدیث میں ہمارے اور آپ کے لئے تعلیمات کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔ اس حدیث کا ظاہری مفہوم تو یہ ہے کہ جس طرح ایک انسان جب آئینہ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو اس کو آئینہ کے اندر اپنی شکل نظر آتی ہے، اور وہ آئینہ شکل وصورت کی تمام اچھائیاں اور برائیاں اس انسان کو بتا دیتا ہے کہ کیا اچھائی ہے اور کیا برائی ہے۔ اس لئے کہ بہت سی برائیاں ایسی ہوتی ہیں جو انسان کو خود معلوم نہیں ہوتیں، لیکن آئینہ بتا دیتا ہے کہ تمہارے اندر یہ خرابی ہے۔ مثلاً اگر تمہارے چہرے پر سیاہ داغ لگا ہوا ہے تو وہ آئینہ بتا دے گا کہ تمہارے چہرے پر سیاہ داغ لگا ہوا ہے۔ اسی طرح ایک مؤمن بھی دوسرے مؤمن کے لئے آئینہ ہے کہ اگر ایک مؤمن میں کوئی خرابی یا برائی یا عیب ہے تو دوسرا مؤمن اس کو بتا دے گا کہ تمہارے اندر یہ خرابی یا یہ برائی ہے، تم اس کو دور کرلو، اس کی اصلاح کرلو۔ اس بتانے کے نتیجے میں وہ اس خرابی کو دور کرنے کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ یہ ہے اس حدیث کا مطلب کہ ایک مؤمن دوسرے مؤمن کے لئے آئینہ ہے۔

تمہاری غلطی بتانے والا تمہارا محسن ہے

اس حدیث شریف میں دونوں کے لئے سبق ہے، جو شخص دوسرے کے اندر خرابی دیکھ کر اس کو

☆ اصلاحی خطبات (۲۹۴/۸ تا ۳۰۶)، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی، بعد از نماز عصر

(۱) سنن أبی داود، کتاب الأدب، باب فی النصیحة والحیاطة، رقم: ٤٢٧٢

بتاتا ہے کہ تمہارے اندر یہ خرابی ہے، اس کے لئے بھی سبق ہے، اور جس شخص کو بتایا جارہا ہے اس کے لئے بھی اس حدیث میں سبق ہے۔ لہٰذا جس شخص کو یہ بتایا جارہا ہے کہ تمہارے اندر یہ خرابی ہے اس کو دور کرلو، اس کے لئے اس حدیث میں یہ سبق ہے کہ وہ خرابی بتانے والے پر ناراض نہ ہو، کیونکہ حضور اقدس ﷺ نے مؤمن کو آئینہ سے تشبیہ دی ہے کہ ایک مؤمن دوسرے مؤمن کے لئے آئینہ ہے۔ اگر کوئی شخص آئینہ کے سامنے کھڑا ہوجائے اور آئینہ یہ بتادے کہ تمہارے چہرے پر فلاں قسم کا داغ دھبہ لگا ہوا ہے اس کو دور کرلو تو وہ شخص اس آئینہ پر ناراض نہیں ہوتا، اور اس پر غصہ نہیں کرتا کہ تم نے مجھے یہ داغ دھبہ کیوں بتایا، بلکہ وہ اس آئینہ کا احسان مند ہوتا ہے کہ اچھا ہوا کہ تم نے میرے چہرے کا داغ بتادیا، اب میں اس کو صاف کرلوں گا۔ بالکل اسی طرح ایک مؤمن بھی دوسرے مؤمن کے لئے آئینہ ہے۔ اگر تمہارا ایک مؤمن بھائی تمہیں بتارہا ہے کہ تمہارے اندر یہ برائی یا یہ عیب ہے، یا تمہاری نماز کے اندر یہ غلطی ہے، یا تمہارے معاملات میں یہ غلطی ہے تو تمہیں اس کے کہنے کا بُرا نہیں ماننا چاہئے، اور اس پر غصہ نہیں کرنا چاہئے کہ اس نے تمہیں یہ عیب کیوں بتایا، اور اس پر ناراض نہیں ہونا چاہئے، بلکہ اس کا احسان سمجھنا چاہئے کہ اس نے تمہیں تمہاری غلطی بتادی۔ اور یہ کہنا چاہئے کہ اب انشاء اللہ میں اپنی اصلاح کی فکر کروں گا اور اس عیب کو دور کرنے کی کوشش کروں گا۔

غلطی بتانے والے علماء پر اعتراض کیوں؟

آج کل لوگ علماء کرام پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ یہ علماء تو ہر ایک کو کافر اور فاسق بناتے رہتے ہیں۔ کسی پر کفر کا فتویٰ لگادیا۔ کسی پر فاسق ہونے کا فتویٰ لگادیا۔ کسی پر بدعتی ہونے کا فتویٰ لگادیا۔ ان کی ساری عمر اسی کام میں گزرتی ہے کہ دوسروں کو کافر بناتے رہتے ہیں۔ اس کے جواب میں حضرت مولانا اشرف صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ علماء لوگوں کو کافر بناتے نہیں ہیں بلکہ کافر بتاتے ہیں۔ جب کسی شخص نے کفر کا ارتکاب کرلیا تو اصل میں تو خود اس شخص نے کفر کا ارتکاب کیا۔ اس کے بعد علماء کرام یہ بتاتے ہیں کہ تمہارا یہ عمل کفر ہے۔ جس طرح آئینہ تمہیں بتاتا ہے کہ تم بدصورت ہو، تمہارے چہرے پر دھبہ لگا ہوا ہے، وہ آئینہ بناتا نہیں اور نہ داغ دھبہ لگاتا ہے۔ اسی طرح علماء کرام بھی یہ بتاتے ہیں کہ تم نے جو عمل کیا ہے وہ کفر کا عمل ہے، یا فسق کا عمل ہے، یا بدعت کا عمل ہے۔ لہٰذا جس طرح آئینہ کو برا بھلا نہیں کہا جاتا اور نہ آئینہ پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ آئینہ نے میرے چہرے پر داغ لگادیا، بالکل اسی طرح علماء پر بھی یہ الزام نہیں لگانا چاہئے کہ انہوں نے کافر یا فاسق بنادیا۔ اور ان پر ناراضگی کا اظہار نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ ان کا احسان ماننا چاہئے کہ انہوں نے ہمارا عیب بتادیا۔ اب ہم اس کی اصلاح کریں گے۔

ڈاکٹر بیماری بتاتا ہے، بیمار نہیں بناتا

مثلاً بعض اوقات ایک انسان کو اپنی بیماری کا علم نہیں ہوتا کہ میرے اندر فلاں بیماری ہے۔ لیکن جب وہ کسی طبیب اور ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے تو وہ ڈاکٹر بتادیتا ہے کہ تمہارے اندر یہ بیماری ہے۔ اب ڈاکٹر کو یہ نہیں کہا جائے گا کہ تم نے اس شخص کو بیمار بنادیا۔ بلکہ یہ کہا جائے گا جو بیماری خود تمہارے اندر پہلے سے موجود تھی اور تم اس کی طرف سے غافل تھے، ڈاکٹر نے بتادیا کہ تمہارے اندر یہ بیماری ہے، اس کا علاج کرلو۔

ایک نصیحت آموز واقعہ

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ نے اپنا یہ واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ میرے والد ماجد یعنی (میرے دادا) بیمار تھے، دیوبند میں قیام تھا۔ اس وقت دہلی میں ایک حکیم نابینا بہت مشہور تھے۔ اور بہت حاذق اور ماہر حکیم تھے۔ ان کا علاج چل رہا تھا۔ میں دیوبند سے دہلی گیا تاکہ والد صاحب کا حال بتا کر دوا لے لوں۔ چنانچہ میں ان کے مطب میں پہنچا، اور حضرت والد صاحب کا حال بتایا اور کہا کہ ان کی دوا دیدیں۔ حکیم صاحب نابینا تھے۔ جب انہوں نے میری آواز سنی تو فرمایا کہ میں تمہارے والد صاحب کی دوا تو بعد میں دوں گا، پہلے تم اپنی دوا لو۔ میں نے کہا کہ میں تو ٹھیک ٹھاک ہوں، کوئی بیماری نہیں ہے۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ نہیں، یہ تم اپنی دوا لو۔ صبح یہ کھانا، دوپہر یہ کھانا اور شام کو یہ کھانا۔ اور جب ایک ہفتہ کے بعد آؤ تو اپنا حال بیان کرنا۔ چنانچہ انہوں نے پہلے میری دوا دی، اور پھر والد صاحب کی دوا دی۔ جب میں گھر واپس آیا و والد صاحب کو بتایا کہ حکیم صاحب نے اس طرح مجھے بھی دوا دی ہے۔ والد صاحب نے فرمایا کہ جس طرح حکیم صاحب نے فرمایا ہے، اسی طرح کرو اور ان کی دوا استعمال کرو۔ جب ایک ہفتہ کے بعد دوبارہ حکیم صاحب کے پاس گیا تو میں نے عرض کیا کہ حکیم صاحب! اب تک یہ فلسفہ سمجھ میں نہیں آیا اور نہ کوئی بیماری معلوم ہوئی۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ گذشتہ ہفتہ جب تم آئے تھے تو تمہاری آواز سن کر مجھے اندازہ ہوا کہ تمہارے پھیپھڑوں میں خرابی ہوگئی ہے۔ اور اندیشہ ہے کہ کہیں آگے چل کر ٹی بی کی شکل اختیار نہ کرلے۔ اس لئے میں نے تمہیں دوا دی۔ اور اب الحمدللہ تم اس بیماری سے بچ گئے۔

دیکھئے! بیمار کو پتہ نہیں ہے کہ مجھے کیا بیماری ہے۔ اور معالج اور ڈاکٹر کا یہ بتانا کہ تمہارے اندر یہ بیماری ہے، یہ اس کا احسان ہے۔ لہٰذا یہ نہیں کہا جائے گا کہ ڈاکٹر نے بیمار بنادیا، بلکہ اس نے بتادیا کہ تمہارے اندر یہ بیماری پیدا ہو رہی ہے، تاکہ تم علاج کرلو۔ اب اس بتانے کی وجہ سے ڈاکٹر پر غصہ

کرنے اور اس سے ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔

بیماری بتانے والے پر ناراض نہیں ہونا چاہئے

البتہ بتانے کے طریقے مختلف ہوتے ہیں، کسی نے آپ کے عیب اور آپ کی خرابی کو اچھے طریقے سے بتادیا۔ اور کسی نے بے ڈھنگے طریقے سے بتادیا۔ لیکن اگر کسی نے آپ کی برائیاں ایسے طریقے سے آپ کو بتائیں جو طریقہ مناسب نہیں تھا، تب بھی اس نے تمہاری ایک بیماری پر تمہیں مطلع کیا۔ اس لئے تمہیں اس کا احسان ماننا چاہئے۔ عربی کے ایک شعر کا مفہوم یہ ہے:

''میرا سب سے بڑا محسن وہ ہے جو میرے پاس میرے عیوب کا ہدیہ پیش کرے۔
جو مجھے بتائے کہ میرے اندر کیا عیب ہے''

اور جو شخص تعریف کررہا ہے کہ تم ایسے اور ویسے ہو، اور اس کو بڑھا چڑھا رہا ہے، جس کے نتیجے میں دل میں کبر اور غرور پیدا ہورہا ہے، یہ بظاہر تو دیکھنے میں اچھا معلوم ہورہا ہے، لیکن حقیقت میں وہ نقصان پہنچا رہا ہے۔ لیکن جو شخص تمہارے عیوب بیان کررہا ہے اس کا احسان مانو۔ بہر حال، یہ حدیث ایک طرف تو یہ بتارہی ہے کہ اگر کوئی شخص تمہیں تمہاری غلطی بتائے تو اس پر ناراض ہونے کے بجائے اس کے بتانے کو اپنے لئے غنیمت سمجھو، جس طرح آئینہ کے بتانے کو غنیمت سمجھتے ہو۔

غلطی بتانے والا لعنت ملامت نہ کرے

اس حدیث میں دوسرا سبق غلطی بتانے والے کے لئے ہے۔ اس میں غلطی بتانے والے کو آئینہ سے تشبیہ دی ہے۔ اور آئینہ کا کام یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص اس کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو وہ یہ بتادیتا ہے کہ تمہارے چہرے پر اتنا بڑا داغ لگا ہوا ہے۔ اور اس بتانے میں نہ تو وہ کمی زیادتی کرتا ہے، اور نہ اس شخص پر لعنت ملامت کرتا ہے کہ یہ داغ کہاں سے لگالیا بلکہ صرف داغ بتادیتا ہے۔ اسی طرح غلطی بتانے والا مؤمن بھی آئینہ کی طرح صرف اتنی غلطی اور عیب بتائے جتنا اس کے اندر واقعۃً موجود ہے۔ اس کو بڑھا چڑھا کر نہ بتائے اور اس بتانے میں مبالغہ نہ کرے۔ اور اسی طرح صرف اس کو بتادے کہ تمہارے اندر یہ عیب ہے۔ لیکن اس کو اس کے عیب پر لعنت اور ملامت شروع کردے اور لوگوں کے سامنے اس کو ذلیل کرنا شروع کردے، یہ مؤمن کا کام نہیں ہے۔ اس لئے کہ مؤمن تو آئینہ کی طرح ہے۔ اس لئے اتنی ہی غلطی بتائے جتنی اس کے اندر ہے۔ اور اس پر لعنت ملامت نہ کرے۔

غلطی کرنے والے پر ترس کھاؤ

اور جب ایک مؤمن دوسرے مؤمن کو غلطی بتاتا ہے تو اس پر ترس کھاتا ہے کہ یہ بیچارہ اس غلطی کے اندر مبتلا ہو گیا۔ جس طرح ایک شخص بیمار ہے تو وہ بیمار ترس کھانے کے لائق ہے۔ وہ غصہ کا محل نہیں۔ کوئی شخص اس بیمار پر غصہ نہیں کرے گا کہ تو کیوں بیمار ہو گیا، بلکہ اس پر ترس کھائے گا اور اس کو علاج کرنے کا مشورہ دے گا۔ اسی طرح ایک مؤمن غلطی اور گناہ کے اندر مبتلا ہے تو وہ ترس کھانے کے لائق ہے۔ وہ غصہ کرنے کا محل نہیں ہے۔ اس کو پیار سے اور نرمی سے بتادو کہ تمہارے اندر یہ خرابی ہے تاکہ وہ اس کی اصلاح کرلے۔ اس پر غصہ یا لعنت ملامت مت کرو۔

غلطی کرنے والے کو ذلیل مت کرو

آج کل ہم کو اس بات کا خیال بھی نہیں آتا کہ دوسرے مؤمن کو اس کی غلطی پر متنبہ کرنا بھی ایک فریضہ ہے۔ اگر ایک مسلمان غلط طریقے سے نماز پڑھ رہا ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ یہ طریقہ غلط ہے تو تم پر فرض ہے کہ اس کو اس غلطی کے بارے میں بتادو۔ اس لئے کہ یہ بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اندر داخل ہے اور یہ ہر آدمی پر فرض ہے۔ آج کل کسی کو اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ اس کو غلطی بتادوں، بلکہ یہ سوچتا ہے کہ غلط پڑھ رہا ہے تو پڑھنے دو۔ اور اگر کسی کو غلطی بتانے کا احساس ہوتا بھی ہے تو یہ احساس اتنی شدت سے ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو خدائی فوجدار سمجھ بیٹھتا ہے، چنانچہ جب وہ دوسروں کو ان کی غلطی بتاتا ہے تو ان پر ڈانٹ ڈپٹ شروع کردیتا ہے۔ اور ان کو دوسروں کے سامنے ذلیل اور رسوا کرنا شروع کردیتا ہے۔ حالانکہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ تم آئینہ ہو۔ تم لعنت ملامت اور ڈانٹ ڈپٹ مت کرو۔ نہ اس کو ذلیل اور رسوا کرو۔ بلکہ اس کو ایسے طریقے سے بتاؤ کہ اس کے دل میں تمہاری بات اُتر جائے۔

حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کا ایک واقعہ

واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما دونوں غالباً دریائے فرات کے کنارے سے گزر رہے تھے۔ ان دونوں نے دیکھا کہ دریا کے کنارے ایک بڑے میاں وضوء کر رہے ہیں۔ لیکن غلط طریقے سے کر رہے ہیں۔ ان کو خیال آیا کہ ان کو غلطی بتانی چاہئے۔ اس لئے کہ یہ بھی ایک دینی فریضہ ہے کہ دوسروں کی غلطی کو بتایا جائے۔ لیکن وہ بڑے ہیں اور ہم چھوٹے ہیں، ان کو کس طریقے سے بتائیں کہ ان کا دل نہ ٹوٹے، اور ناراض نہ ہو جائیں۔ چنانچہ دونوں نے مشورہ کیا، اور پھر

دونوں مل کر بڑے میاں کے پاس گئے اور جا کر بیٹھ گئے۔ باتیں کرتے رہے۔ پھر کہا کہ آپ ہمارے بڑے ہیں۔ ہم جب وضوء کرتے ہیں تو ہمیں شبہ رہتا ہے کہ معلوم نہیں کہ ہمارا وضوء سنت کے مطابق ہوا یا نہیں؟ اس لئے ہم آپ کے سامنے وضوء کرتے ہیں، آپ ذرا دیکھیں کہ ہمارے وضوء میں کوئی بات غلط اور خلافِ سنت تو نہیں ہے؟ اگر ہو تو بتا دیجئے گا۔ چنانچہ دونوں بھائیوں نے ان کے سامنے وضوء کیا۔ اور پھر وضوء کے بعد ان سے پوچھا کہ اب بتائیے کہ ہم نے اس میں کوئی غلطی تو نہیں کی؟ بڑے میاں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ میں نے جس طریقے سے وضوء کیا تھا وہ غلط تھا، اور ان کا طریقہ صحیح ہے۔ بڑے میاں نے کہا کہ بات دراصل یہ ہے کہ میں نے ہی غلط طریقے سے وضوء کیا تھا، اب تمہارے بتانے سے بات واضح ہو گئی۔ اب انشاء اللہ صحیح طریقے سے وضوء کروں گا۔ (۱)

یہ ہے وہ طریقہ جس کا اس آیت کریمہ میں حکم دیا ہے:

﴿ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ ﴾ (۲)

''اپنے پروردگار کے راستے کی طرف حکمت سے بلاؤ''

تم کوئی خدائی فوجدار نہیں ہو کہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے داروغہ بنا دیا ہو کہ لوگوں کو ڈانٹتے پھرو اور ان کو ذلیل کرتے پھرو، بلکہ تم آئینہ ہو، اور جس طرح آئینہ صرف حقیقتِ حال بتا دیتا ہے، ڈانٹ ڈپٹ اور سختی نہیں کرتا، اسی طرح تمہیں بھی کرنا چاہئے۔ یہ سبق بھی اس حدیث "المؤمن مراۃ المؤمن" سے نکل رہا ہے۔

ایک کا عیب دوسرے کو نہ بتایا جائے

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے تحت ایک نکتہ یہ بیان فرمایا ہے کہ آئینہ کا کام یہ ہے کہ جو شخص اس کے سامنے آئے گا اور اس کے اوپر کوئی عیب ہوگا تو وہ آئینہ صرف اسی شخص کو بتائے گا کہ تمہارے اندر یہ عیب ہے۔ وہ آئینہ دوسروں سے نہیں کہے گا کہ فلاں شخص میں یہ عیب ہے۔ اور نہ اس عیب کا دوسروں کے سامنے تشہیر اور چرچا کرے گا۔ اسی طرح مؤمن بھی ایک آئینہ ہے۔ جب وہ دوسرے کے اندر کوئی عیب دیکھے تو صرف اسی کو خلوت میں خاموشی سے بتا دے کہ تمہارے اندر یہ عیب ہے۔ باقی دوسروں سے جا کر کہنا کہ فلاں کے اندر یہ عیب اور یہ غلطی ہے، اور اس غلطی کا دوسروں کے سامنے چرچا کرنا، یہ مؤمن کا کام نہیں۔ بلکہ یہ تو نفسانیت کا کام ہے۔ اگر دل میں یہ خیال ہے کہ میں اللہ کو راضی کرنے کے لئے اس کا یہ عیب بتا رہا ہوں تو کبھی بھی وہ شخص دوسروں کے سامنے اس کا تذکرہ نہیں کرے گا۔ البتہ اگر دل میں نفسانیت ہوگی تو وہاں یہ خیال

(۱) مناقب الامام الاعظم للکردری (۱/ ۳۹۔ ۴۰) (۲) النحل: ۱۲۵

آئے گا کہ میں اس عیب کی وجہ سے اس کو ذلیل اور رسوا کروں۔ جبکہ مسلمانوں کو ذلیل اور رسوا کرنا حرام ہے۔

ہمارا طرزِ عمل

آج ہم اپنے معاشرے میں ذرا جائزہ لے کر دیکھیں تو ایسے لوگ بہت کم نظر آئی گے جو دوسروں کی غلطی دیکھ کر اس کو خیر خواہی سے بتادیں کہ تمہاری یہ بات مجھے پسند نہیں آئی، یا یہ بات شریعت کے خلاف ہے۔ لیکن اس کی غلطی کا تذکرہ مجلسوں میں کرنے والے بیشمار نظر آئیں گے۔ جس کے نتیجے میں غیبت کے گناہ میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ افتراء اور بہتان کے گناہ میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ مبالغہ اور جھوٹ کا گناہ ہو رہا ہے۔ اور ایک مسلمان کو بدنام کرنے کا گناہ ہو رہا ہے۔ اس کے بجائے بہتر طریقہ یہ تھا کہ تنہائی میں اس کو سمجھا دیتے کہ تمہارے اندر یہ خرابی ہے، اس کو دور کرلو۔ لہٰذا جب کسی مسلمان بھائی کے اندر کوئی عیب دیکھو تو دوسروں سے مت کہو، بلکہ صرف اس سے کہو۔ یہ سبق بھی اس حدیث سے معلوم ہو رہا ہے:

((اَلْمُؤْمِنُ مِرْآةُ الْمُؤْمِنِ))(۱)

غلطی بتانے کے بعد مایوس ہو کر مت بیٹھو

اس حدیث سے ایک سبق یہ مل رہا ہے کہ آئینہ کا کام یہ ہے کہ جو شخص اس کے سامنے آکر کھڑا ہوگا تو وہ آئینہ اس شخص کا عیب اور غلطی بتادے گا کہ تمہارے اندر یہ عیب ہے۔ اگر دوسری مرتبہ وہ شخص آئینہ کے سامنے آئے گا تو دوسری مرتبہ بتادے گا۔ جب تیسری مرتبہ سامنے آئے گا تو تیسری مرتبہ بتادے گا۔ لیکن وہ آئینہ تمہارے پیچھے نہیں پڑے گا کہ اپنا یہ عیب ضرور دور کرو۔ اگر وہ شخص اپنا وہ عیب دور نہ کرے تو وہ آئینہ روٹھ کر اور تھک ہار کر الگ ہو کر نہیں بیٹھ جائے گا کہ تم اپنا یہ عیب دور نہیں کر رہے ہو، اس لئے اب میں نہیں بتاؤں گا۔ بلکہ وہ شخص جتنی مرتبہ بھی اس آئینہ کے سامنے آئے گا وہ آئینہ ضرور بتائے گا کہ یہ عیب اب بھی موجود ہے۔ وہ بتانے سے باز نہیں آئے گا اور بددل بھی نہیں ہوگا۔ اور داروغہ بن کر یہ نہیں کہے گا کہ یہ شخص جب تک اپنا عیب دور نہیں کرے گا اس وقت تک اس سے تعلقات نہیں رکھوں گا۔

---

(۱) سنن أبی داود، کتاب الأدب، باب فی النصیحة والحیاطة، رقم: ٤٢٧٢

انبیاء علیہم السلام کا طرزِ عمل

یہی انبیاء علیہم السلام کا طریقہ ہے کہ وہ بددل ہو کر اور ہار کر نہیں بیٹھ جاتے۔ بلکہ جب بھی موقع ملتا ہے اپنی بات کہے جاتے ہیں۔ لیکن اپنے آپ کو داروغہ نہیں سمجھتے۔ قرآن کریم میں فرمایا:

﴿لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ﴾(۱)

یعنی آپ کو داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا۔ بلکہ آپ کا کام صرف پہنچا دینا ہے۔ بس جو غلطی کرے اس کو بتا دو اور اس کو متنبہ کر دو۔ اب اس کا کام یہ ہے کہ وہ عمل کرے۔ اور اگر وہ عمل نہیں کرتا تو دوبارہ بتا دو۔ تیسری مرتبہ بتا دو۔ لیکن مایوس ہو کر اور ناراض ہو کر نہ بیٹھ جاؤ کہ یہ شخص مانتا ہی نہیں، اب اس کو کیا بتائیں۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ اُمت پر بہت زیادہ مہربان تھے، اس لئے جب کفار اور مشرکین آپ کی بات نہیں مانتے تھے تو آپ کو شدید صدمہ ہوتا تھا۔ اس پر قرآن کریم میں یہ آیت نازل ہوئی:

﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ﴾(۲)

کیا آپ اپنی جان کو ہلاکت میں ڈال دیں گے اس صدمہ کی وجہ سے کہ وہ ایمان کیوں نہیں لاتے۔ آپ کا یہ فریضہ نہیں ہے۔ آپ کا کام صرف بات کو پہنچا دینا ہے۔ ماننے یا نہ ماننے کی ذمہ داری آپ پر نہیں۔

یہ کام کس کے لئے کیا تھا؟

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ دعوت و تبلیغ کرنے والے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے کام میں لگا رہے۔ لوگوں کے نہ ماننے کی وجہ سے چھوڑ کر نہ بیٹھ جائے۔ مایوس ہو کر، یا ناراض ہو کر یا غصہ ہو کر نہ بیٹھ جائے کہ میں نے تو بہت سمجھایا لیکن انہوں نے میری بات نہیں مانی، لہٰذا اب میں نہیں کہوں گا، ایسا نہ کرے۔ بلکہ یہ سوچ کہ میں نے یہ کام کس کے لئے کیا تھا؟ اللہ کو راضی کرنے کے لئے کیا تھا۔ آئندہ بھی جتنی مرتبہ کروں گا، اللہ کو راضی کرنے کے لئے کروں گا۔ اور ہر مرتبہ مجھے کہنے کا اجر و ثواب مل جائے گا۔ اس لئے میرا تو مقصد حاصل ہے۔ اب دوسرا مان رہا ہے یا نہیں مان رہا ہے، اس سے میرا براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کس کو ہدایت دیتے ہیں اور کس کو ہدایت نہیں دیتے۔

---

(۱) الغاشیة: ۲۲ (۲) الشعراء: ۳

ماحول کی اصلاح کا بہترین طریقہ

حقیقت یہ ہے کہ ایک مؤمن اخلاص کے ساتھ بات کہتا ہے اور بار بار کہتا ہے اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرتا ہے کہ یا اللہ! میرا فلاں بھائی اس گناہ کے اندر مبتلا ہے، اس کو ہدایت عطا فرما، اور اس کو سیدھے راستے پر لگا دے۔ جب یہ دو کام کرتا ہے تو عموماً اللہ تعالیٰ ایسے موقع پر ہدایت عطا فرما ہی دیتے ہیں۔ اگر ہم یہ کام کرتے رہیں تو یہ وہ کام ہے کہ اس کی برکت سے سارا ماحول خود بخود سدھر سکتا ہے۔ میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ خودکار یعنی آٹومیٹک نظام ہے کہ اگر ایک مؤمن دوسرے مؤمن کو ان شرائط اور آداب کے ساتھ اس کی غلطیوں پر ٹوکتا رہے تو اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اصلاح فرما دیتے ہیں۔

خلاصہ

بہرحال! اس حدیث میں یہ جو فرمایا کہ ایک مؤمن دوسرے مؤمن کا آئینہ ہے، اس سے یہ سبق ملا کہ مؤمن کا کام بار بار بتا دینا ہے۔ اور نہ ماننے کی صورت میں صدمہ اور غم کرنا یا ہار مان کر بیٹھ جانا مؤمن کا کام نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جب ایک مؤمن اخلاص کے ساتھ بات کہتا ہے اور بار بار کہتا ہے تو ایک نہ ایک دن اس کا کہنا رنگ لاتا ہے۔ لہٰذا تم آئینہ بن کر کام کرو۔ اور جب دوسرا شخص آئینہ بن کر کام کرے اور تمہیں تمہاری کوئی غلطی بتائے تو تم رنجیدہ اور ناراض مت ہونا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

مرنے والوں کو بُرا مت کہو ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

اَمَّا بَعْدُ!

عَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((لَا تَسُبُّوا الْأَمْوَاتَ فَتُؤْذُوا الْأَحْيَاءَ))(۱)

مرنے والوں کو بُرا مت کہو

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''جن لوگوں کا انتقال ہو چکا ہے، ان کو بُرا مت کہو، اس لئے کہ مُردوں کو بُرا کہنے سے زندہ لوگوں کو تکلیف ہوگی''

ایک اور حدیث جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اُذْكُرُوْا مَحَاسِنَ مَوْتَاكُمْ وَكُفُّوْا عَنْ مَسَاوِيهِمْ)) (۲)

''یعنی اپنے مُردوں کی اچھائیاں ذکر کرو، اور ان کی برائیاں ذکر کرنے سے باز رہو''

یہ دو حدیثیں ہیں، دونوں کا مضمون تقریباً ایک جیسا ہے کہ جب کسی کا انتقال ہو جائے تو انتقال کے بعد اگر اس کا ذکر کرنا ہے تو اچھائی سے ذکر کرو، بُرائی سے ذکر مت کرو۔ چاہے بظاہر اس کے اعمال کتنے بھی خراب رہے ہوں، لیکن تم اس کی اچھائی کا ذکر کرو اور بُرائی کا ذکر مت کرو۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ حکم تو زندوں کے لئے بھی ہے کہ زندوں کا ان کے پیچھے بُرائی سے تذکرہ کرنا جائز نہیں، بلکہ زندوں کا تذکرہ بھی اچھائی سے کرنا چاہئے، اگر بُرائی سے ذکر کریں گے

☆ اصلاحی خطبات (۱۰/ ۱۰۸ تا ۱۱۴)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ما جاء فی الشتم، رقم: ۱۹۰۵، مسند أحمد، رقم: ۱۷۴۹۹

(۲) سنن الترمذی، کتاب الجنائز عن رسول الله، باب آخر، رقم: ۹۴۰، سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب فی النهی عن سب الموتیٰ، رقم: ٤٢٥٤

تو غیبت ہو جائے گی، اور غیبت حرام ہے۔ پھر ان احادیث میں خاص طور پر مُردوں کے بارے میں یہ کیوں فرمایا کہ مُردوں کا ذکر بُرائی سے مت کرو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ زندہ آدمی کی غیبت بھی حرام ہے، لیکن مردہ آدمی کی غیبت ڈبل حرام ہے، اس کی حرمت کہیں زیادہ ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں:

مرنے والے سے معافی مانگنا ممکن نہیں

ایک وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص زندہ آدمی کی غیبت کرے تو اُمید یہ ہے کہ جب اس سے کسی وقت ملاقات ہوگی تو اس سے معافی مانگ لے گا اور وہ معاف کر دے گا، اس طرح غیبت کرنے کا گناہ ختم ہو جائے گا۔ کیونکہ غیبت حقوق العباد میں سے ہے، اور حقوق العباد کا معاملہ یہ ہے کہ اگر صاحبِ حق معاف کر دے تو معاف ہو جاتا ہے۔ لیکن جس شخص کا انتقال ہو گیا، اس سے معافی مانگنے کا کوئی راستہ نہیں، وہ تو اللہ تعالیٰ کے یہاں جا چکا، اس وجہ سے وہ گناہ معاف ہو ہی نہیں سکتا، اس لئے یہ گناہ دوگنا ہو گیا۔

اللہ کے فیصلے پر اعتراض

مرنے والے کی غیبت منع ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اب تو وہ اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچ چکا ہے، اور تم اس کی جس بُرائی کا ذکر کر رہے ہو، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی اس بُرائی کو معاف کر دیا ہو اور اس کی مغفرت کر دی ہو۔ تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ نے تو معاف کر دیا، اور تم اس کی بُرائی لیے بیٹھے ہو۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر اعتراض ہو رہا ہے کہ یا اللہ! آپ نے تو اس بندے کو معاف کر دیا، لیکن میں معاف نہیں کرتا، وہ تو بہت بُرا تھا۔ استغفر اللہ، یہ اور بڑا گناہ ہے۔

زندہ اور مُردہ میں فرق

تیسری وجہ یہ ہے کہ زندہ آدمی کی ''غیبت'' میں بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں جو جائز ہوتی ہیں، مثلاً ایک آدمی کی عادت خراب ہے، اس عادت کے خراب ہونے کی وجہ سے اندیشہ یہ ہے کہ لوگ اس سے دھوکہ میں مبتلا ہو جائیں گے یا وہ کسی کو تکلیف پہنچائے گا۔ اب اگر اس کے بارے میں کسی کو بتانا کہ دیکھو اس سے ہوشیار رہنا اس کی یہ عادت ہے، یہ غیبت جائز ہے۔ اس لئے کہ اس کا مقصد دوسرے کو نقصان سے بچانا ہے۔ لیکن جس آدمی کا انتقال ہو گیا ہے، وہ اب کسی دوسرے کو نہ تو تکلیف

پہنچا سکتا ہے اور نہ دوسرے کو دھوکہ دے سکتا ہے، اسلئے اس کی غیبت کسی بھی وقت حلال نہیں ہوسکتی۔ اس وجہ سے خاص طور پر فرمایا کہ مرنے والوں کی غیبت مت کرو، اور نہ بُرائی سے ان کا تذکرہ کرو۔

اس کی غیبت سے زندوں کو تکلیف

چوتھی وجہ خود حدیث شریف میں جناب رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمادی، وہ یہ کہ تم نے یہ سوچ کر مُردے کی غیبت کی کہ وہ مُردہ تو اب اللہ تعالیٰ کے یہاں جاچکا ہے، میری بُرائی کرنے سے اس کو نہ تو تکلیف پہنچے گی، اور نہ ہی اس کو اطلاع ہوگی۔ لیکن تم نے یہ نہ سوچا کہ آخر اس مُردے کے کچھ چاہنے والے بھی تو دنیا میں ہوں گے، جب ان کو یہ پتہ چلے گا کہ ہمارے فلاں مرنے والے قریبی عزیز کی بُرائی بیان کی گئی ہے تو اس کی وجہ سے ان کو تکلیف ہوگی۔ فرض کریں کہ آپ نے کسی زندہ آدمی کی غیبت کرلی ہے تو آپ کے لئے یہ آسان ہے کہ جاکر اس سے معافی مانگ لیں۔ وہ معاف کردے گا تو بات ختم ہوجائے گی۔ لیکن اگر آپ نے کسی مردہ آدمی کی غیبت کرلی تو اس غیبت سے اس کے جتنے عزیز و اقارب، دوست احباب ہیں، ان سب کو تکلیف ہوگی، اب تم کہاں کہاں جاکر اس کے عزیز و اقارب کو تلاش کروگے، اور یہ تحقیق کروگے کہ کس کس کو تکلیف پہنچی ہے، اور پھر کس کس سے جاکر معافی مانگوگے۔ اس لئے مردے کی غیبت کرنے کی برائی بہت زیادہ شدید ہے۔ لہٰذا زندہ آدمی کی غیبت تو حرام ہے ہی، لیکن مرنے والے کی غیبت اس کے مقابلہ میں زیادہ حرام ہے، اور اس کی معافی بھی بہت مشکل ہے۔ اس لئے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ مُردوں کی بُرائی بیان نہ کرو، صرف اچھائی بیان کرو۔

مُردہ کی غیبت جائز ہونے کی صورت

صرف ایک صورت میں مردے کی بُرائی بیان کرنا جائز ہے، وہ یہ ہے کہ کوئی شخص گمراہی کی باتیں کتابوں میں لکھ کر دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اب اس کی کتابیں ہر جگہ پھیل رہی ہیں۔ ہر آدمی اس کی کتابیں پڑھ رہا ہے۔ لہٰذا اس شخص کے بارے میں لوگوں کو یہ بتانا کہ اس شخص نے عقائد کے بارے میں جو باتیں لکھی ہیں، وہ غلط ہیں اور گمراہی کی باتیں ہیں، تاکہ لوگ اس کی کتابیں پڑھ کر گمراہی میں مبتلا نہ ہوں۔ بس اس حد تک اس کی بُرائی بیان کرنے کی اجازت ہے۔ اس میں یہ بھی ضروری ہے کہ اس حد تک اس کے بارے میں لوگوں کو بتایا جائے جس حد تک ضرورت ہو۔ لیکن اس شخص کو بُرا بھلا کہنا یا اس کے لئے ایسے الفاظ استعمال کرنا جو گالی میں داخل ہوجائیں، یہ عمل پھر بھی جائز نہ ہوگا۔ اس لئے کہ اگرچہ وہ اپنی کتابوں میں گمراہی کی باتیں لکھ گیا، لیکن کیا معلوم کہ مرتے وقت اس کو اللہ تعالیٰ نے

توبہ کی توفیق دیدی ہو، اور اس توبہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو معاف فرمادیا ہو۔ لہٰذا اس کے لئے بُرے الفاظ استعمال کرنا مثلاً یہ کہنا کہ وہ تو جہنمی تھا، وغیرہ۔ العیاذ باللہ۔ یہ کسی طرح جائز نہیں۔ کیونکہ کسی کے جہنمی ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ صرف ایک ذات کے اختیار میں ہے، وہی فیصلہ کرتا ہے کہ کون جنتی ہے اور کون جہنمی ہے۔ لہٰذا تم اس کے اوپر جہنمی ہونے کا فیصلہ کرنے والے کون ہو؟ اور تم نے اس کے بارے میں یہ کیسے فیصلہ کرلیا کہ وہ مردود تھا۔ اس قسم کے الفاظ اس کے بارے میں استعمال کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں۔ البتہ اس نے جو گمراہی پھیلائی ہے، اس کی تردید کردو کہ یہ اس کے عقائد گمراہانہ تھے، اور کوئی شخص ان عقائد سے دھوکہ میں نہ آئے۔

اچھے تذکرہ سے مُردے کا فائدہ

لہٰذا جو بات حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمائی، یہ یاد رکھنے کی ہے کہ مرنے والوں کے محاسن ذکر کرو اور اس کی بُرائیوں کو ذکر کرنے سے پرہیز کرو۔ اس حدیث شریف میں صرف بُرائیوں سے پرہیز کرنے کا ذکر نہیں کیا، بلکہ ساتھ میں یہ بھی فرمادیا کہ اس کی اچھائیاں ذکر کرو، اس کی اچھائیاں ذکر کرنے کی ترغیب دی۔ میں نے اپنے بعض بزرگوں سے اس کی حکمت یہ سنی ہے کہ جب کوئی مسلمان کسی مرنے والے کی کوئی اچھائی ذکر کرتا ہے، یا اس کی نیکی کا تذکرہ کرتا ہے تو یہ اس مرنے والے کے حق میں ایک گواہی ہوتی ہے، اور اسی گواہی کی بنیاد پر بعض اوقات اللہ تعالیٰ اس مرنے والے پر فضل فرمادیتے ہیں کہ میرے نیک بندے تمہارے بارے میں اچھائی کی گواہی دے رہے ہیں، چلو ہم تمہیں معاف کرتے ہیں۔ لہٰذا اچھائی کا ذکر کرنا مرنے والے کے حق میں بھی فائدہ مند ہے۔ اور جب تمہاری گواہی کے نتیجے میں اس کو فائدہ پہنچ گیا، تو کیا بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے نتیجے میں تمہاری بھی مغفرت فرمادیں، اور یہ فرمادیں کہ تم نے میرے ایک بندے کو فائدہ پہنچایا، لہٰذا ہم تمہیں بھی فائدہ پہنچاتے ہیں اور تمہیں بھی بخش دیتے ہیں۔ اس لئے فرمایا کہ صرف یہ نہیں کہ مرنے والے کا بُرائی کے ساتھ تذکرہ مت کرو، بلکہ فرمایا کہ اس کی اچھائیاں ذکر کرو، اس سے انشاء اللہ ان کو بھی فائدہ پہنچے گا اور تمہیں بھی فائدہ پہنچے گا۔

مرنے والوں کے لئے دعائیں کرو

ایک اور حدیث بھی اسی مضمون کی ہے لیکن الفاظ دوسرے ہیں۔ وہ یہ کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

((لَا تَذْكُرُوْا هَلْكَاكُمْ إِلَّا بِخَيْرٍ))(۱)

یعنی اپنے مرنے والوں کا ذکر مت کرو مگر اچھائی کے ساتھ۔ اور اچھائی کے ساتھ ذکر میں یہ بات بھی داخل ہے کہ جب اس کی اچھائی ذکر کر رہے ہو تو اس کے حق میں یہ دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے اور اس پر اپنا فضل فرمائے، اللہ تعالیٰ اس کو اپنے عذاب سے محفوظ فرمائے۔ یہ دعائیں دو گنا فائدہ دیں گی، ایک تو دعا کرنا بذاتِ خود عبادت اور ثواب ہے، چاہے وہ کسی کام کے لئے بھی کرے۔ دوسرے کسی مسلمان کو فائدہ پہنچانے کا اجر و ثواب بھی حاصل ہو جائے گا۔ اس لئے اس کے حق میں دعا کرنے میں آپ کا بھی فائدہ ہے اور اس کا بھی فائدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

---

(۱) سنن النسائی، کتاب الجنائز، باب النهی عن ذکر الهلكی إلا بخير، رقم: ۱۹۰۹

ہماری روزمرہ زندگی اوراس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کرسکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ "اسلام اور ہماری زندگی" انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خُطبات وتحریرات

جلد ۵

اسلام اور خاندانی نظام

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا مُحمّد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات پبلشرز، بکسیلرز، ایکسپورٹرز

★ ۱۴ دیناناتھ مینشن مال روڈ، لاہور ★ ۱۹۰، انارکلی، لاہور پاکستان ★ موہن روڈ چوک اُردو بازار، کراچی

فون ۳۷۳۵۳۲۵۵۔۳۷۲۴۳۹۹۱ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱
فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۲۷۸۵

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خُطبات وتحریرات

جلد ۶

اصلاح وتصوّف

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا مُحمّد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز، بکسیلرز، ایکسپورٹرز

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور
فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۴۷۸۵

★ ۱۹۰، انارکلی، لاہور، پاکستان
فون ۳۷۲۲۳۹۹۱، ۳۷۳۵۳۲۵۵

★ موہن روڈ، چوک اُردو بازار، کراچی
فون ۳۲۷۲۲۴۰۱